زن، زر اور زمین کے تنازعوں میں جنم لینے والے مقدمات
بازگشت
مرزا امجد بیگ
(ایڈووکیٹ)

انجام بہ خیر

''انسانی ہمدردی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''
یہ سوال ایک روز میری سیکرٹری نازنین نے مجھ سے کیا تھا۔ نازنین کو میرے پاس کام کرتے ہوئے کم وبیش ایک سال ہوا تھا۔ اس نے گریجویشن کیا ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وکالت کی تعلیم حاصل کرے لیکن بوجوہ وہ اپنی خواہش کو پورا نہیں کرسکی تھی۔ میرے دفتر کی ملازمت اس کے طبعی میلان سے لگا کھاتی تھی اسی لئے وہ بخوشی میرے پاس ٹکی ہوئی تھی۔
نازنین نے جس وقت مجھ سے وہ درج بالا سوال کیا تھا، جانے اس وقت میں کس موڈ میں تھا کہ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ ''کون...... کیا کہتے ہیں؟''
''سر! میں آپ سے پوچھ رہی ہوں۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کی رائے جاننا چاہتی ہوں۔ آپ کا انسانی ہمدردی کے بارے میں کیا خیال ہے؟''
میں نے کہا۔ ''انسانی ہمدردی انتہائی سیدھے سادے الفاظ کا مجموعہ ہے۔ انسانی، انسان سے منسوب ہے اور ہمدردی کے معنی ہیں کسی دوسرے شخص کے درد کو اپنا درد سمجھنا۔ گویا انسانی ہمدردی سے میرے نزدیک مراد یہ ہے کہ کسی دوسرے انسان کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھنا۔'' اتنا کہہ کر میں رکا پھر سوالیہ نظر سے نازنین کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''تم یہ سب کیوں پوچھ رہی ہو؟''
اُس روز بس دو تین کلائنٹ ہی مجھ سے ملنے آئے تھے اور انہیں بھی میں نے آدھا گھنٹہ پہلے نمٹا دیا تھا۔ اس وقت نازنین میرے چیمبر میں ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ نازنین ایک باتونی عورت تھی۔ وہ مجھے ذرا سا بھی فارغ دیکھتی تو کسی نہ کسی موضوع پر گفتگو شروع کردیتی تھی۔ میرا پیشہ اس کے شوق سے مطابقت رکھتا تھا اس لئے بھی وہ مجھ سے آزادانہ بات چیت کرلیتی تھی۔
نازنین نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''سر! بات دراصل یہ ہے کہ مجھے عاقل میاں سے ہمدردی محسوس ہورہی ہے، میرا مطلب ہے انسانی ہمدردی۔''
''یہ عاقل میاں کون ہیں؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔
اُس نے بتایا۔ ''میرے کزن ہیں۔ پھوپھی زاد۔ نام عاقل میاں ہے مگر ہیں انتہائی درجے کے احمق۔''
''ہاں بھئی، احمقوں سے انسانی ہمدردی کی تو جاسکتی ہے۔'' میں نے خیال افروز لہجے میں کہا۔ ''مگر بہت سوچ سمجھ کر۔ کیونکہ ایسے لوگ اکثر اپنے خیرخواہ کو کسی مصیبت میں ڈال دیتے ہیں۔''

نازنین نے کہا۔ ''یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں سر! لیکن عاقل میاں سے ہمدردی پر میں مجبور ہوں۔ ایک تو وہ میرے کزن ہیں، دوسرے وہ اس دنیا میں تنہا ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ کسی زمانے میں میرے ''امیدوار'' بھی رہے ہیں۔''

''یعنی شادی کے امیدوار؟'' میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

''جی سر!'' نازنین نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''میں عاقل کے ماموں کی اکلوتی بیٹی ہوں بیگ صاحب۔ اگرچہ ہماری معاشرتی پوزیشن عاقل میاں سے بہت زیادہ مضبوط ہے لیکن ابو نے اپنے بھانجے کے لئے دل میں نرمی پیدا کر لی تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی انہوں نے ایک کڑی شرط بھی رکھ دی تھی۔ میری قسمت اچھی تھی کہ عاقل میاں ابو کی شرط پوری نہ کر سکے۔ نتیجے میں انہیں میرے بارے میں دستبردار ہونا پڑا اور پانچ سال قبل میری شادی ایک انتہائی معقول اور قابل فخر شخص سے ہوگئی۔ گویا میں کنوئیں میں گرنے سے بال بال بچ گئی۔''

اس کی بات ختم ہوئی تو میں نے ٹکڑا لگایا۔ ''یعنی تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تمہارے کزن عاقل میاں معقول انسان ہیں اور نہ ہی قابل فخر شخص!''

''میرے کہنے یا نہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا سر!'' وہ قدرے بیزاری سے بولی۔ ''دنیا والے یہی کہتے ہیں......اور آوازِ خلق کو تو نقارۂ خدا سمجھا جاتا ہے۔''

''اس کے باوجود بھی تمہیں عاقل میاں سے ہمدردی ہے؟''

''میرے خیال میں عاقل بے وقوف ہونے کے ساتھ ساتھ مظلوم بھی ہے۔'' نازنین نے رحم کھانے والے انداز میں کہا۔ ''پھوپھو کے انتقال کے بعد تو وہ بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ میں سوچتی ہوں، اگر میرے تعاون سے اس کا بھلا ہو جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری باتوں سے لگتا ہے، عاقل میاں اس وقت کسی مشکل میں گرفتار ہے؟''

''وہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار رہتا ہے سر۔'' نازنین نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بلکہ میں تو اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ بذاتِ خود ایک بہت بڑی مصیبت ہے۔''

میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''نازنین! فی الحال تمہارا کزن عاقل میاں کس مشکل میں مبتلا ہے جو تمہیں اس سے اس قدر ہمدردی محسوس ہو رہی ہے؟''

وہ ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''سر! عقل سے پیدل عاقل میاں ایک فراڈ شخص کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ اس سے پہلے بھی ایک پراپرٹی ایجنٹ اس سے ستّر ہزار روپے ہتھیا کر رفو چکر ہو گیا تھا۔ اس مرتبہ بھی لگتا ہے کہ سلطان نامی یہ بدمعاش شخص عاقل کو بڑا گہرا چرکا لگائے گا۔''

میرے استفسار پر نازنین نے تفصیلاً بتایا۔ ''لگ بھگ ڈیڑھ سال قبل عاقل ایک پراپرٹی ایجنٹ کے جال میں پھنس گیا تھا۔ عاقل ایک فلیٹ خریدنے کا ارادہ رکھتا تھا جس کی مالیت ایک لاکھ روپے تھی۔ عاقل کے حماقت مآب چہرے کو دیکھتے ہوئے پراپرٹی ایجنٹ کو زیادہ ''محنت'' نہیں کرنا پڑی۔

اس نے عاقل کو دو کمروں کا ایک چھوٹا سا فلیٹ دکھایا جس کی قیمت ایک لاکھ روپے تھی۔ عاقل کو وہ فلیٹ دل و جان سے پسند آ گیا۔ ایجنٹ نے کہا کہ بیعانے کے طور پر ستّر ہزار روپے دے دو۔ ''عقل کل'' نے فوراً مطلوبہ رقم نکال کر پراپرٹی ایجنٹ کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ایجنٹ نے اسے بتایا کہ باقی تیس ہزار روپے وہ ''قبضہ'' کے وقت لے گا۔ عاقل، پراپرٹی ایجنٹ کے بہلاوے پر گھر آ کر بیٹھ گیا اور مستقبل کے سنہری خواب بُننے لگا۔''

نازنین ایک لمحے کو رکی تو میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھے کوئی مزاحیہ کہانی سنا رہی ہو یا تمہاری ان باتوں میں کوئی حقیقت بھی ہے؟''

''میرا کہا ہوا صدفی صد مبنی بر سچ ہے بیگ صاحب!''

میں نے بے یقینی سے گردن ہلائی اور کہا۔ ''اللہ کی بندی! یہ تو مذاق کی آخری ڈگری ہو گئی۔ ایک لاکھ روپے مالیت کی جائیداد کا بیعانہ ستّر ہزار روپے؟''

''جی سر! عاقل میاں اپنی نوعیت کے ایک ہی ہیں۔'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''حالانکہ یار لوگوں نے بہت سمجھایا تھا، اتنی بڑی رقم بیعانے میں نہ پھنساؤ کہیں کوئی فراڈ وغیرہ نہ ہو جائے۔ مگر وہ الٹا اپنے خیر خواہوں کو سمجھاتا رہا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، بہت سوچ سمجھ کر کر رہا ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے پراپرٹی ایجنٹ کی حمایت کرتا رہا اور پراپرٹی ایجنٹ نے اس کا ''کام'' کر دیا۔''

''یہ تو ہونا ہی تھا نازنین!'' میں نے کہا۔ ''ایک لاکھ روپے مالیت کی خرید و فروخت کے لئے زیادہ سے زیادہ پانچ ہزار روپے بیعانہ کافی تھا۔''

نازنین نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''اس کے یار دوستوں اور ہمدردوں نے بھی یہی سمجھایا تھا۔ مگر عاقل میاں اپنی ناقص عقل کے گھوڑے بہت دور تک دوڑا چکا تھا۔ وہ پراپرٹی ایجنٹ کی حمایت میں لوگوں سے جھگڑا کرتا اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ ہر صورت میں فائدہ اسی کا ہوگا۔ پراپرٹی ایجنٹ نے وعدہ کیا ہے کہ اگر وہ مذکورہ فلیٹ اسے نہ دلوا سکا تو بیعانہ کی رقم کا دوگنا اسے واپس کرے گا۔ یعنی ستّر ہزار کی واپسی ایک لاکھ چالیس ہزار روپے کی صورت میں ہوگی۔ بلکہ بعض لوگوں سے تو عاقل نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ خدا کرے فلیٹ والا معاملہ ایجنٹ کی طرف سے کھٹائی میں پڑ جائے تاکہ وہ بیعانہ کی رقم پر خوب منافع کما سکے۔''

میں نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم واقعی خوش قسمت ہو نازنین! جو ایسے شخص کے پلے بندھنے سے بچ گئیں۔''

''وہ تو ابو کی شرط نے مجھے بچا لیا جناب!'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''ورنہ میں تو ڈر رہی تھی، اگر خدانخواستہ عاقل نے ابو کا مطالبہ مان لیا تو میرا کیا ہوگا۔''

''بھئی تم نے اس شرط یا مطالبے کے بارے میں ابھی تک کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے اپنی کرسی میں پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔ ''جو تمہارے ابو نے عاقل میاں کے سامنے رکھا تھا۔''

نازنین نے بتایا۔ ''ابو نے اپنی بہن یعنی عاقل کی امی سے کہا تھا، اگر وہ اپنا موجودہ مکان چھوڑ کر کسی قدرے مہذب علاقے میں رہائش اختیار کر لیں تو وہ میری شادی عاقل سے کر دیں گے اور میرا خیال ہے، ابو کا یہ مطالبہ انتہائی جائز اور معقول تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ عاقل کسی غیر مہذب علاقے میں رہتا تھا؟''

''غیر مہذب اور انتہائی ناشائستہ علاقہ ہے جناب۔'' نازنین نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''سیاسی اعتبار سے بھی اور اخلاقی حوالے سے بھی اس علاقے کی ریپوٹیشن بہت خراب ہے۔ ایک ایسی بستی جس کا عمومی تاثر بہت نامعقول ہے۔''

میں نے کہا۔ ''عاقل میاں نے وہ علاقہ چھوڑنے سے انکار کر دیا تھا، اس سے بھی اس کے ''عقل مند'' ہونے کی دلیل ملتی ہے۔''

''وہ تو شاید مذکورہ بستی چھوڑ بھی دیتا۔'' نازنین نے کہا۔ ''لیکن پھوپھو جان اڑ گئی تھیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ بھائی کو وہ بستی نہیں بلکہ اپنی بہن کو دیکھنا چاہئے۔ بہن کا رشتہ بستی سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ پہلے ابو میری شادی عاقل سے کریں۔ کچھ عرصے بعد وہ اس بستی سے رہائش ختم کر کے کسی متوسط اور اچھی ساکھ والے علاقے میں آ جائیں گے۔ ابو اور پھوپھو اپنی اپنی بات منوانے کے لئے ضد پر قائم رہے، اس طرح بات بن نہ سکی۔'' ایک لمحے کو وہ رکی، پھر اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، بات بن نہ سکی۔''

میں نے کہا۔ ''نازنین! تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ تمہارے عاقل میاں کو اس وقت کون سی پریشانی لاحق ہے؟''

''سر! میں نے بتایا ہے نا، وہ ایک بہت ہی شاطر قسم کے شخص سلطان کے چنگل میں پھنس گیا ہے۔ اسے قانونی مدد کے بغیر اس بھنور سے نکالا نہیں جا سکتا۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ اس سلسلے میں مجھ سے تعاون کریں۔ میں آپ کی فیس ضرور ادا کروں گی لیکن آپ کو فیس کی رقم میں مجھے اچھی خاصی رعایت دینا ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ خصوصی رعایت تو ضرور کروں گا۔ مگر پتہ تو چلے، آخر معاملہ کیا ہے۔ سلطان نامی اس بدمعاش شخص کے ''چنگل'' کی ذرا وضاحت تو کرو۔''

''اندر کی بات تو مجھے معلوم نہیں۔'' نازنین اپنے ہاتھوں کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں عاقل کو آپ کے پاس بلالوں گی۔ آپ تفصیل اسی سے معلوم کر لیجئے گا۔ بس مجھے اتنا پتہ ہے کہ عاقل نے اپنا جھونپڑی نما مکان سلطان کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ سلطان پوری ادائیگی کئے بغیر گھر پر قابض ہو گیا ہے۔ عاقل نے باقی رقم کا مطالبہ کیا تو وہ اسے دھمکیاں دینے لگا۔ عاقل کے ہاتھ سے مکان بھی گیا اور رقم بھی بہت کم ملی ہے۔ وہ اس ناگہانی صورت حال پر بہت پریشان ہے۔ سلطان جیسے غنڈا صفت شخص کے ساتھ قانونی مدد کے بغیر نمٹنا مشکل نظر آ رہا ہے۔''

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ''کیا اس سلسلے میں عاقل نے پولیس سے مدد حاصل نہیں کی؟''

''وہ اپنے علاقے کے تھانے میں گیا تھا۔'' نازنین نے بتایا۔ ''مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''تھانیدار نے عاقل کی شکایت پر سلطان کو تھانے طلب کیا تھا مگر اس نے تھانیدار کے سامنے عجیب سا بیان دیا۔ جس کی روشنی میں عاقل کو مایوسی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو سکا۔''

میں نے پوچھا۔ ''سلطان نے تھانے میں کیا بیان دیا تھا؟''

''اس نے تھانیدار کو بتایا کہ وہ پوری ادائیگی کے بعد گھر میں داخل ہوا تھا اور یہ کہ اب اس کی طرف ایک پیسہ بھی واجب الادا نہیں ہے۔'' نازنین نے بتایا۔ ''اپنے بیان کی سچائی ثابت کرنے کے لئے گواہ کے طور پر اس نے اس عورت کو بھی تھانے میں پیش کر دیا جس کی معرفت مکان کا سودا ہوا تھا۔ اصغری نامی وہ عورت ایک طرح سے کمیشن ایجنٹ کے طور پر کام کرتی ہے اور مکانوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں سودے بازی کرواتی رہتی ہے۔''

پوری بات سننے کے بعد میں نے کہا۔ ''نازنین! تمہارے عاقل صاحب کی خرید و فروخت میری سمجھ سے تو باہر ہے۔ ارے بھئی، کیا اس مکان کے سلسلے میں کوئی قانونی دستاویز تیار نہیں کی گئی؟ مکان کی ملکیت کے کاغذات تو تیار ہوئے ہوں گے۔ خرید و فروخت کے معاملات میں کئی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ سب کچھ بالا ہی بالا کس طرح ہو گیا؟''

''سر! میں ایک بات کی وضاحت کرنا بھول گئی۔'' نازنین نے جلدی سے کہا۔ ''اسی وجہ سے آپ اُلجھن میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ دراصل عاقل نے سلطان کے ہاتھ جو مکان بیچا ہے وہ وہی ہے جس کو چھوڑنے کے لئے ابو نے شرط لگائی تھی۔''

''تو پھر؟'' میری الجھن ابھی تک برقرار تھی۔

''تو پھر یہ بیگ صاحب!'' نازنین نے کہا۔ ''وہ جھونپڑی نما مکان جس بستی میں واقع ہے وہ مقبوضہ علاقہ کہلاتا ہے۔ کہلاتا کیا بلکہ درحقیقت وہ مقبوضہ علاقہ ہے جہاں مکانات کی خرید و فروخت کے سلسلے میں قانونی دستاویزات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس ایک ہاتھ رقم لی جاتی ہے اور دوسرے ہاتھ قبضہ دے دیا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یعنی وہ بستی ان اتھرائز علاقہ ہے؟''

نازنین نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''ایسی جگہوں پر تو ''قبضہ سچا، دعویٰ جھوٹا'' کا اصول کچھ زیادہ ہی کارفرما نظر آتا ہے۔''

''سلطان اسی اصول پر عمل کر رہا ہے۔'' نازنین نے کہا۔ ''ویسے بھی سلطان کی شہرت ایک

غنڈے کی سی ہے۔ ممکن ہے، اس نے تھانے میں بھی کچھ سیٹنگ کر رکھی ہو۔''

''ہاں، ایسے لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''ویسے عاقل پولیس والوں سے بہت برگشتہ ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ہماری پولیس صرف غنڈوں، بدمعاشوں اور لٹیروں کی مدد کرتی ہے۔''

''اس کا کہنا کسی حد تک درست ہے، میں اس پر تبصرہ تو نہیں کروں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''مگر پتہ نہیں کیا بات ہے، پولیس کے بارے میں اکثر لوگوں کا تاثر کچھ اسی قسم کا ہے۔''

نازنین نے کہا۔ ''عاقل کو تو پہلے بھی پولیس والوں کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ جب وہ پراپرٹی ایجنٹ اس کے ستر ہزار روپے لے کر رفو چکر ہو گیا تھا تو عاقل رپورٹ درج کروانے تھانے گیا تھا۔ رپورٹ تو انہوں نے درج نہیں کی، الٹا عاقل کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا تھا۔''

''عاقل جیسے لوگوں کے ساتھ زندگی کے مختلف مراحل میں اسی قسم کے واقعات پیش آتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ پھر پوچھا۔ ''پولیس والوں نے عاقل کو کس بات پر ڈانٹ پلائی تھی؟''

نازنین نے بتایا۔ ''عاقل کی کتھا سننے کے بعد تھانیدار نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا، کوئی پولیس اہلکار تم لوگوں سے کسی کام کے لئے سو پچاس مانگ لے تو تم ''رشوت، رشوت'' کا راگ الاپنے لگتے ہو۔ مگر دوسری طرف خود اپنے ہاتھوں سے فراڈ پراپرٹی ایجنٹوں اور دوسرے نوسر بازوں کو نہایت فرمانبرداری سے ستر ستر ہزار نکال کر دے دیتے ہو۔ تم جیسے سیانے کوّوں کے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''خیر، تھانے دار صاحب کو اس قسم کی طنز نگاری نہیں کرنا چاہئے تھی۔''

''انہوں نے اسی پر بس نہیں کی۔'' نازنین نے کہا۔ ''بلکہ جب عاقل نے رپورٹ درج کرنے پر زور دیا تو اسے یہ کہہ کر وہاں سے بھگا دیا...... عاقل میاں! جاؤ، کہیں سے اس پراپرٹی ایجنٹ کو پکڑ کر ہمارے پاس لے آؤ۔ پھر ہم تمہارے پیسے تمہیں دلوا دیں گے۔ عاقل، فراڈ پراپرٹی ایجنٹ کو ڈھونڈنے کی سکت اور حوصلہ نہیں رکھتا تھا اس لئے خاموشی سے گھر آ گیا۔ اب تو اس واقعے کو ڈیڑھ سال سے بھی زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔''

میں نے نازنین کے خاموش ہونے پر سوال کیا۔ ''تمہارے رشتے والے معاملے پر تو وہ لوگ مکان فروخت کرنے یا رہائش تبدیل کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ بعد میں عاقل کو مکان کی فروخت کا خیال کیونکر آ گیا؟''

''بات دراصل یہ ہے بیگ صاحب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''اس وقت مکان کی فروخت یا تبدیلی کے سلسلے میں سب سے بڑی رکاوٹ پھوپھو جان نے ڈالی تھی، بس وہ اپنی ضد پر اڑ گئی تھیں۔ مگر اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں اور اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں نے پوچھا۔ ''اس کے علاوہ کیا بات ہے؟''

نازنین نے بتایا۔ ''میں نے سنا ہے، عاقل میاں آج کل شادی کے سلسلے میں سرگرم عمل

ممکن ہے، لڑکی والوں نے وہی شرط لگا دی ہو جو ابو نے پھوپھو جان کے سامنے رکھی تھی اور نتیجے میں عاقل میاں نے اپنی عقل کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے وہ جھگی نما مکان فروخت کر دیا۔ مگر اس کی قسمت نے یاوری نہیں کی اور وہ ایک عیار شخص سلطان سے مات کھا گیا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں دل سے خواہاں ہوں کہ اس کا بھلا ہو جائے۔ آپ اس سلسلے میں جو کچھ کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں۔''

اس کے بعد نازنین نے ایک مرتبہ پھر فیس میں رعایت کی بات کی۔ میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''نازنین! میں تمہاری وجہ سے عاقل میاں کے ساتھ ہر ممکن رعایت کروں گا۔ لیکن چونکہ صحیح صورتِ حال کا تمہیں بھی علم نہیں اس لئے کسی وقت عاقل کو یہاں بلا لو۔ میں اس کا انٹرویو کرنے کے بعد ہی کسی فیصلے پر پہنچ سکوں گا کہ عاقل کو کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔ ممکن ہے، تھانہ انچارج سے ملاقات کرنے پر ہی بات بن جائے۔ اگر ضروری ہوا تو سلطان جیسے بدمعاش کے ساتھ کوئی بدمعاشی کی راہ بھی نکال لی جائے گی۔''

نازنین نے وعدہ کیا کہ وہ کل ہی عاقل کو دفتر آنے کی تاکید کرے گی۔

نازنین کم و بیش ایک سال سے میرے پاس کام کر رہی تھی۔ اس کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق پانچ سال قبل ایک بہت نستعلیق اور باحیثیت شخص سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ ملازمت کرنا اس کی معاشی ضرورت نہیں تھی بلکہ یہ اس کا شوق تھا جس پر اس کے شوہر نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ ابھی تک وہ اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی لہٰذا یہ پسندیدہ ملازمت وقت گزاری کا ایک ذریعہ بھی تھی۔ نازنین بتیس سال کی ایک دلکش اور خوبصورت عورت تھی۔ آج تک اس نے مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ اپنے کام میں دلچسپی لینے والی ایک ذمے دار ورکر تھی۔

آئندہ روز عاقل میاں میرے دفتر میں موجود تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے جھٹکا لگا۔ وہ کسی بھی انداز سے نازنین کا کزن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچاس اور ساٹھ کے درمیان لگایا۔ ازاں بعد نازنین نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی۔ عاقل کی عمر پورے چھپن سال تھی۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ سب کو پینتالیس سال بتاتا تھا۔ جبکہ اس کی صحت اور چہرے کی جھریوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ ساٹھ کے پیٹے میں تھا۔ بہرحال، نازنین واقعی لکی تھی کہ خود سے لگ بھگ چوبیس سال بڑے مرد سے اس کی شادی نہیں ہو سکی تھی۔ قدرت کے ہر کام میں مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے۔ عاقل اور نازنین کی شادی نہ ہونے میں قدرت کی جو بھی مصلحت کارفرما تھی، وہ خاصی نمایاں اور واضح دکھائی دیتی تھی۔

میں نے کم و بیش ایک گھنٹے تک عاقل سے گفتگو کی۔ اس سے مختلف سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لئے مجھے خود پر قابو رکھنا پڑا۔ کیونکہ وہ میری کم سنتا تھا اور اپنی زیادہ کہتا تھا۔ پھر بات بات پر اپنے موقف کی حمایت میں ایسے دلائل دیتا تھا جس پر خون کھول اٹھتا تھا۔ اس کی احمقانہ ہٹ

دھری نے مجھے کوفت میں مبتلا کر دیا اور ایک مرحلے پر تو میں نے سوچا کہ اسے نو دو گیارہ کر دوں مگر اس کی صورت کی چغدانہ مظلومیت نے مجھے اس عمل سے روک دیا۔ میں نے کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی بپتا سن لی اور مدد کا یقین دلاتے ہوئے اسے اپنے دفتر سے رخصت کر دیا۔

ایک گھنٹے کی مغز ماری بالفاظِ دیگر دماغ سوزی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ عاقل کی مدد کرنے والا کسی بھی مرحلے پر مصیبت میں مبتلا ہو سکتا تھا۔ وہ اس ڈھٹائی سے اپنے بیانات بدلتا تھا کہ لامحالہ اس پر غصہ آنے لگتا تھا۔ تاہم میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی، اور وہ یہ کہ عاقل میاں کے ساتھ واقعی زیادتی ہوئی تھی، زیادتی ہوتی رہی تھی اور مجھے قوی امید تھی کہ آئندہ بھی اس کے ساتھ زیادتی ہونے کے امکانات روشن تھے۔ اس کی یہی بے چارگی اور کسمپرسی اس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی تھی۔ شاید اسی وجہ سے نازنین بھی اس کے مسائل میں دلچسپی لے رہی تھی۔ میرے دل میں بھی اس کے لئے ایک نرم گوشہ پیدا ہو گیا۔

فروختِ مکان کے سلسلے میں عاقل میاں کو جو حالات پیش آئے تھے، اور ازاں بعد وہ اب تک جس قسم کی صورتِ حال سے گزر رہا تھا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں تا کہ آپ اس کیس (عاقل میاں) کے عواقب و جوانب سے اچھی طرح آگاہ ہو جائیں۔

⁂☆⁂

چھپن سالہ عاقل میاں اپنی عمر میں گیارہ سال کی ڈنڈی مارتا تھا۔

اس ڈنڈی کی سلامتی کے لئے اسے جانے کیا کیا ڈنڈ پیلنا پڑتے تھے۔ ان کوششوں میں سرفہرست تو خضاب کا استعمال تھا۔ اس کے سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال پوری طرح سفید ہو چکے تھے۔ جھریوں زدہ اور پچکے ہوئے چہرے پر اس نے ''خدا کی پناہ'' قسم کی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں جنہوں نے اس کے چہرے کے غالب حصے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ عاقل کی مونچھیں کم رقبے پر لگے ہوئے کسی چھتناور درخت کی مانند سایہ فگن تھیں۔

وہ ان دنوں کرائے کے ایک فلیٹ میں رہ رہا تھا۔ مذکورہ فلیٹ کسی اور محلے میں واقع تھا۔ اس محلے سے عاقل کی آبائی بستی خاصے فاصلے پر تھی۔ یہ فلیٹ چھ سو روپے ماہوار کرائے پر حاصل کیا گیا تھا جو عاقل کی ''نازک طبع جیب'' پر بہت گراں گزر رہا تھا مگر مجبوری تھی۔ کیونکہ وہ اپنا مکان تو سلطان کے حوالے کر چکا تھا جس کی پوری ادائیگی بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب اسے سلطان کی چالاکی اور عیاری کہیں یا عاقل کی بے وقوفی، بہرحال سلطان مکان پر قابض تھا اور عاقل فلیٹ کا کرایہ بھر رہا تھا۔

عاقل سال ہا سال سے ایک ٹیکسٹائل مل میں کام کر رہا تھا۔ مذکورہ فیکٹری سائٹ کے علاقے میں واقع تھی۔ اس ملازمت سے اسے مبلغ دو ہزار روپے تنخواہ ملتی تھی۔ وہ بنیادی طور پر ایک کنجوس شخص تھا اس لئے بچاتا زیادہ اور خرچ کم کرتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی ''بچت'' اس کے بجائے ہمیشہ دوسروں کے کام آتی رہی تھی۔ ایک تازہ ترین مثال تو پراپرٹی ایجنٹ ہی کی تھی جو اس کے ستر

ہزار روپے مار کر غائب ہو گیا تھا۔ کسی نے سچ کہا ہے، جب تک اس دنیا میں بے وقوف موجود ہیں، عقل مند بھوکے نہیں مر سکتے۔

عاقل میاں بہت محنتی بھی واقع ہوا تھا۔ وہ اپنی جسمانی سکت سے زیادہ کام کرتا تھا۔ اس طرح اوور ٹائم کی مد میں وہ مزید پانچ چھ سو روپے کما لیتا تھا۔ فلیٹ کی خریداری اور ستر ہزار روپے کے نقصان کے سلسلے میں جو واقعات پیش آئے ہیں ان کے ذکر سے اجتناب برتتے ہوئے براہِ راست عاقل میاں کے موجودہ مسئلے کی طرف آتا ہوں۔

والدہ کے انتقال کے بعد عاقل میاں بالکل تنہا رہ گیا تھا۔ یہ تنہائی رات کی تاریکی میں شدت پکڑ جاتی اور اس کی اکثر راتیں کروٹیں بدلتے ہوئے گزر جاتیں۔ جن لوگوں کو اس سے ذرا سی بھی ہمدردی تھی انہوں نے اول آخر یہی مشورہ دیا کہ میاں نخرے بازی چھوڑو اور جو ہے، جہاں ہے، جیسا ہے کی بنیاد پر فوراً شادی کر لو تا کہ تمہاری تنہائی بانٹنے والا کوئی آئے اور تمہیں اس عذاب سے نجات دلائے۔ کسی زمانے میں عاقل ''جو ہے، جہاں ہے، جیسا ہے'' کی بنیاد پر شادی کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا کیونکہ اس کے نزدیک شادی کا ایک خاص معیار تھا۔ لڑکی کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ نہ ہو، دبلی پتلی ہو، خوبصورت ہو اور خصوصاً گوری چٹی بھی ہو۔ اس قسم کی بہت سی لڑکیاں اسے پسند آئیں مگر بدقسمتی سے ان لڑکیوں نے عاقل کو ریجیکٹ کر دیا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اب تک ایویں ہی بیٹھا ہوا تھا۔

جب انسان اپنی عمر سے نصف اور اپنی ''اوقات'' سے دوگنے رشتے کی تلاش میں رہے تو گوہرِ مقصود بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ عاقل نے تو ''نصف'' اور ''دوگنا'' کی حدوں کو بھی پھلانگ رکھا تھا۔ لہٰذا ناکامیابی یقینی تھی۔

خیر، خیر خواہوں کا مشورہ کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا اور اس نے سوچا کہ پہلی فرصت میں اس جھونپڑی نما مکان کو فروخت کیا جائے تا کہ کسی بہتر جگہ رہائش اختیار کرنے سے کوئی زیادہ بہتر رشتہ اس کے ہتھے چڑھ سکے۔ چنانچہ وہ بڑی شد و مد سے مکان بیچنے کی مہم میں لگ گیا۔

یہ ایک معقول فیصلہ تھا مگر اس کی ڈیمانڈ انتہائی نامعقول تھی۔ اس مکان کی مارکیٹ ویلیو کسی بھی طور پچیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی لیکن عاقل اس کے پچاس ہزار روپے مانگ رہا تھا۔ نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ ایک سال کی سرتوڑ کوشش کے باوجود بھی اس مکان کا کوئی خریدار سامنے نہ آ سکا۔ جس شخص نے سب سے زیادہ آفر دی، وہ تیس ہزار روپے تھی۔ مگر عاقل نے اس پیشکش کو بری طرح ٹھکرا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ پچاس ہزار سے ایک پیسہ کم میں نہیں بیچوں گا۔

سمجھانے والے سمجھا سمجھا کر تھک گئے۔ بالآخر انہوں نے عاقل کو اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

عاقل بھی خاموش ہو کر بیٹھ رہا۔ اس خاموشی کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک روز اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ عاقل عام طور پر چھٹی کے روز بھی فیکٹری چلا جاتا تھا مگر اس دن اس کی طبیعت کچھ ناساز تھی اس لئے وہ اوور ٹائم کرنے نہیں گیا تھا۔

عاقل نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی عورت کو کھڑے پایا۔ عاقل نے سوالیہ نظروں سے اس عورت کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جی فرمائیں!''

''تمہارا نام عاقل ہے نا؟'' اجنبی عورت نے پوچھا۔

عاقل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

عورت بولی۔ ''میرا نام اصغری ہے۔ میں اسی بستی کے دوسرے کنارے پر رہتی ہوں۔''

''میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔'' عاقل نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''مگر میں تمہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔'' عورت زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری مرحوم والدہ سے میری علیک سلیک تھی اور تمہیں بھی مسجد میں آتے جاتے کئی مرتبہ دیکھ چکی ہوں۔''

عاقل نہایت پابندی سے نماز ادا کرتا تھا۔ صبح شام وہ بستی کی مسجد میں نماز ادا کرتا تھا۔ وہ مسجد چونکہ بستی کے ایک کنارے پر واقع تھی اس لئے عاقل کو اصغری کے بیان پر شک نہیں گزرا۔ کیونکہ وہ بتا چکی تھی، وہ بستی کے اسی کنارے پر رہائش رکھتی تھی۔ عاقل، اصغری کی اس وقت آمد کا مقصد نہیں سمجھ سکا تھا اس لئے اس کی سوالیہ نظر اصغری کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

اصغری کی عمر لگ بھگ پچاس سال تھی۔ اس نے عاقل کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عاقل! میں تم سے ایک ضروری معاملے میں گفتگو کرنے آئی ہوں۔ کیا تم مجھے گھر کے اندر نہیں بلاؤ گے؟''

عاقل کو اصغری بتا چکی تھی کہ وہ اس کی والدہ سے جان پہچان رکھتی تھی چنانچہ اس نے اصغری کے اندر داخل ہونے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اصغری گھر کے اندر داخل ہوئی تو عاقل نے دروازہ بھیڑ دیا۔

گھر کے اکلوتے کمرے میں ایک پلنگ بچھا ہوا تھا۔ اصغری پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ایک گلاس ٹھنڈا پانی تو پلاؤ۔''

عاقل نے فوراً اسے پانی پیش کر دیا۔

جب وہ پانی پی چکی تو عاقل نے اپنی عقل ناتواں کا استعمال کرتے ہوئے استفسار کیا۔ ''جب تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو تو تم نے سب سے پہلے میرا نام کیوں پوچھا تھا؟'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''میرا مطلب ہے، تمہاری دستک کے جواب میں جب میں نے دروازہ کھولا تھا اس وقت؟''

''بات چیت شروع کرنے کے لئے کچھ تو پوچھنا تھا نا۔'' اصغری عام لہجے میں بولی۔ ''میں نے سوچا، تمہارے نام ہی سے آغاز کرتی ہوں۔''

عاقل، اصغری کی وضاحت سے مطمئن ہو گیا۔ پھر پوچھا۔ ''تم نے اندر آنے سے پہلے کہا تھا کہ مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہو؟''

''ہاں بھئی۔'' اصغری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ میں مکانوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں لوگوں کی مدد کرتی رہتی ہوں۔ اس طرح کمیشن کے طور پر مجھے بھی چار پیسے مل جاتے ہیں۔ کیا کروں، بیوہ عورت ہوں۔ جوان بیٹی کا ساتھ ہے۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں۔ بس اسی طرح گزر بسر ہو جاتی ہے۔ مہینے میں دو تین مکانوں کے سودے کروا دیتی ہوں۔ اللہ کا شکر ہے، گزارا ہو جاتا ہے۔''

''مگر اس تفصیل کا مجھ سے کیا تعلق ہے؟'' عاقل نے پوچھا۔

''بتاتی ہوں۔'' اصغری اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی۔

عاقل منتظر نظر سے اسے دیکھنے لگا۔ چند لمحات کے توقف کے بعد اصغری نے کہنا شروع کیا۔

''مجھے پتہ چلا ہے، تم بھی اپنا مکان بیچنا چاہتے ہو؟''

''ہاں، آپ کو بالکل صحیح پتہ چلا ہے۔'' عاقل نے تصدیق کی۔

''میں نے سنا ہے، تم اس مکان کے پچاس ہزار روپے مانگ رہے ہو؟'' اصغری نے تیز نظر سے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

عاقل نے جواب دیا۔ ''ہاں، میری ڈیمانڈ تو یہی ہے۔''

''مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ پچیس تیس سے زیادہ کا گاہک نہیں لگ رہا۔''

''کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔''

''تم اپنی ڈیمانڈ میں کچھ کمی کیوں نہیں کرتے؟'' اصغری نے کہا۔

وہ قطعیت سے بولا۔ ''یہ ممکن نہیں ہے۔ میں مرحوم والدہ کی نشانی کو پچاس ہزار روپے سے ایک پیسہ کم میں فروخت نہیں کروں گا۔ والدہ صاحبہ کو اس گھر سے بہت محبت تھی۔ انہوں نے تو اس سلسلے میں اپنے بھائی کو ناراض کر لیا تھا۔''

''میں ان تمام واقعات سے واقف ہوں۔'' اصغری مدبرانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری ماں نے مجھے تمہارے رشتے کی ساری کہانی سنائی تھی۔''

عاقل ہونقوں کی طرح اثبات میں گردن ہلانے لگا۔

اصغری نے کہا۔ ''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی عاقل میاں!''

''وہ کیا؟'' عاقل کے لہجے میں حیرت تھی۔

اصغری نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تمہیں اپنی والدہ کی نشانی یعنی اس مکان سے اتنی ہی انسیت ہے تو پھر تم اسے بیچنا کیوں چاہتے ہو؟''

''وہ...... وہ دراصل بات یہ ہے...... کہ......'' عاقل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اصل بات کو

بتائے یا چھپائے۔

اصغری نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کہیں پھر کوئی شادی وغیرہ کا چکر تو نہیں چلا رہے ہو؟''

''بس کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' عاقل نے گول مول جواب دیا۔

اصغری نے پوچھا۔ ''معاملہ کہاں فٹ کیا ہے؟''

''ابھی تک فائنل نہیں ہوتی۔''

''بات کہاں تک پہنچ چکی ہے؟'' اصغری نے کرید جاری رکھی۔

عاقل ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''میرے لئے لڑکی دیکھی جا رہی ہے۔''

''لڑکی؟'' اصغری نے حیرت سے دیدے گھمائے، پھر پوچھا۔ ''کون دیکھ رہا ہے تمہارے لئے لڑکی؟''

عاقل نے تامل کرتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے اپنی شادی کے سلسلے میں پیش امام صاحب سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے تسلی دی ہے کہ وہ میری پسند کی لڑکی میرے لئے تلاش کریں گے۔''

''تمہاری پسند کی لڑکی؟'' اصغری نے طنز آمیز لہجے میں کہا۔ ''یعنی گوری چٹی، ڈبلی پتلی اور سولہ سترہ سال کی؟''

عاقل نے اپنی اندرونی خوشی کو چھپانے کی ناکامیاب کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''مسجد کے پیش امام صاحب نے یہی وعدہ کیا ہے۔''

اصغری زیرلب بڑبڑائی۔ ''مولوی صاحب نے مسجد میں شادی دفتر کب سے کھول لیا ہے؟''

عاقل، اصغری کی بڑبڑاہٹ کو سنجیدہ لیتے ہوئے بولا۔ ''انہوں نے شادی دفتر نہیں کھولا۔ یہ کام وہ صرف میرے لئے کریں گے۔ میں نے انہیں ہمیشہ اپنا بزرگ سمجھا ہے۔ والدہ کی وفات کے بعد تو وہ میرا کچھ زیادہ ہی خیال رکھنے لگے ہیں۔ میری شادی کا ذکر بھی انہوں نے ہی چھیڑا تھا۔ مجھ سے پوچھا، لڑکی کے معاملے میں میری کیا ترجیحات ہیں؟ میں نے انہیں سب کچھ بتا دیا۔ انہوں نے کہا، میں بے فکر ہو جاؤں۔ وہ بہت جلد میرے لئے میرے معیار کی لڑکی ڈھونڈ نکالیں گے۔''

''اس سلسلے میں مولوی صاحب نے تم سے کوئی رقم وغیرہ بھی......''

''بالکل نہیں۔'' عاقل نے اصغری کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اس نیک کام کے لئے وہ مجھ سے ایک پیسہ بھی نہیں لیں گے۔ میں نے سوچا، جب وہ ہمارا نکاح پڑھائیں گے تو اس موقع پر میں ان کی کچھ ''خدمت'' ضرور کروں گا۔ یہ تو ان کا حق ہوگا۔''

اصغری نے کہا۔ ''عاقل میاں! مولوی صاحب تمہارے لئے لڑکی تلاش کریں گے، وہی تم دونوں کا نکاح پڑھائیں گے مگر اس کے بعد کیا ہوگا؟''

اصغری کا اختتامی جملہ غیر واضح اور ذومعنی تھا۔ عاقل کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہی تھی

تاہم اسے اپنی اس غلطی کا ضرور احساس ہو گیا کہ اپنی شادی والا معاملہ اسے اصغری کو نہیں بتانا چاہئے تھا۔ اس نے منت آمیز لہجے میں اصغری سے کہا۔

''دیکھو! میں نے ابھی تک کسی کو اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتایا۔ تم پہلی عورت ہو جس سے میں نے یہ ذکر کیا ہے۔ میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم کسی اور کو یہ بات نہ بتانا۔ مجھے امید ہے، تم اس راز کو راز رکھو گی۔ کم از کم اس وقت تک جب تک پیش امام صاحب میرے لئے کوئی مناسب لڑکی تلاش نہیں کر لیتے۔''

وہ شرارت سے مسکرائی اور بولی۔ ''کیا مولوی صاحب نے اس ''راز'' کو پوشیدہ رکھنے کی تلقین کی ہے؟''

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' عاقل نے جواب دیا۔

اصغری بولی۔ ''ٹھیک ہے، میں تمہارے اس راز کو ہمیشہ اپنے سینے میں چھپائے رکھوں گی۔ سمجھ لو، تم نے مجھے کچھ بتایا ہی نہیں۔ اس سلسلے میں تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' وہ ممنونیت سے بولا۔

اصغری نے کہا۔ ''چلو، اب کچھ کام کی باتیں بھی ہو جائیں۔''

''کس کام کی باتیں؟'' عاقل چونک اٹھا۔

''بھئی تمہارے مکان کی باتیں۔'' اصغری نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنا مکان بیچنا چاہتے ہو اور میں جائیداد کی خرید و فروخت میں دو پارٹیوں کے درمیان واسطہ بنتی ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے مکان کا کوئی گاہک تلاش کروں۔ میرا مطلب ہے پارٹی!''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں، بس میری ایک ہی شرط ہے۔'' عاقل ضدی لہجے میں بولا۔

اصغری فوراً اس بات کی تہہ تک پہنچ گئی، جلدی سے بولی۔ ''یعنی تم پچاس ہزار روپے سے کم میں مکان نہیں بیچو گے؟''

''بالکل یہی بات ہے۔'' عاقل نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اصغری نے کہا۔ ''عاقل! اگر میں تمہارا مکان بکوا دوں تو تم مجھے کتنے پیسے دو گے؟'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے وضاحت کی۔ ''پیسوں والی بات میں نے عمومی استعمال کے حوالے سے کی ہے۔ کہیں تم یہ نہ کہہ دینا کہ مجھے دو سو پیسے یا تین سو پیسے دو گے۔ پیسوں سے میری مراد کمیشن کی رقم ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں۔'' عاقل نے مسکراتے ہوئے کہا پھر بولا۔ ''ایسا کرو، تم میرا مکان جتنے میں بھی بکوا دو، مجھے تم صرف پچاس ہزار روپے دینا۔ باقی رقم تمہاری ہوگی۔''

اصغری نے اپنے چہرے پر اس قسم کے تاثرات ابھارے جیسے وہ کچھ سوچنے کی کوشش کر رہی ہو۔ عاقل کو یقین نہیں تھا کہ اصغری اس کی تجویز سے اتفاق کر لے گی۔ لیکن اصغری کے جواب نے

اسے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ اس حیرت میں بے انتہا خوشی بھی شامل تھی۔

اصغری نے سنجیدہ لہجے میں جواب دیا۔ ''مجھے تمہاری تجویز منظور ہے۔ فرض کرو، میں تمہارا مکان ایک لاکھ میں فروخت کروا دیتی ہوں۔ اس صورت میں پچاس ہزار روپے میرے ہوں گے۔''

عاقل نے اثبات میں گردن ہلائی اور بولا۔ ''کیا واقعی یہ مکان ایک لاکھ روپے میں فروخت ہو سکتا ہے؟''

اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ مکان کی فروخت کے سلسلے میں اصغری کو بیچ میں لا کر غلطی کر رہا ہو۔ اسے چاہئے کہ وہ خود ایک لاکھ میں مکان فروخت کر کے ساری رقم جیب میں ڈال لے۔ دولت کی ہوس انسان کو عجیب و غریب زاویوں سے سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ حالانکہ عاقل کو بخوبی اندازہ تھا کہ اس کا مکان کسی بھی طور تیس ہزار روپے سے زیادہ کا نہیں تھا۔

اصغری نے عاقل کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''عاقل میاں! میں نے تو ایک بات کہہ دی تھی۔ ورنہ میرے خیال میں تو تم اس مکان کے پچاس ہزار بھی بہت زیادہ مانگ رہے ہو۔''

عاقل قدرے مایوس ہوا پھر بولا۔ ''چلو ٹھیک ہے، تم اس مکان کا گاہک لاؤ۔ پچاس ہزار سے زیادہ جتنی رقم ہوگی وہ تمہاری۔''

اصغری مزید دس پندرہ منٹ عاقل کے پاس بیٹھ کر واپس چلی گئی۔ وہ رات عاقل نے پچاس ہزار کے نوٹ بار بار گنتے ہوئے گزار دی۔ دوسری صبح وہ مکان پر تالا ڈال کر فیکٹری چلا گیا۔

عاقل فیکٹری جاتے ہوئے ایک ہوٹل سے ناشتہ کرتا تھا۔ دوپہر کا کھانا وہ فیکٹری کی کینٹین میں کھاتا تھا اور رات کا کھانا واپسی پر اسی ہوٹل میں کھاتا تھا جہاں وہ صبح جاتے وقت ناشتہ کرتا تھا۔ اس کی خوراک بہت مختصر تھی جس کی وجہ سے اس کی صحت روز بروز گرتی بلکہ لیٹتی جا رہی تھی۔ وہ اللہ کا بندہ ناشتے میں ایک چائے اور دو بسکٹ کھاتا تھا، کبھی کبھار چھٹی کے روز بسکٹ کے بجائے پراٹھے سے ''عیاشی'' کر لی جاتی تھی۔ دوپہر میں وہ ایک روٹی اور تھوڑا سا دہی کھاتا تھا۔ تھوڑا سا دہی سے مراد آدھ پاؤ سے بھی کم دہی ہے۔ رات کو دال سبزی اور دو چپاتی۔ بس یہی اس کی کل خوراک تھی۔ دودھ، پھل اور گوشت کا اس کی زندگی میں گزر نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے بدن پر تازگی، رعنائی اور صحت نام کی کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ ایک بات عام طور پر میرے مشاہدے میں آئی ہے، یقیناً آپ کے مشاہدے میں بھی آئی ہوگی اور وہ یہ کہ جو لوگ کھانے پینے کے معاملات میں حد درجہ کنجوسی بلکہ بخل سے کام لیتے ہیں اور پیسہ پیسہ جمع کرنے کے چکر میں لگے رہتے ہیں ان کا جمع جتھا کسی اور ہی کے کام آتا ہے۔ خدا کے عطا کردہ وجود کو اگر بلاوجہ بھوکا پیاسا رکھا جائے تو یہ وجود اس انسان کے لئے خود سے کچھ اچھا تو مانگ نہیں سکتا۔ بہرحال، یہ دنیا ہے اور اس دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

اس روز عاقل فیکٹری سے واپس گھر آیا تو تھوڑی ہی دیر بعد اصغری آن ٹپکی۔ وہ خاصی برہم

دکھائی دیتی تھی۔ عاقل اسے گھر کے اندر لے آیا۔ اصغری نے پلنگ پر بیٹھتے ہی کہا۔

''تم کہاں غائب ہو گئے تھے۔ میں صبح سے دس چکر لگا چکی ہوں۔''

''ظاہر ہے، میں کام پر گیا ہوا تھا۔'' عاقل نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔

اصغری بولی۔ ''میں جب بھی یہاں آئی، تمہارے دروازے پر پڑے تالے کو دیکھ کر واپس چلی گئی۔''

''اتنے پھیرے لگانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟'' عاقل نے استفسار کیا۔ ''کیا اس مکان کے لئے کوئی پارٹی تلاش کر لی ہے تم نے؟''

اصغری اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں، بالکل یہی بات ہے۔ میں نے ایک مناسب اور معقول پارٹی کا بندوبست کر لیا ہے۔ تم صبح میرا انتظار کرنا۔ میں سلطان بھائی کو اپنے ساتھ لے کر آؤں گی۔''

''لیکن صبح تو میں فیکٹری......''

''فیکٹری ذرا دیر سے چلے جانا۔'' اصغری نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ''سلطان بھائی سے صبح ہی بات ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ وہ ایک ہفتے کے لئے کراچی سے باہر جانے والا ہے۔ اگر وہ نکل گئے تو معاملہ ایک ہفتے بعد پر چلا جائے گا۔''

عاقل نے پوچھا۔ ''یہ سلطان بھائی کون ہیں اور وہ کراچی سے باہر کہاں جانے والے ہیں؟''

''سلطان میرے ایک جاننے والے ہیں۔'' اصغری نے بتایا۔ ''سندھی ہوٹل کے قریب رہتے ہیں۔ وہ ایک ہفتے کے لئے حیدرآباد جانے والے ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ کل تمہیں بیعانہ تو دلوا دوں۔''

عاقل نے پوچھا۔ ''کیا وہ پچاس ہزار میں میرا مکان خریدنے پر تیار ہو گئے ہیں؟''

''میں نے اسے تمہاری ڈیمانڈ کے بارے میں ابھی کچھ نہیں بتایا۔'' اصغری نے بتایا۔ ''صبح میں تمہارے سامنے ہی بات کروں گی۔ بس تم خاموش رہنا۔ سلطان سے سارا معاملہ میں طے کروں گی۔ اس نے کہا تھا کہ کوئی بات طے کرنے سے پہلے وہ تمہارا مکان دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے میں کل صبح اسے اپنے ساتھ لے کر آؤں گی۔''

عاقل نے اصغری کو یقین دلایا کہ وہ آئندہ صبح اس کا اور سلطان کا انتظار کرے گا۔ اصغری مطمئن ہو کر واپس چلی گئی۔

آئندہ روز اصغری سلطان نامی ایک شخص کے ساتھ آ دھمکی۔ سلطان چالیس سال کا ایک صحت مند شخص تھا۔ اس کے حلیے اور وضع قطع سے لگتا تھا، وہ کوئی شریف آدمی نہیں۔ لیکن عاقل کو اس کی شرافت یا بدمعاشی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس کا مکان مطلوبہ قیمت پر بکنے جا رہا تھا، اس کے لئے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہو سکتی تھی۔

سلطان جس دوران میں گھوم پھر کر مکان کا جائزہ لے رہا تھا، عاقل ان کے لئے چائے لینے گھر

سے نکل گیا۔ اجنبی لوگوں کو گھر میں چھوڑ کر چلے جانا عاقل جیسے عقل مند ہی کا حوصلہ ہوسکتا تھا۔

اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اصغری سلطان کے ساتھ اس گھر کے اکلوتے پلنگ پر براجمان تھی۔ چائے پینے کے بعد اصغری نے سلطان سے کہا۔

''بھائی سلطان! مکان تو تم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اب کام کی بات بھی ہو جائے تو اچھا ہے۔ عاقل میاں کو ڈیوٹی پر بھی جانا ہے۔''

سلطان نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو اصغری!'' پھر وہ عاقل کی جانب متوجہ ہوا۔ ''ہاں میاں! تم اس مکان کا کیا مانگ رہے ہو؟''

عاقل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اصغری بول اٹھی۔ ''یہ اس معاملے میں کچھ نہیں کہے گا سلطان بھائی۔ اس نے مکان کا سلسلہ مجھ پر چھوڑ دیا ہے۔ جو بھی بات ہوگی، مجھ سے ہوگی۔''

اگر کوئی سمجھدار شخص وہاں موجود ہوتا تو وہ فوراً سمجھ جاتا کہ اصغری اور سلطان جس انداز میں بات کر رہے تھے اس سے ان کی ملی بھگت عیاں ہو رہی تھی۔ لیکن عاقل مکان بکنے کی خوشی میں رہی سہی عقل کو بھی خدا حافظ کہہ چکا تھا۔

سلطان نے اصغری کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''چلو تم سے ہی بات کر لیتے ہیں۔ بتاؤ، تمہاری کیا ڈیمانڈ ہے؟''

اصغری نے کہا۔ ''میں اس مکان کو ستر ہزار میں بیچوں گی۔''

''دماغ خراب ہوگیا ہے تمہارا؟'' سلطان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''اس کھولی کا ستر ہزار؟''

اصغری بولی۔ ''بھئی، یہ کھولی ہے یا کوئی آراستہ و پیراستہ بنگلہ، اس بحث میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ جو کچھ ہے وہ تمہارے سامنے ہے۔''

''سامنے ہے اسی لئے تو کہہ رہا ہوں۔'' سلطان نے کہا۔ ''اس مکان کے ستر ہزار بہت زیادہ ہیں۔''

اصغری نے پوچھا۔ ''تمہاری پیشکش کیا ہے؟''

''زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار۔''

''یہ تو بہت کم ہیں۔'' اصغری ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''چلو، میں ستر سے پینسٹھ پر آجاتی ہوں۔''

سلطان نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی اور بولا۔ ''میرے حساب سے تو پینسٹھ بھی بہت زیادہ ہیں۔''

''پھر تم ہی کچھ آگے بڑھو۔'' اصغری نے کہا۔

سلطان بولا۔ ''پینتالیس کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''کم ہیں۔'' اصغری نے کہا۔ ''چلو ساٹھ کر لیتے ہیں۔''

''میں پچاس سے آگے نہیں بڑھوں گا۔''

اصغری چند لمحے سوچتی رہی، پھر سنجیدہ لہجے میں بولی۔ ''ایسا کرتے ہیں، نہ تمہارے پچاس اور نہ میرے ساٹھ۔ پچپن پر سودا ڈن کر لیتے ہیں۔''

تھوڑے سے ردّ وقدح کے بعد سلطان وہ مکان پچپن ہزار روپے میں خریدنے پر آمادہ ہوگیا۔

اصغری نے کہا۔ ''سلطان! تم بیعانہ کتنا دے رہے ہو؟''

''پانچ ہزار کافی رہیں گے؟'' سلطان نے پوچھا۔

اصغری نے آمادگی ظاہر کر دی۔

سلطان نے پانچ ہزار کے نوٹ نکال کر اصغری کے حوالے کر دیئے۔

اصغری نے رقم گننے کے بعد کہا۔ ''باقی رقم کی ادائیگی کب تک ہوگی؟''

''کل تو میں ایک ہفتے کے لئے حیدرآباد جارہا ہوں۔'' سلطان نے جواب دیا۔ ''وہاں سے واپس آجاؤں تو رقم ادا کر دوں گا۔''

اصغری نے ہوشیاری سے کہا۔ ''سلطان بھائی! رقم کی ادائیگی کے بعد ہی تمہیں قبضہ ملے گا، یہ بات یاد رکھنا۔ عاقل میرے بیٹے کی طرح ہے۔ مجھے اس کا بڑا خیال ہے۔''

عاقل، اصغری سے عمر میں لگ بھگ چھ سال بڑا تھا مگر اصغری کا بیٹا کہنا عاقل کو اچھا لگا تھا۔ شاید اس طرح اسے یہ احساس ہو رہا ہو کہ عمر کا پرندہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہے۔ خوش ہونے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرنا چاہئے کے مصداق عاقل، اصغری کے ریمارکس پر جی بھر کر خوش ہو رہا تھا۔

سلطان نے کہا۔ ''تم جو کہہ رہی ہو، میں بالکل ویسا ہی کروں گا۔ مگر میری بھی ایک بات یاد رکھنا۔''

''ہاں ہاں، کہو۔ تم کون سی بات کہہ رہے ہو؟''

''اگر تم نے مکان بیچنے کا ارادہ ترک کر دیا تو میں دس ہزار روپے واپس لوں گا۔'' سلطان نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''بیعانے کا یہی اصول ہوتا ہے۔ اگر بیچنے والا ارادہ بدل دے تو اسے دُگنا بیعانہ واپس کرنا پڑتا ہے۔''

اصغری چیخ کر بولی۔ ''سلطان بھائی! تم نے بیعانے کا ادھورا اصول بیان کیا ہے۔'' پھر وہ وضاحت کرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''اس اصول کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ اگر خریدار پارٹی سودا منسوخ کر دے تو اس کا دیا ہوا بیعانہ ضبط کر لیا جاتا ہے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' سلطان نے کہا۔ ''اگر میں سودے سے پھر جاؤں تو تم میرے یہ پانچ ہزار روپے واپس نہ کرنا۔''

اتنا کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اصغری نے کہا۔ ''اب کیا ارادہ ہے سلطان بھائی؟''

''میں چلوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے بیرونی دروازے کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

اصغری اور عاقل اسے دروازے تک چھوڑ کر واپس کمرے میں آگئے۔ اصغری نے بیعانے

کے پانچ ہزار عاقل کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم رکھ لو عاقل! تمہارے مکان کا سودا تو سمجھو پکا ہو گیا۔''

عاقل کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ اسے امید نہیں تھی کہ اتنی آسانی سے اس کا مکان پچپن ہزار میں فروخت ہو جائے گا۔ اس رقم میں اگرچہ کمیشن کے پانچ ہزار اصغری کے بھی تھے مگر پھر بھی مکان عاقل کی ڈیمانڈ کے مطابق پچاس ہزار روپے میں نکل گیا تھا۔ اس موقع پر عاقل کی خوشی دیدنی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے پانچ ہزار روپے تھام لئے اور متشکرانہ لہجے میں بولا۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ اصغری۔''

''ارے ارے......'' اصغری خوش دلی سے بولی۔ ''اس میں شکریئے کی کون سی بات ہے۔ میں نے تو اپنے کمیشن کی خاطر یہ سودا کروایا ہے۔ میں نے اس سلسلے میں تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔''

عاقل وفور مسرت سے پھٹا جا رہا تھا، جذباتی لہجے میں بولا۔ ''اصغری! تم دیکھ لینا، میں تمہارے ساتھ تمہاری توقع سے زیادہ اچھا سلوک کروں گا۔ بس مجھے سلطان سے رقم مل جائے، میں تمہیں خوش کر دوں گا۔''

پرندہ پھدکتا، اچھلتا نادیدہ جال کے بہت قریب آ چکا تھا۔ عاقل کی جذباتی پیشکش کو دیکھتے ہوئے اصغری اچانک افسردہ نظر آنے لگی۔ اس کی حالت دیکھ کر عاقل متفکر ہو گیا۔ اس نے تشویش ناک لہجے میں اصغری سے پوچھا۔

''کیا ہوا اصغری! تم اداس کیوں ہو گئی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ پہلو بچاتے ہوئے بولی۔

''پھر بھی؟''

''تم بھی کہو گے، میں کیا اپنے دکھ تمہیں بتانے لگی۔'' اصغری نے کہا۔ ''تم نہ ہی پوچھو تو اچھا ہے۔''

عاقل ضد پر اتر آیا۔ ''اب تو میں ضرور پوچھوں گا......اور تمہیں بتانا پڑے گا۔''

وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتی رہی۔ جب عاقل نے زیادہ ہی اصرار کیا تو وہ تامل کرتے ہوئے بولی۔ ''دیکھو، میری بات سے کوئی ایسا ویسا مطلب نہ نکالنا۔ اچھا برا وقت ہر انسان پر آتا ہے۔''

''میں کسی بھی قسم کا مطلب نہیں نکالوں گا۔'' عاقل نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تم بتاؤ، تمہارے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟''

اصغری جز بز ہوتے ہوئے بولی۔ ''مجھے کچھ پیسوں کی اشد اور فوری ضرورت ہے۔''

''تمہیں کتنے پیسے چاہئیں؟''

''پانچ ہزار روپے۔''

''اتنی رقم کا کیا کرو گی؟''

''بہت کچھ کروں گی۔'' وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''کریانہ اسٹور والے کا اچھا خاصا اُدھار چڑھا ہوا ہے۔ بجلی اور گیس وغیرہ کے بل بھی کئی ماہ سے ادا نہیں ہو سکے اور سب سے بڑھ کر حسنہ......''

لفظ حسنہ ادا کرنے کے بعد وہ اچانک خاموش ہو گئی جیسے کسی اندرونی طاقت نے اس کی زبان پر تالا ڈال دیا ہو۔

عاقل نے اضطراری لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ حسنہ کون ہے؟''

وہ ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولی۔ ''حسنہ میری جان اور اکلوتی بیٹی کا نام ہے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اس پہلی (یکم) پر میں اسے ریشمی سوٹ بنوا کر دوں گی۔ آج تک میں نے کسی سے جو وعدہ کیا ہے اسے پورا ضرور کیا ہے۔ پہلی میں صرف دو روز باقی ہیں اور ابھی تک میرا ہاتھ خالی ہے۔ تین چار پارٹیوں کے پاس میرے پیسے پھنسے ہوئے ہیں مگر وہ آئندہ پندرہ تاریخ سے پہلے نہیں ملیں گے۔ اگر آئندہ دو دن کے اندر اندر بل وغیرہ جمع نہ کروائے گئے تو میری لائٹ اور گیس کٹ جائے گی۔ کریانہ اسٹور والا بھی گھر کے کئی چکر لگا چکا ہے اور حسنہ کا ریشمی جوڑا......''

حسنہ کے ذکر پر آ کر ایک مرتبہ پھر اس کی زبان کو بریک لگ گئے۔ عاقل کو معلوم ہو چکا تھا کہ حسنہ، اصغری کی جوان بیٹی کا نام ہے۔ اس نے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔

''حسنہ کے ریشمی جوڑے کا کیا مسئلہ ہے؟'' شدت جذبات سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں کہ میں نے حسنہ سے وعدہ کر رکھا ہے کہ اسے ریشمی جوڑا بنوا کر دوں گی اور مجھے یہ وعدہ ایفا ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ زندگی میں یہ پہلی مرتبہ ہو گا کہ میں اپنے وعدے میں جھوٹی پڑوں گی۔''

''تم فکر نہ کرو اصغری۔'' عاقل گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں تمہیں جھوٹا نہیں ہونے دوں گا۔''

اس کے ساتھ ہی عاقل نے پانچ ہزار روپے اصغری کی جانب بڑھا دیئے۔ اصغری نے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرنا چاہا تو عاقل نے گہری ہمدردی سے کہا۔ ''رکھ لو اصغری! یہ تمہارے ہی ہیں۔ تم سمجھ لو، میں تمہاری کمیشن کی رقم ایڈوانس میں تمہیں دے رہا ہوں۔ اس سودے کے سلسلے میں تمہیں پانچ ہزار روپے ملنا تھے۔ تم اس رقم کو اپنا کمیشن سمجھ کر رکھ لو۔''

تھوڑے سے تامل کے بعد اصغری نے وہ رقم لے لی اور ممنونیت آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم بہت اچھے ہو عاقل! تم نے مجھ پر اعتماد کیا ہے، میں ہمیشہ تمہاری قدر کروں گی۔ کبھی گھر آؤ، میں تمہیں حسنہ سے بھی ملواؤں گی۔ وہ بھی تم جیسے ہمدرد اور مخلص انسان سے مل کر بہت خوش ہو گی۔''

پھر وہ عاقل کو اپنے گھر کی لوکیشن سمجھانے لگی۔ اصغری کا مکان بستی کے کنارے پر تھا اور وہ بستی کی اکلوتی مسجد سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ عاقل کو اس گھر کا پتہ سمجھنے میں کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

تھوڑی دیر بعد وہ عاقل کو دعائیں دیتی ہوئی رخصت ہو گئی۔

عاقل کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ایک تو اس کا جھونپڑی نما مکان بہت اچھے داموں فروخت ہونا طے پا گیا تھا جو ظاہر ہے اصغری کے توسط اور تعاون سے ممکن ہو سکا تھا۔ دوسری جانب حسنہ کے تذکرے نے اس کے دل میں گدگدی مچا دی تھی۔ اس کی دی ہوئی رقم سے حسنہ کے لئے ریشمی جوڑا خریدا جانے والا تھا۔ چاہے وہ رقم اصغری کا کمیشن ہی تھی تاہم بروقت اس کی فراہمی کا کریڈٹ عاقل ہی کو جاتا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اصغری نے اسے گھر آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ خیر سگالی کے یہ جذبات اس کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کئے دے رہے تھے۔ گویا یہ سونے پہ سہاگا والی بات تھی۔ با الفاظِ دیگر اس کی پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں تھا۔ اصغری سے میل تال نے اس کے دل کی ویرانی میں بہار کا سا سماں پیدا کر دیا تھا۔

اس روز عاقل نے فیکٹری کی چھٹی کر لی۔ اصغری کے رخصت ہوتے ہوتے دوپہر ہو گئی تھی۔ اس وقت وہ فیکٹری جا کر کیا کرتا۔ دوپہر کا کھانا کھانے وہ ہوٹل تک گیا پھر گھر آ کر سو رہا۔ اس روز اس نے دن میں جو بھی خواب دیکھا اس میں حسنہ اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود تھی۔ عاقل نے ابھی تک حسنہ کی ایک بھی جھلک نہیں دیکھی تھی۔ خواب میں نظر آنے والا مرمریں پیکر اس کے تصور نے تراشا تھا۔ یہ اس کے تخیل کی فسوں گری تھی۔ اس کی دانست میں کوئی لڑکی جتنی خوبصورت ہو سکتی تھی وہ حسنہ کے نام سے اس کے خواب کی دنیا میں موجود تھی۔

خواب آخر خواب ہوتا ہے، آنکھ کھلتے ہی ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے اور پھر دن کا خواب تو اور بھی قیامت خیز ہوتا ہے، اس کی ہلاکت گیری اپنا ثانی رکھتی ہے نہ کوئی مثال۔ اگر شخص دن میں کوئی حسین خواب دیکھ لے۔ ایسا حسین خواب جو عملی زندگی میں اس کے لئے ناممکنات میں سے ہو تو آنکھ کھلنے پر اس کی جو حالت ہوتی ہے اسے بس وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو اس تجربے سے گزرے ہوں۔ خاص طور پر اگر خواب دیکھنے والا تنہائی اور تجرد کی زندگی بھی گزار رہا ہو تو آنکھ کھلنے پر اس کے دل کا سوا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ ارمانوں پر اوس پڑ جاتی ہے اور جذبات کا فیوز اُڑ جاتا ہے۔

عاقل کی آنکھ مغرب سے کچھ دیر پہلے کھلی تھی۔ اس وقت سورج غروب ہونے کے قریب تھا اور چیزوں کے سائے خاصے بڑھ چکے تھے۔ بلکہ بہت سی چیزوں کے سائے آپس میں مل کر شام کے دھندلکے کو جنم دے رہے تھے۔ عاقل کے دماغ پر خواب کا خمار باقی تھا۔ وہ خواب جس میں اصغری کی بیٹی حسنہ اس کی ہم رکاب تھی۔ وہ دونوں انجانے مسافروں کی طرح بادلوں پر اُڑتے پھر رہے تھے۔ ان کے دل کیف و سرور سے لبریز تھے۔ وہ انبساط کی آخری حدوں کو چھو رہے تھے۔ لیکن آنکھ کھلنے کے بعد سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ خوشگوار یادوں کا میلا ایک ٹیس دینے والی کسک میں بدل چکا تھا۔

عاقل نے دو چار انگڑائیاں لینے کے بعد پلنگ چھوڑ دیا۔ مغرب کی نماز میں زیادہ وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اس نے گھر کو تالا لگایا اور مسجد کی جانب روانہ ہو گیا۔

اس نے ہمیشہ کی طرح آج بھی نماز ادا کی تھی تاہم آج اس کا ارتکاز خاصا کمزور تھا۔ وہ بار بار

اپنے خیالات کو یادِ الٰہی کی جانب مرکوز کرنے کی کوشش کرتا مگر وہ نافرمان بھٹک کر حسنہ کی جانب نکل جاتے۔ اس نے جیسے تیسے نماز ختم کی اور مسجد سے باہر نکل آیا۔ آج اس نے ایک خلافِ معمول حرکت بھی کی تھی۔ پہلے وہ جب بھی نماز ادا کرنے مسجد آتا تھا تو پیش امام صاحب سے ضرور ملاقات کرتا تھا اور ان کے درمیان شادی کے موضوع پر بات چیت ہوتی تھی۔ آج وہ نماز ختم کرتے ہی مسجد سے باہر آ گیا تھا۔

عاقل خیالوں میں کھویا ہوا اپنے گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ چونک اٹھا۔ وہ اپنے گھر کی مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ پھر جب اس کے قدم رکے تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس نے خود کو اصغری کے دروازے کے سامنے کھڑے پایا۔

ایک لمحے کو اس نے سوچا، اسے واپس چلے جانا چاہئے مگر دوسرے ہی لمحے اس کے دل نے مشورہ دیا کہ جب یہاں تک آ ہی گئے ہو تو گھر کے اندر جانے میں کیا حرج ہے۔ اس کے دل و دماغ میں چند لمحے رسہ کشی ہوتی رہی۔ اس کھینچا تانی میں جیت، دل کے حصے میں آئی اور بے اختیار اس کا ہاتھ دستک کے لئے اٹھ گیا۔

اسے محسوس ہوا، اس وقت اسے اپنے اعضا پر اختیار نہیں تھا۔ پہلے اس کے قدم بے ساختہ اور غیر محسوس طریقے سے حسنہ کے گھر کی جانب اٹھے تھے اور اب وہ اس کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

دروازہ اصغری نے کھولا۔ سامنے عاقل کو دیکھ کر اسے ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی۔ وہ عاقل کو گھر کے اندر لے گئی پھر اس نے اپنی بیٹی حسنہ سے بھی ملوایا۔ حسنہ کی عمر زیادہ سے زیادہ پچیس سال رہی ہو گی۔ وہ اسمِ بامسمیٰ تھی۔ عاقل کو وہ پہلی ہی نظر میں پسند آ گئی۔ اس روز ان میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ وہ آپس میں گھل مل گئے تھے۔

پھر عاقل اکثر وہاں جانے لگا۔ اس دوران میں حسنہ عاقل سے خاصی "فری" ہو گئی تھی۔ وہ عاقل کے "آئیڈیل" پر ہو بہو پوری اتری تھی۔ دبلی پتلی، گوری چٹی اور کم کمر۔ عاقل نے بطور بیوی جس لڑکی کا تصور کیا تھا وہ تمام خوبیاں اسے حسنہ میں نظر آ رہی تھیں۔ لگ بھگ ایک ہفتے کی آمد و شد سے معاملات اس سطح تک جا پہنچے کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے۔ ان کی یہ پسندیدگی اصغری سے پوشیدہ نہیں تھی بلکہ وہ تو انہیں ایک دوسرے کو پسند کرنے کے مواقع خود فراہم کرتی تھی۔ اس بات کا فیصلہ کرنا سردست خاصا مشکل تھا کہ آیا حسنہ واقعی عاقل میں دلچسپی لینے لگی تھی یا وہ بھرپور اداکاری کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دونوں کی عمروں میں لگ بھگ اکتیس سال کا فرق تھا۔ عاقل میاں تو عمر میں حسنہ کی ماں سے بھی پانچ چھ سال بڑا ہی تھا۔

ایک ہفتہ گزر گیا مگر سلطان حیدر آباد سے واپس نہ آیا۔ عاقل نے اصغری سے استفسار کیا تو اس نے کہا۔ "تمہیں کیوں جلدی ہو رہی ہے۔ آ ہی جائے گا وہ۔"

''مجھے جلدی اس لئے لگی ہوئی ہے کہ وہ آئے اور مجھے رقم دے۔'' عاقل نے کہا۔ ''جب ایک سودا ہو چکا تو پھر تمام معاملات نمٹ جانا چاہئیں۔''

''نمٹ جائیں گے میاں تمہارے تمام معاملات۔'' اصغری بے پروائی سے بولی۔ ''اگر سلطان کو آنے میں تاخیر ہورہی ہے تو اس میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے۔ وہ تو پانچ ہزار بیعانہ دے کر پھنس چکا ہے۔ معاملے سے پھر جانے کی صورت میں وہ بیعانے کی رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

''ہاں، یہ تو تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' عاقل اُلّو کی طرح گردن کو خم دے کر بولا۔ گردن کے اس خم کا زاویہ کچھ ایسا تھا کہ حسنہ اس کی نظر میں آرہی تھی۔ وہ حسنہ پر نگاہ ٹکاتے ہوئے بات کو آگے بڑھا کر بولا۔ ''سلطان کے پانچ ہزار میرے کام نہ سہی، چلو تمہارے کام تو آئے۔''

اصغری ذومعنی انداز میں بولی۔ ''تمہارے کام بھی آئیں گے۔ فکر نہ کرو میاں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی بیٹی کو دیکھا اور کہا۔ ''میں نے تو تم سے ادھار پر رقم مانگی تھی مگر تم نے خود ہی یہ کہہ کر وہ پانچ ہزار مجھے دیئے تھے کہ چلو میرا کمیشن مجھے ایڈوانس مل گیا۔ اگر تمہارے ذہن میں کوئی اور بات ہو تو کہہ ڈالو۔''

''نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''پانچ ہزار تم نے خرچ کر لئے یا میں نے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے پیسے الگ الگ تھوڑی ہیں۔'' یہ بات کہتے ہوئے اس کی نظر حسنہ پر جمی ہوئی تھی۔

اصغری ایک جہاں دیدہ عورت تھی۔ وہ عاقل کی بات کی تہ تک پہنچ گئی۔ جلدی سے بولی۔ ''کہہ تو تم ٹھیک ہی رہے ہو۔ جب میں نے تمہیں بیٹا کہہ دیا تو پھر غیریت کیسی۔ خیر۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں ایک ضروری کام سے ذرا باہر ہو آؤں۔ تم دونوں باتیں کرو۔''

اتنا کہہ کر وہ گھر سے نکل گئی۔ عاقل اور حسنہ ہلکی پھلکی رومانی گفتگو میں مصروف ہوگئے۔

دن پر دن گزرتے گئے مگر عاقل کے مکان کو خریدنے کا خواہش مند سلطان لوٹ کر نہ آیا۔ اس دوران میں عاقل نہایت پابندی سے اصغری کے گھر آتا جاتا رہا۔ حسنہ کے ساتھ اس کی محبت کی پینگیں بڑھتی رہیں۔ اصغری نے اسے بھرپور تاثر دے رکھا تھا کہ اس نے عاقل کو واقعی اپنی ''فرزندی'' میں لے لیا تھا۔ اب تو عاقل نے ناشتہ اور رات کا کھانا بھی اصغری کے گھر ہی میں کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ صبح سویرے اپنے گھر سے نکلتا، مسجد میں نماز ادا کرنے کے بعد وہ اصغری کے گھر آجاتا۔ ناشتہ کرتا اور فیکٹری روانہ ہو جاتا۔ فیکٹری سے واپسی پر وہ سیدھا اصغری کے گھر پہنچتا۔ رات کا کھانا تناول فرماتا۔ حسنہ اور اصغری سے تھوڑی گپ شپ کرتا اور رات گئے اپنے گھر پہنچ کر سو جاتا۔ اپنے گھر کو وہ ان دنوں ایک سرائے کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ شاید وہ اپنے گھر کو اس سرائے کی تصویر بنانا چاہتا تھا جس کے بارے میں شاعر نے کہا ہے۔ عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

یہ بات بالکل واضح تھی کہ اگر عاقل کا خورد و نوش اصغری کے گھر میں چل رہا تھا تو لازماً عاقل کی تنخواہ کا غالب حصہ بھی اسی گھر میں خرچ ہو رہا ہوگا۔

ایک ماہ بعد سلطان نے شکل دکھائی۔ اصغری اسے اپنے ساتھ لے کر عاقل کے پاس پہنچی۔ وہ اس وقت اپنے گھر ہی میں تھا۔

''لو عاقل میاں! تمہارا تو انتظار ختم ہوا۔'' اصغری نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''یہ اپنے سلطان بھائی واپس آگئے ہیں۔ آج تم انہیں قبضہ دے دو۔''

''قبضہ دے دوں؟'' عاقل نے چونکتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''رقم تو ابھی مجھے ملی نہیں، میں مکان کا قبضہ کس طرح دے دوں؟''

سلطان نے کہا۔ ''رقم میں ساتھ لایا ہوں، اس کی فکر نہ کرو میاں!'' پھر وہ اصغری کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ ''اصغری! ادائیگی تو میں تمہیں کروں گا۔ تم نے خود ہی کہا تھا، عاقل میاں اس معاملے میں بالکل خاموش رہیں گے۔''

اصغری نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ادائیگی مجھے کر دیا عاقل کو، ایک ہی بات ہے۔ بہرحال، بات مجھ سے چل رہی ہے تو رقم بھی مجھے ہی دو۔''

سلطان نے اپنی جیب سے بڑے بڑے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور اصغری کی جانب بڑھا دی۔ اصغری نے نہایت اطمینان سے دو مرتبہ نوٹ گنے پھر اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمایاں ہوگئے۔ اس نے سلطان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سلطان! یہ تو تیس ہزار روپے ہیں۔''

''ہاں، تیس ہزار ہی ہیں۔'' سلطان نے اطمینان سے تصدیق کر دی۔

''مگر اس مکان کا سودا تو پچپن ہزار میں ہوا تھا۔'' اصغری نے تیز آواز میں کہا۔ ''پانچ ہزار تم بیعانے کی مد میں دے چکے ہو، پچاس ہزار تمہاری طرف ہیں۔''

سلطان نے کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں نے پچاس ہزار ہی دینا ہیں لیکن فی الحال یہ تیس ہزار ہیں۔ باقی بیس ہزار میں ایک ماہ بعد دے دوں گا۔ دراصل میرے ساتھ ایک سانحہ ہو گیا ہے۔'' اپنی بات ختم کرتے ہی سلطان نے اپنے چہرے پر دنیا بھر کے دکھوں کو دعوتِ عام دے دی۔ وہ اس وقت مرقع رنج و الم دکھائی دے رہا تھا۔

سلطان کی اداکاری اتنی بھرپور اور تاثر انگیز تھی کہ عاقل کا دل پسیج گیا۔ اس نے اپنے لہجے میں ہمدردی سموتے ہوئے رقت آمیز لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیا ہو گیا سلطان بھائی؟''

سلطان نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے ایک ہفتے بعد آنے کا کہا تھا مگر آج میں ایک ماہ بعد واپس آیا ہوں۔ بس کیا بتاؤں، وہ سانحہ اتنا جاں گسل تھا کہ مجھے اپنا کچھ ہوش ہی نہیں رہا۔'' پھر وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے چھت کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''خدا سب کو برے وقت

سے محفوظ رکھا!''
''آخر تمہارے ساتھ ہوا کیا ہے سلطان بھائی؟'' اصغری نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔
وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بکھرے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ''میری معصوم بچی رابعہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ اور وہ نادیدہ آنسوؤں کو روکنے کی مصنوعی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ پورا ہفتہ ہسپتال میں رہی۔ رابعہ کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا۔ چند روز قبل اپنی ننھی رابعہ کو مٹی میں اتار کر فارغ ہوا ہوں۔ میرے پاس جو رقم موجود تھی، وہ ہسپتال والوں کو دے دی۔ اب جیب خالی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے مضبوط لہجے میں اضافہ کیا۔ ''مگر کیا ہوا جو جیب خالی ہے۔ سلطان ابھی زندہ ہے اور اس کا کاروبار سلامت ہے۔ یہ ایک ماہ کی مہلت تو میں نے احتیاطاً مانگی ہے تاکہ آپ لوگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ مجھے قوی امید ہے کہ میں ہفتہ دس دن میں بیس ہزار کا بندوبست کر کے آپ کے حوالے کر دوں گا۔'' اس وقت وہ بیک وقت دونوں سے مخاطب تھا۔
عاقل میاں عقل کے ساتھ ساتھ دل کے بھی بہت کمزور واقع ہوئے تھے۔ سلطان کی من گھڑت ''داستانِ دل خراش'' نے عاقل کے قلب و نظر پر ایسے خونخوار کھروچے مارے کہ وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ''سلطان بھائی! آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میں ایک ماہ بعد باقی رقم لے لوں گا۔ آپ کہیں بھاگے تو نہیں جا رہے۔''
اصغری نے حیرت اور بے یقینی کے ملے جلے تاثرات سے عاقل کو دیکھا۔ اسے امید نہیں تھی کہ عاقل اتنی آسانی سے ان کے جال میں قدم رکھ دے گا۔ حالات کو اپنے حق میں ہموار ہوتا دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔
''سلطان میرے بھائیوں کی طرح ہے۔ میں جانتی ہوں، اس پر آنکھ بند کر کے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ میں اسے پہلے بھی کئی مرتبہ آزما چکی ہوں۔ مصیبت تو کسی بھی وقت کسی پر آ سکتی ہے۔''
سلطان نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے میرا دل بڑھا دیا ہے۔ آپ واقعی ہمدرد اور انسان دوست لوگ ہیں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔''
اصغری نے عاقل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر کیا خیال ہے عاقل میاں! آج سلطان بھائی کو مکان کا قبضہ دے دیا جائے؟'' اس کے ساتھ ہی اصغری نے تیس ہزار روپے کی رقم بھی عاقل کی جانب بڑھا دی۔
اصغری نے یہ سوال اتنے طاقت ور انداز میں کیا تھا کہ عاقل کے پاس انکار کی گنجائش نہیں تھی۔ یا یوں سمجھ لیں کہ وہ اصغری کے سامنے دم مارنے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ وہ اٹکتے ہوئے بولا۔
''مم...... مجھے تو...... کوئی اعتراض نہیں ہے...... مگر......''
''مگر کیا؟'' سلطان نے پوچھا۔ ''کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟''

''نہیں، یہ بات نہیں سلطان بھائی!'' وہ گڑبڑا گیا۔
''پھر کیا بات ہے؟'' اصغری نے پوچھا۔
عاقل نے کمزور سے لہجے میں بتایا۔ ''وہ بات دراصل یہ ہے کہ اگر میں آج ہی قبضہ دے دوں تو پھر خود کہاں رہوں گا؟''
قارئین! عاقل میاں کی حماقت آمیز سادگی پر آپ کا خون تو ضرور کھول رہا ہو گا۔ از خود مجھے بھی یہ سن کر بہت غصہ آیا تھا۔ مگر کیا کیا جائے، دنیا میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ ممکن ہے، آپ کے آس پاس بھی کوئی عاقل میاں وجود رکھتے ہوں۔
اصولی طور پر عاقل کو یہ کہنا چاہئے تھا کہ جب باقی کے بیس ہزار ملیں گے تو وہ مکان کا قبضہ دے گا۔ لیکن اگر اس کی کھوپڑی میں اتنی عقل ہوتی تو وہ عاقل میاں کیوں ہوتا...... وہ اپنی بیوی کا میاں کیوں نہ ہوتا!
عاقل کے بیان کردہ مسئلے کا حل اصغری نے یوں پیش کیا۔ ''رہنے کی تم فکر نہ کرو۔ میرے گھر کو تم اپنا ہی گھر سمجھو۔ جب تمہیں بیٹا کہہ دیا ہے تو پھر تکلف کس بات کا۔ جب تک تم اپنے لئے کسی دوسری رہائش کا بندوبست نہیں کر لیتے، عارضی طور پر میرے گھر میں رہ سکتے ہو۔''
عاقل کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے۔ اصغری کی تجویز اسے دل و جان سے پسند آئی تھی۔ اسے حسنہ کے قریب ہونے کا موقع مل رہا تھا اور یہ موقع خود حسنہ کی ماں فراہم کر رہی تھی تو وہ کیونکر انکار کرتا۔ تاہم اس نے رضامندی ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عجیب بات بھی کہہ ڈالی۔
''اصغری! تم لوگوں کو تو میں اپنا ہی سمجھتا ہوں۔'' اس نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''مگر میرے ساتھ سامان کا مسئلہ بھی تو ہے۔''
''سامان کا کیا مسئلہ ہے عاقل میاں؟'' اصغری نے پوچھا۔
وہ بولا۔ ''میرے پاس بہت زیادہ سامان ہے۔ وہ تمہارے گھر میں کہاں آئے گا۔''
اصغری نے عاقل کے مکان کے اکلوتے کمرے کو تنقیدی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عاقل میاں! مجھے تو یہاں کام کی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ایک پلنگ اور چند برتنوں کے سوا۔'' پھر وہ پلنگ کے نیچے نگاہ دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے ان کارٹنوں میں کیا بھرا ہوا ہے؟''
پلنگ کے نیچے عام سائز کے آٹھ دس کارٹن رکھے ہوئے تھے۔ عاقل نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ان کارٹنوں میں بہت اہم کتابیں ہیں۔ یہ تو میرے ساتھ ہی جائیں گی۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں جمع کیا ہے۔ میرے لئے یہ کسی قیمتی اثاثے سے کم نہیں ہیں۔''
سلطان نے پوچھا۔ ''یہ کس قسم کی کتابیں ہیں بھائی؟''
عاقل نے بتایا۔ ''زیادہ تر فلمی رسائل ہیں اور دوسرے ڈائجسٹ وغیرہ بھی ہیں۔''
اصغری اور سلطان نے عاقل کے اس ''قیمتی اثاثے'' پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اصغری نے مصلحت

آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ میں سوزوکی والے سے بات کرلوں گی۔ تمہارا سارا سامان بحفاظت اٹھالیا جائے گا۔''

الغرض، اس روز سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے عاقل میاں اصغری کے گھر میں ''شفٹ'' ہو چکا تھا۔ سلطان کو اس نے تیس ہزار ہی میں قبضہ دے دیا تھا۔ اس حماقت کی سزا آگے چل کر اسے بھگتنا پڑی تھی۔

اصغری کے گھر میں رہتے ہوئے ایک ماہ گزر گیا۔ عاقل کی تنخواہ اب پوری کی پوری اسی گھر میں خرچ ہو رہی تھی، خاص طور پر حسنہ کی فرمائشیں پوری کرتے ہوئے۔ عاقل نے فیکٹری میں اوور ٹائم کرنا بند کر دیا تھا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت حسنہ کی معیت میں گزارنا چاہتا تھا۔ سلطان سے ملنے والے تیس ہزار روپے اس نے بطور امانت اصغری کے پاس رکھوا دیئے تھے۔

سلطان نے ایک ماہ بعد بقیہ رقم ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ایک ماہ دس دن گزر جانے کے باوجود بھی جب اس نے ادائیگی نہ کی تو ایک روز عاقل نے اصغری سے کہا۔ ''اصغری! سلطان بھائی نے تو پلٹ کر خبر ہی نہیں لی۔ میں نے تو تمہارے بھروسے پر اسے ایک ماہ کی چھوٹ دے دی تھی۔''

''غلط بات نہیں عاقل میاں۔'' اصغری نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے سلطان کو میرے ایما پر چھوٹ نہیں دی تھی بلکہ یہ تمہارا اپنا فیصلہ تھا۔ تم نے خود سلطان کو پیشکش کی تھی۔ یاد ہے، تمہارے الفاظ کیا تھے...... ''سلطان بھائی آپ زیادہ پریشان نہ ہوں۔'' تم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔ ''میں ایک ماہ بعد باقی رقم لے لوں گا۔ آپ کہیں بھاگے تو نہیں جارہے۔'' یہ کہا تھا یا نہیں تم نے؟''

''ہاں کہا تھا۔'' عاقل قدرے شرمندگی سے بولا۔ ''میں نے ہی سلطان کو ایک ماہ کی مہلت دی تھی لیکن اب تو ایک ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔''

اصغری تعاون آمیز لہجے میں بولی۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو عاقل۔ میں آج ہی اس سے بات کروں گی۔''

دوسرے روز اصغری نے عاقل کو بتایا کہ سلطان کسی ضروری کام سے چند روز کے لئے شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ جیسے ہی وہ واپس آئے گا، وہ اس سے رقم کا مطالبہ کرے گی۔

آئندہ روز موقع پا کر حسنہ نے عاقل سے کہا۔ ''ہم کب تک چوری چھپے آپس میں ملتے رہیں گے...... تم میرے بارے میں اماں سے بات کرو نا!''

''ہم چوری چھپے تو نہیں ملتے۔'' عاقل نے اپنی دانست میں بڑی دانش مندی کی بات کی تھی۔ ''اصغری کو سب معلوم ہے، ہم آپس میں بات چیت کرتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو وہ خود ہمیں گفتگو کا موقع فراہم کرتی ہے۔''

حسنہ نے اس کی عقل کا ماتم کرتے ہوئے کہا۔ ''اماں تو بس اتنا ہی جانتی ہے کہ ہم آپس میں

بات چیت کرتے ہیں۔ اسے یہ بھی تو معلوم ہونا چاہئے نا کہ ہم ایک ہونا چاہتے ہیں!'' اپنی بات ختم کرتے ہی وہ اس طرح شرمائی جیسے ہر مشرقی لڑکی اپنی شادی کے ذکر پر شرماتی ہے۔ حسنہ کی اس ادا پر عاقل کا دل لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اس نے رعشہ زدہ لہجے میں کہا۔

''تم فکر نہ کرو حسنہ! میں آج ہی اصغری سے تمہارے بارے میں فائنل بات کرتا ہوں۔''

حسنہ جو کچھ کر رہی تھی وہ اصغری کے اشاروں پر کر رہی تھی۔ اصغری ایک شاطر اور زمانہ شناس عورت تھی۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ عاقل میاں کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ کسی بھی گوری چٹی، دبلی پتلی اور کم عمر لڑکی کی خاطر وہ بڑے سے بڑے کنوئیں میں چھلانگ لگا سکتا ہے۔ جب وہ خود ہی لٹنے کو تیار بیٹھا تھا تو پھر اصغری اس نادر اور شاندار ''موقع'' سے فائدہ کیوں نہ اٹھاتی۔

ایک روز موقع دیکھ کر عاقل نے اصغری سے بات کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ چھٹی کا دن تھا اور اس وقت حسنہ پڑوس میں گئی ہوئی تھی۔ عاقل نے جیسے تیسے اصغری کے سامنے اپنے ''منشور'' کی نقاب کشائی کر دی۔ اصغری پوری توجہ سے اس کی بات سنتی رہی۔ جب عاقل کی ''گزارشات'' اختتام پذیر ہوئیں تو اصغری گہری سوچ میں ڈوب گئی۔

اس وقت عاقل کی بے چینی دیدنی تھی۔ وہ اضطراب اور اضطرار کی آخری منازل سے گزر رہا تھا۔ جب دو چار منٹ خاموشی کے عالم میں گزر گئے تو عاقل سے رہا نہ گیا۔ اس نے یقین اور بے یقینی کی درمیانی کیفیت سے معمور لہجے میں اصغری سے استفسار کیا۔

''تم خاموش کیوں ہو اصغری! کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟''

''بات تو تم نے غلط نہیں کی۔'' اصغری نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ''دیکھو عاقل! میں تمہیں اپنا بیٹا سمجھتی ہوں اسی لئے میں تمہاری بات کا برا نہیں مناؤں گی۔''

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ عاقل کی بے قراری میں حد درجہ اضافہ ہو گیا۔ چند لمحات کے بعد اصغری نے کہا۔ ''عاقل! میں تمہاری درخواست منظور کرنے پر تیار ہوں۔ مگر اس سلسلے میں میری چند شرائط ہوں گی جو تمہیں ہر حال میں پوری کرنا ہوں گی۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''میں تمہاری ہر شرط ماننے کو تیار ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے جذبات سے مغلوب لہجے میں کہا۔ ''حسنہ کی خاطر میں جان بھی دے سکتا ہوں۔''

اصغری نے دل ہی دل میں کہا، گدھے کے بچے! مجھے تمہاری جان کی نہیں بلکہ تمہارے مال کی ضرورت ہے۔ پھر وہ زبان سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں عاقل، تم حسنہ کو حاصل کرنے کے لئے کڑے سے کڑے امتحان سے بھی گزر سکتے ہو لیکن میں تمہیں کسی ایسی آزمائش میں نہیں ڈالوں گی جو تمہارے لئے ممکن نہ ہو۔ میں تو تم سے بس ایک دو ایسی باتیں منواؤں گی جو تم آسانی سے مان سکو۔ میں نے جب تمہیں بیٹا کہا ہے تو پھر کسی مصیبت میں کیسے مبتلا کر سکتی ہوں۔'' ایک لمحے کے وقف کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ ''میں جو ایک دو مطالبے تم سے کر بھی رہی ہوں تو وہ اس

لئے ہیں کہ میں حسنہ کے ارمان پورے کرنا چاہتی ہوں۔ اگر حسنہ کی خواہشات پوری ہوں گی تو اسے خوشی ملے گی۔ حسنہ خوش رہے گی تو یقیناً تمہیں بھی خوش رکھے گی۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

وہ تائیدی انداز میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں حسنہ کی خوشی اور خوشنودی کی خاطر تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ تم کچھ کہو تو۔''

اصغری نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ شادی کے بعد تم اس گھر میں نہیں رہو گے۔ تمہیں حسنہ کے ساتھ کسی دوسری جگہ پر رہنا ہوگا۔ فوری طور پر تم کسی مناسب سے محلے میں کوئی مکان کرائے کا لے لو۔ میرا تو مشورہ ہے، شادی سے پہلے ہی تم کوئی چھوٹا موٹا فلیٹ کرائے پر لے لو۔ میں چاہتی ہوں کہ حسنہ بیاہ کر یہاں سے سیدھی تمہارے فلیٹ پر پہنچے۔

اگرچہ اصغری نے ایک غیر معمولی بات کہی تھی لیکن عاقل کے لئے یہی کافی تھا کہ وہ حسنہ کی شادی اس سے کرنے پر تیار ہوگئی تھی اس لئے اس نے کسی قسم کی جرح نہیں کی۔ وہ اصغری کی تجویز کو فوری طور پر ماننے کے لئے تیار ہوگیا۔

عاقل نے جوشیلے لہجے میں کہا۔ ''میں کل ہی سے کسی موزوں محلے میں کرائے کا فلیٹ دیکھنا شروع کرتا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد میں یہاں سے اپنے فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں گا۔ مجھے خود بھی یہ بات گوارا نہیں کہ میں گھر داماد کی حیثیت سے شادی کے بعد یہاں پڑا رہوں۔ اگر تم نہ بھی کہتیں تو میں پھر بھی علیحدہ رہنے کو ہی ترجیح دیتا۔ میں تمہارا یہ مطالبہ خلوصِ نیت سے قبول کرتا ہوں۔''

حسنہ کے حصول کے جوش میں عاقل میاں کے ہوش معطل ہو کر رہ گئے تھے ورنہ عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ اصغری جیسی پوزیشن رکھنے والی عورتیں کسی داماد کو فوقیت دیتی ہیں۔ ہونے والا داماد اگر ایسا شخص ہو کہ دنیا میں اس کا کوئی عزیز رشتے دار موجود نہ ہو تو یہ سچویشن آئیڈیل ہو جاتی ہے۔ اصغری ایک بیوہ عورت تھی۔ اس کا ذریعۂ معاش ٹھوس بنیادوں پر استوار نہیں تھا۔ اسے تو پہلی فرصت میں یہ کرنا چاہئے تھا کہ یا تو عاقل کو گھر داماد رکھ لیتی یا پھر خود بھی اس کے گھر میں منتقل ہو جاتی لیکن......

یہ سب کچھ تو وہ اس صورت میں کرتی اگر اس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہ ہوتا۔ وہ تو سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کر رہی تھی۔ عاقل کو بہت خوبصورتی اور مہارت کے ساتھ وہ شیشے میں اتار رہی تھی۔

عاقل کی فرماں برداری کو دیکھتے ہوئے اصغری نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''عاقل! تم جانتے ہو، میری مالی پوزیشن زیادہ مستحکم نہیں ہے۔ میں حسنہ کی شادی بھی دھوم دھام سے کرنا چاہتی ہوں۔ میری ایک ہی بیٹی ہے اور وہ بھی بن باپ کی۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ روکھی سوکھی شادی سے کسی مایوسی یا افسردگی میں مبتلا ہو جائے۔ اپنی تو زندگی جیسے تیسے گزر ہی گئی ہے۔ حسنہ کو میں نے کبھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔ میری خواہش ہے کہ شادی کے موقع پر بھی اس کا کوئی ارمان ادھورا نہ رہے۔''

''میں تمہاری اس خواہش کو ضرور سراہوں گا۔'' عاقل نے کہا۔ ''حسنہ کی خوشی اب میری خوشی سے منسوب ہو چکی ہے۔ اس لئے میں بھی یہی چاہوں گا کہ اس کے ارمان کھل کر پورے ہوں۔''

عاقل جوشِ جذبات میں چار ہاتھ آگے نکل گیا تھا۔ اصغری نے اس کی پتلی گردن پر چھری کی دھار رکھتے ہوئے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن عاقل میاں! کھل کر ارمان پورے کرنے کے لئے بہت سے روپوں کی ضرورت ہوتی ہے جو میرے پاس نہیں ہیں۔''

عاقل نے بوجھل آواز میں کہا۔ ''تم بھی کمال کرتی ہو اصغری! میرے ہوتے ہوئے تمہیں اتنا ملول ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں ہوں نا!''

آخری جملہ عاقل نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ بے خبری میں اپنا سینہ ٹھونک رہا تھا۔ بے وقوف یہ نہیں جانتا تھا کہ اصغری ایک خاص مقصد کے تحت اس کی پیٹھ ٹھونک رہی تھی اور......آگے چل کر جانے وہ کہاں کہاں بھٹکنے والا تھا۔ وہ ایک پُر جوش مینڈھے کی طرح گردن جھکائے، سینگ سوئے بگٹٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا، وہ جس ٹارگٹ پر ہٹ کرنے جا رہا تھا وہ ایک سراب کے سوا کچھ نہیں تھا۔

عاقل کو سینہ ٹھکتے ہوئے دیکھا تو اصغری نے شاطرانہ انداز میں کہا۔ ''میں پہلے ہی تمہارے احسانوں تلے دبی بیٹھی ہوں۔ اب مزید تم سے کیا مانگوں۔''

''مجھے بیٹا بھی کہتی ہو اور غیروں والا رویہ بھی دکھاتی ہو۔'' عاقل نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ''میرا تمہارے سوا اس دنیا میں اور ہے کون۔ اب تم دونوں ہی میرا خاندان ہو۔ میری طرف سے بھی شادی کی تیاری تمہیں ہی کرنا ہوگی اصغری۔ میں کہاں شاپنگ وغیرہ کرتا پھروں گا۔ سارا بندوبست تم کرو گی اور رقم میں مہیا کروں گا۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو عاقل؟'' اصغری نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔

وہ ایک مرتبہ پھر سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں اصغری۔ تمہارے پاس میرے تیس ہزار تو رکھے ہیں۔ ان میں سے پانچ ہزار تم مجھے دے دو۔ میں جو فلیٹ کرائے پر حاصل کروں گا اس کا ایڈوانس ڈیپازٹ دینا ہوگا۔ باقی کے پچیس ہزار تم ہم دونوں کی شادی کے لئے خرچ کر سکتی ہو۔ وہ رقم تم میری طرف سے گفٹ سمجھ کر رکھ لو۔ میں یہ پیسے واپس نہیں لوں گا۔''

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ابھی تو سلطان سے بیس ہزار روپے اور بھی ملیں گے۔ اس رقم سے میں کسی شاندار عمارت میں فلیٹ بک کراؤں گا۔''

عاقل کے ''زریں خیالات'' نے اصغری کو محظوظ کر دیا۔ تاہم اس نے دلی مسرت کو چھپاتے ہوئے مردہ دلی سے کہا۔ ''اچھا نہیں لگتا عاقل! تم میرے ہونے والے داماد ہو۔ تم سے مالی مدد لینا......''

اصغری کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی عاقل نے اپنا ضعف رسیدہ ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ

دیا اور تنبیہی انداز میں بولا۔ ''اگر اب تم نے غیریت کا ایک بھی لفظ منہ سے نکالا تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔''

اس کے ساتھ ہی عاقل نے اصغری کے منہ پر سے اپنا ہاتھ ہٹا لیا۔ اصغری کسی بھی صورت میں عاقل کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے عاقل کی بات مان لی۔ اس کی رضامندی کا انداز ایسا تھا جیسے وہ عاقل کی خوشی کی خاطر یہ سب کر رہی ہو۔

بعض لوگ بڑے عیار اور شاطر ہوتے ہیں۔ وہ اس مہارت سے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں کہ ان کے عمل سے دوسروں پر احسان بھی ہو جائے۔ اصغری بھی انسانوں کے اسی قبیل سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے عاقل سے رقم بھی نکلوالی تھی اور اس پر ایک ''احسانِ عظیم'' بھی فرما دیا تھا۔

آنے والے چند روز میں عاقل میاں کارٹنوں پر مبنی اپنے ساز و سامان کے ساتھ کرائے کے ایک فلیٹ میں منتقل ہو گیا۔ اس فلیٹ کا کرایہ چھ سو روپے ماہوار تھا۔ ڈیپازٹ کی صورت میں اس نے پانچ ہزار روپے فلیٹ کے مالک کو دیئے تھے۔ باقی پچیس ہزار روپے ''اخراجاتِ شادی خانہ آبادی'' کی مد میں اصغری کی تحویل میں چلے گئے۔ عاقل نے کبھی خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا ہو گا کہ یہ خیالی شادی اس کی خانہ بربادی ثابت ہونے والی تھی۔

کرائے کے فلیٹ میں رہتے ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے کہ عاقل نے اخبار میں کسی تعمیراتی کمپنی کا اشتہار دیکھا جس میں بڑے خوب صورت الفاظ میں فلیٹ بک کروانے کی نہایت ہی عمدہ پیشکش کی گئی تھی۔ بکنگ صرف بیس ہزار روپے سے تھی اور باقی رقم ماہانہ اقساط کی صورت میں ادا کرنا تھی اور ماہانہ قسط بھی صرف چھ سو روپے تھی۔

عاقل کو اس دلفریب پیشکش میں بڑی کشش نظر آئی۔ اس کے ساتھ ہی اسے وہ بیس ہزار بھی یاد آ گئے جو اس نے سلطان سے لینا تھے۔ حسنہ سے شادی کے ہنگامہ خیز خیالات نے اسے کسی اور رخ پر سوچنے ہی نہیں دیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آج ہی اصغری سے کہے گا کہ وہ جلد از جلد سلطان سے رقم نکلوائے۔ یہ سوچ کر وہ بہت خوش ہوا کہ اب اسے داؤ پیچ والی باتیں کرنا آ گئی تھیں۔ اس نے منصوبہ بنایا کہ وہ اصغری سے کچھ اس انداز میں بات کرے گا...... دیکھو اصغری! میں جو فلیٹ بک کروانا چاہتا ہوں وہ بہت اچھے علاقے میں ہے۔ تمہاری بیٹی کی رہائش کراچی کے اچھے علاقے میں ہو گی تو اس سے تمہاری شان میں اضافہ ہو گا۔ اب تمہیں چاہئے کہ پہلی فرصت میں سلطان سے رقم نکلواؤ۔ اس میں تمہارا اور تمہاری بیٹی ہی کا فائدہ ہے۔

اپنی اس سوچ پر وہ بہت مسرور تھا۔ اپنی دانست میں وہ ان جملوں کو داؤ پیچ والی باتوں سے تعبیر کر رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اصغری کے پاس پہنچ کر اسے جس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا اس سے اس کے چاروں طبق گل ہو جائیں گے۔

وہ کشاں کشاں اصغری کے گھر پہنچ گیا اور اسے اپنے ارادے سے آگاہ کیا۔ وہ عاقل کی بات ختم

ہونے سے پہلے ہی تڑخ کر بولی۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟''

''میں بکواس کر رہا ہوں؟'' عاقل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔

اصغری طیش کے عالم میں بولی۔ ''یہ بکواس نہیں تو اور کیا ہے۔'' وہ عاقل کو دروازے پر کھڑے کھڑے ہی کھری کھری سنانے لگی۔ آج اس نے عاقل کو گھر کے اندر آنے کو بھی نہیں کہا تھا۔ ''پتہ نہیں تم کس جہان کی باتیں کر رہے ہو؟''

''اصغری! ہم میں یہ طے ہوا تھا کہ......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے غصے میں چیخی۔ ''ہم میں نہ یہ طے ہوا تھا اور نہ ہی وہ طے ہوا تھا۔ تم نے اپنا مکان پینتیس ہزار میں سلطان کے ہاتھ بیچا تھا۔ میں نے اپنے کمیشن کے پانچ ہزار رکھ لئے، باقی تیس ہزار تمہارے حوالے کر دیئے۔ اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' وہ ہاتھ نچا کر ایک خاص انداز میں بولی۔ ''تمہاری مجبوری دیکھتے ہوئے چند دن گھر میں ٹھہرا لیا تو تم نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ خوانخواہ میری معصوم بچی کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ بھول گئے، کیا تم نے مجھ سے درخواست نہیں کی تھی کہ جب تک تمہیں کرائے کا فلیٹ نہیں مل جاتا، میں تمہیں اپنے پاس ٹھہرا لوں۔''

عاقل کو اصغری کے فریب پر غصہ آنے لگا۔ اس نے برہمی سے کہا۔ ''اصغری! تم اتنی جلدی بدل جاؤ گی یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔''

''میں کیا بدلی ہوں......'' وہ منہ ٹیڑھا کرتے ہوئے بولی۔ ''تم ہی الٹی سیدھی ہانکنے آ گئے ہو۔ اب جاؤ یہاں سے، ورنہ محلے والوں کو جمع کر کے سو جوتے لگواؤں گی۔''

عاقل کو پہلی مرتبہ اپنی توہین کا احساس ہوا تاہم اس نے قدرے معتدل لہجے میں کہا۔ ''تم جھوٹ کا سہارا لے کر خود کو سچا ثابت نہیں کر سکتی ہو۔ میں نے اپنا مکان پچپن ہزار روپے میں فروخت کیا تھا۔ سلطان نے صرف پینتیس ہزار دیئے ہیں جن میں سے مجھے صرف پانچ ہزار ہی ملے ہیں جو میں نے فلیٹ کے ڈیپازٹ میں دیئے تھے۔ باقی تیس ہزار تم نے ہڑپ کر لئے۔ پانچ ہزار اپنے کمیشن کے طور پر اور باقی پچیس ہزار حسنہ سے میری شادی کا ڈرامہ رچا کر۔''

''اگر تم نے اپنی بے سروپا باتوں کو بریک نہ لگائے تو میں تمہارا وہ حشر کروں گی، جو بھی دیکھے گا تھو تھو کرے گا'' اصغری آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولی۔ ''یہ منہ اور مسور کی دال۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک فحش حرکت کی اور طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تم تیس گز کی اس کھولی کو پچپن ہزار میں بیچو گے؟ کیا کوئی خواب دیکھ لیا ہے بڈھے؟'' وہ جو کل تک اسے بیٹا کہتی آئی تھی، اب بڈھا کھوسٹ کہہ رہی تھی۔ یہ طوطا چشمی کی انتہا تھی۔ لیکن عاقل جیسے لوگوں کو کبھی عقل نہیں آتی۔ وہ سمجھتے ہیں بس نام عاقل ہونا ہی کافی ہے۔ لیکن یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔ یہاں سب کچھ ممکن ہے۔ اصغری نے مضحکہ خیز انداز میں عاقل کو دیکھا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری اس کھٹارا جھونپڑی کی قیمت کسی بھی طرح پچیس ہزار سے زائد نہیں ہے۔ میں نے اسے پینتیس ہزار میں بکوا

دیا۔ تمہیں تو میرا احسان مند ہونا چاہئے تھا، کجا یہ کہ تم الٹا مجھ پر الزام تراشی کر رہے ہو۔''

عاقل کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس کے ساتھ ایک منظم فراڈ ہو گیا تھا۔ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''اصغری! تم یہ نہ سمجھنا کہ تمہاری اس دھاندلی پر میں خاموش ہو کر بیٹھ جاؤں گا۔ تمہیں خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔''

''تم کیا کرلو گے میرا؟'' اصغری نے سخت لہجے میں پوچھا۔

عاقل بولا۔ ''میں یہاں سے سیدھا پولیس کے پاس جاؤں گا اور انہیں تمہاری اور سلطان کی جعل سازی کے بارے میں تفصیلاً بتاؤں گا۔ تم دونوں کی ملی بھگت سے میرے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ میں اپنا ایک پیسہ بھی تمہیں ہضم نہیں کرنے دوں گا۔''

''جاؤ جاؤ......'' وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''تم تھانے میں جاؤ یا عدالت میں، مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تم اپنا پورا زور لگا کر دیکھ لو۔''

عاقل میں سب سے زیادہ کمی زور ہی کی تھی اور اصغری اس کی اسی کمزوری سے کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

عاقل اپنے گھر پہنچا تو پوری طرح جھلاہٹ کے گھیرے میں آچکا تھا۔ اس نے اس معاملے پر کافی سوچ بچار کیا پھر یہ فیصلہ کیا کہ وہ تھانے میں رپورٹ درج کروانے سے پہلے ایک مرتبہ سلطان سے ضرور ملے گا۔

اسی سہ پہر وہ سلطان کے پاس پہنچ گیا، یعنی اپنے فروخت شدہ مکان پر۔ سلطان نے بڑی بے دلی سے اس کی بپتا سنی اور بے مروتی سے بولا۔

''میاں! اصغری اور حسنہ سے تمہارے کیا معاملات ہیں، یہ تم ہی جانو۔ میں نے تو مکان کی پوری رقم اصغری کے سامنے ادا کر دی تھی۔ وہ اس بات کی گواہ ہے کہ میں نے تم سے یہ مکان صرف پینتیس ہزار میں خریدا تھا۔''

عاقل تھوڑی دیر تک سلطان سے تکرار کرتا رہا۔ نتیجے میں سلطان نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

سلطان کے اس رویے نے عاقل کو چراغ پا کر دیا۔ وہ وہاں سے سیدھا تھانے پہنچا اور ڈیوٹی پر مامور افسر کو اپنی داستانِ غم بالفاظ دیگر داستانِ حماقت بڑے دل گیر انداز میں سنائی۔

اس کی رپورٹ پر پولیس نے جو کارروائی کی، اس کا ذکر اس کہانی کی ابتدا میں کیا جا چکا ہے۔ تھانے میں اصغری نے سلطان کے حق میں گواہی دے کر عاقل کو جھوٹا کر دیا۔ عاقل کا ایک کمزور پہلو یہ بھی تھا کہ اس کا جھونپڑی نما مکان واقعی پچیس تیس ہزار سے زیادہ کا نہیں تھا۔ کوئی بھی ذی شعور شخص یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ان تھرائزڈ جھونپڑی سلطان نے پچپن ہزار روپے میں خریدی ہو گی۔

پولیس کی طرف سے مایوس ہو کر عاقل نے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس موقع پر

میری سیکرٹری اور عاقل کی کزن نازنین کو کسی طرح اس کے حالات کا علم ہوا اور اس نے ازراہِ ہمدردی مجھ سے تذکرہ کر دیا۔ نہ صرف مجھ سے ذکر کیا بلکہ وہ میری فیس بھی ادا کرنے پر تیار تھی۔

☼☆☼

آئندہ روز میں دفتر پہنچا تو نازنین نے مجھ سے پوچھا۔ ''سر! آپ نے عاقل کے کیس کی اسٹڈی کرلی؟''

''بھئی تم نے ٹھیک ہی کہا تھا'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تمہارا کزن بذاتِ خود ایک کیس ہے۔ چلتا پھرتا کیس۔ وہ جہاں بھی جائے گا، اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی مسئلہ ضرور لگا رہے گا۔ اس کو دیکھتے ہوئے تو مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی ایک انگلش اسٹوری یاد آ گئی ہے۔ غالباً اس شارٹ اسٹوری کا نام تھا۔ ''دی مین ہو واز این ہاسپٹل'' اس کہانی میں بھی عاقل سے ملتا جلتا ایک احمق موجود تھا جس کا خیال تھا، دنیا کی ہر بیماری کی علامات اس میں موجود ہیں۔ اسی سنک میں وہ مسخرے پن کی حرکتیں کرتا رہتا تھا۔''

نازنین نے اصرار کیا کہ میں اسے وہ اسٹوری تفصیلاً سناؤں۔ میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی۔ اس نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''پھر آپ نے عاقل کی مدد کرنے کے بارے میں کیا سوچا ہے بیگ صاحب؟''

''تمہارے عاقل کزن نے اپنے پاؤں پر اتنی کلہاڑیاں ماری ہیں کہ وہ لہولہان ہو چکے ہیں۔'' میں نے افسوسناک انداز میں کہا۔ ''اب ان کی سرجری تو ممکن نہیں، ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں پاؤں کاٹ کر بیساکھی اسے تھما دی جائے۔''

وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''سر! آپ تو بہت خطرناک باتیں کر رہے ہیں۔''

''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں نازنین!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''عاقل میاں نے اپنا سارا مایا اتنے آڑے ٹیڑھے برتن میں انڈیل دیا ہے کہ انگلی ٹیڑھی کئے بنا اس میں سے کچھ بھی نکالا نہیں جا سکتا۔ اس نے رقم اور جائیداد کا جو بھی لین دین اور خرید و فروخت کی ہے اس کا کوئی ثبوت اس کے پاس نہیں۔ ان واقعات سے بھی بس وہی دونوں واقف ہیں یعنی اصغری اور سلطان۔ یہ دونوں افراد اس کی مخالفت میں مضبوط محاذ بنائے کھڑے ہیں۔ اگر کوئی اور شخص اس ڈیل کا گواہ یا عینی گواہ ہوتا تو پھر کسی طور کیس کو عدالت میں لگایا جا سکتا تھا۔ حالات و واقعات اور شواہد سب کچھ عاقل کے خلاف جاتے ہیں۔ تیس گز کی ان تھرائزڈ جھگی کسی بھی صورت پچپن ہزار کی نہیں ہو سکتی۔ عاقل نے سلطان کے ہاتھ جو مکان فروخت کیا ہے اس کی مارکیٹ ویلیو پچیس ہزار سے زیادہ نہیں ہو سکتی (یہ آج سے کوئی تیس بتیس سال پہلے کا واقعہ ہے۔ آج کل اس نوعیت کا ان تھرائزڈ مکان لگ بھگ اسی ہزار روپے میں مل جاتا ہے) اس کے علاوہ عاقل کے پاس رقم کی ادائیگی یا وصولی کی بھی کوئی کچی یا پکی رسید وغیرہ نہیں ہے۔ اب عدالت عاقل کے بیان پر تو یقین نہیں کر سکتی۔ وہاں تو

ہر بات کا ثبوت مانگا جاتا ہے۔“

نازنین تائیدی لہجے میں بولی۔ ”آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں مگر اس صورت میں تو ہم عاقل کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔“

”بظاہر تو یہی نظر آ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”مگر ہمارا ملک دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی بھی کام ناممکن نہیں۔ اگر عاقل میاں ذرا سی بہادری دکھائیں تو شاید بات بن جائے۔ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں اس کو عملی جامہ پہنانے کے لئے عاقل کو کلیدی کردار ادا کرنا ہوگا اور اس طرح عدالت میں جائے بغیر اس کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔“

”ایسی کوئی صورت ہے تو مجھے بتائیں بیگ صاحب!“ نازنین پوری دل جمعی سے عاقل کی مدد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ”آپ کے ذہن میں کیا آئیڈیا آیا ہے؟“

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”عاقل کو جس انداز میں بے وقوف بنایا گیا ہے وہ بدمعاشی کی ایک شکل ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ نازنین نے اثبات میں سر ہلایا۔

”میں نے کہا۔ ”جس طرح لوہا لوہے کو کاٹتا ہے، بالکل اسی طرح بدمعاشی کا مقابلہ بدمعاشی ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ عاقل میاں کو حد سے بڑھی ہوئی شرافت کا لبادہ اتار کر عملی میدان میں کچھ سرگرمی دکھانا ہوگی۔ مجھے امید ہے، انشاء اللہ اس طرح کام بن جائے گا۔“

”آپ کا مطلب ہے عاقل کو بدمعاشی کرنا ہوگی؟“ نازنین نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”بدمعاشی کسی بھی شریف آدمی کے بس کا کام نہیں ہے۔ اور عاقل تو کچھ زیادہ ہی شریف ہے۔ میرے ذہن میں جو آئیڈیا ہے اس کے مطابق عاقل کو صرف میدان میں ڈٹ کر کھڑے رہنا ہوگا۔ بدمعاشی کوئی اور کرے گا۔“

”میں سمجھی نہیں بیگ صاحب؟“

”بہت آسان سی بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”جس طرح دھوکا دہی سے عاقل کے مکان کو ”خریدا“ گیا ہے اس سے سلطان اور اصغری کی ذہنیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مجھے صد فیصد یقین ہے کہ یہ دونوں اندر سے ملے ہوئے ہیں اور عین ممکن ہے، اصغری نے بعد میں تیس ہزار کی وہ رقم سلطان کو واپس لوٹا دی ہو۔ عاقل کے حصے میں صرف پانچ ہزار روپے آئے۔ گویا انہوں نے محض پانچ ہزار روپے میں اس احمق کا مکان ہتھیا لیا اور وہ بھی اس طرح کہ کوئی ان کی ”کارروائی“ کو غلط یا مجرمانہ ثابت نہیں کر سکتا۔“ ایک لمحے کو میں سانس لینے کو رکا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”تو نازنین صاحبہ! اس نوعیت کے بدمعاشوں سے اپنی رقم نکلوانے کے لئے ہلکی پھلکی بدمعاشی ضروری ہے...... اور کرائے کے بدمعاش ہمارے ہاں بہت آسانی سے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ اگر عاقل میاں یہ انتظام نہیں کر سکتا تو میں اس سلسلے میں اس کی مدد کر سکتا ہوں۔ اس قسم

کی ”اداکاری“ کرنے والے دو چار کریم شحیم افراد کو میں جانتا ہوں۔“

نازنین سوچ میں پڑ گئی پھر بولی۔ ”یہ تو بہت خطرناک کام ہوگا۔“

”ہرگز نہیں۔“ میں نے تیقن سے کہا۔ ”یہ محض ایک خطرناک کام کی اداکاری ہوگی جس میں کسی کو بھی جانی یا مالی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہوگا۔ اس کارروائی کا مقصد محض اصغری اور سلطان کو یہ باور کرانا ہوگا کہ عاقل اتنا بھی بے آسرا اور بے یار و مددگار نہیں ہے۔ ان دونوں نے اگر اس کی رقم واپس نہ کی تو وہ کوئی انتہائی قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔“

نازنین نے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ کا تجزیہ بتاتا ہے کہ کورٹ کے حوالے سے عاقل کی پوزیشن خاصی کمزور ہے۔ یعنی اس سلسلے میں اس کی کوئی واضح مدد نہیں ہو سکے گی۔“ ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اضافہ کیا۔ ”کیا اس صورت میں پولیس کی مدد حاصل کی جا سکتی ہے؟“

”تمہارے بیان کے مطابق عاقل ایک مرتبہ پولیس کے پاس جا چکا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں جو صورت حال پیش آئی اس میں عاقل جھوٹا اور اصغری و سلطان سچے ثابت ہوئے تھے۔ اس کے باوجود بھی تم......“

”سر! قطع کلامی کی معافی چاہتی ہوں۔“ نازنین نے میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ ”پہلے عاقل اکیلا پولیس کے پاس گیا تھا۔ نہ تو اس کا موقف جاندار تھا اور نہ ہی دلائل جبکہ اس کے مقابلے میں وہ دونوں انتہائی عیار اور مکار افراد تھے۔ میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ اگر آپ اپنے طور پر تھانے والوں سے بات کریں اور انہیں عاقل کی درست پوزیشن کے بارے میں بتائیں تو ممکن ہے وہ اصغری اور سلطان پر سختی کر کے کوئی کام کی بات معلوم کر لیں۔“

”ایسا کیا جا سکتا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”تم عاقل کو ایک مرتبہ پھر میرے پاس لاؤ۔ ہم اس معاملے میں اس سے کھل کر بات کریں گے۔“ ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے کہا۔ ”اس سے مصنوعی غنڈہ گردی کی بات بھی کر لیتے ہیں اور پولیس پر دباؤ ڈالنے کے بارے میں بھی صلاح کر لیتے ہیں۔ ایک بات یاد رکھو، ہر دو صورت میں عاقل کو مرکزی کردار ادا کرنا ہوگا۔ ”مدعی سست گواہ چست“ سے بات نہیں بنے گی۔“

نازنین نے کہا۔ ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں کل ہی عاقل کو آپ کے پاس لاتی ہوں۔“

اس کے بعد ہمارے درمیان عاقل اور حسنہ و اصغری کے حوالے سے کافی دیر گفتگو ہوتی رہی۔

نازنین نے ایک اہم پوائنٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس سارے لغوے میں ایک بہت ہی مزے کی بات ہے اور وہ یہ کہ اصغری اور سلطان نے مل کر جو ڈرامہ رچایا ہے اس میں انہوں نے حقیقت کا رنگ بڑی خوبی سے بھرا ہے۔“

”تمہارا اشارہ کس طرف ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”مکان کی قیمت اور ادائیگی کی طرف۔“

"ذرا وضاحت کرو۔"

وہ وضاحتی انداز میں بتانے لگی۔ "دیکھیں بیگ صاحب! عاقل کے مطابق اس نے اپنا مکان پچپن ہزار روپے میں بیچا تھا جبکہ اصغری اور سلطان کا موقف یہ ہے کہ اس مکان کا سودا پینتیس ہزار میں ہوا تھا۔ پانچ ہزار اصغری کا کمیشن اور تیس ہزار عاقل کے۔ یہ الگ بات ہے کہ اصغری نے حسنہ کے حسن کا جال پھینک کر عاقل سے رقم نکلوالی اور اسے صرف پانچ ہزار پر ٹرخا دیا گیا۔ اب اگر وہ دونوں واقعی آپس میں ملے ہوئے ہیں تو سلطان کی رقم واپس اس کے پاس چلی گئی ہوگی۔ ممکن ہے اس پارٹنر شپ میں سلطان نے اصغری کو بھی بھاری حصہ دیا ہو۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں اس نکتے کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ اس طرح بھرا گیا کہ پہلے پانچ ہزار اور ازاں بعد تیس ہزار روپے سلطان نے باقاعدہ ادا کئے جو کل ملا کر پینتیس ہزار بنتے ہیں۔ گویا اس نے عاقل کا مکان بہت اچھے داموں خرید لیا۔ جو بھی اس بیان اور ڈیل کے بارے میں سنے گا وہ سلطان اور اصغری کو سچا اور عاقل کو جھوٹا سمجھے گا۔"

"جیسا کہ پولیس والوں نے سمجھا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور یہ سب عاقل کی حماقت کے باعث پیش آیا ہے۔"

نازنین نے کہا۔ "بیگ صاحب! میری تو یہ دلی دعا ہے کہ عاقل کا کچھ بھلا ہو جائے۔ اگرچہ حالات مکمل طور پر اس کی مخالفت میں جا رہے ہیں۔"

"میں عاقل کے لئے تمہارے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "نازنین! تم واقعی اس کی کزن ہونے کا ثبوت دے رہی ہو۔"

وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوگئی۔

✲✫✲

عاقل میاں میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

نازنین وعدے کے مطابق اسے بلا لائی تھی۔ اس وقت وہ بھی میرے چیمبر میں موجود تھی۔ ہم تینوں ہی عاقل کے گمبھیر مسئلے پر غور و فکر کر رہے تھے۔ میں نے عاقل کے سامنے مصنوعی غنڈہ گردی کا منصوبہ رکھا اور اس کی رائے جاننا چاہی۔

وہ میرے استفسار پر سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس وقت خوف کے باعث اس کی آنکھیں کافی سکڑ گئی تھیں۔ عام حالت میں بھی وہ خاصا ڈرا سہما نظر آتا تھا۔ کاش میں ان لمحات کا عینی شاہد ہوتا جب وہ حسنہ سے رومانی مکالمات بولتا ہوگا! اس بات کی تصدیق تو ہوگئی تھی کہ وہ حسنہ کے معاملے میں سنجیدہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں کے مصنوعی رومان (کم از کم حسنہ کی جانب سے) کی منظر نگاری قابل دید شے رہی ہوگی۔

میں منتظر نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے منہ اور گلے کے اعضا کو کچھ اس قسم کی

حرکات سے نوازا جیسے وہ انتہائی خشک اور کانٹے دار چیز کو نگلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ امداد طلب نظر سے نازنین کو تکنے لگا۔

نازنین نے کہا۔ "عاقل! وکیل صاحب تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

نازنین کی بات سن کر وہ میری جانب دیکھنے لگا۔

میں نے اپنے آئیڈیئے کو دوبارہ آسان الفاظ میں اس کے سامنے بیان کیا تو وہ ایک کنگ سائز جھرجھری لینے کے بعد ممیایا۔ "نہیں نہیں، یہ بہت خطرناک ہوگا۔"

"کچھ خطرناک نہیں ہوگا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "سب کچھ جھوٹ موٹ ہوگا جس طرح ٹی وی کے ڈراموں میں ہوتا ہے۔"

وہ شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔"

"تمہیں کچھ نہیں کرنا ہوگا بھلے مانس!" نازنین نے اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم بس ان لوگوں کے ساتھ رہنا۔"

وہ مسلسل انکار میں گردن ہلاتا رہا۔ "نہیں، یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔ میں غنڈوں اور بدمعاشوں کی لیڈری نہیں کر سکتا۔"

وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ حقیقت تو بہت دور کی بات ہے، وہ ایسے کسی مصنوعی منظر میں بھی اداکاری کرنے کا دل گردہ نہیں رکھتا تھا۔ اب وہ پورے وجود سے باقاعدہ کپکپا رہا تھا۔

نازنین نے قدرے ناگواری سے کہا۔ "اگر تم میں اتنی ہمت نہیں ہے تو پھر کان لپیٹ کر گھر بیٹھو۔ ڈوبے ہوئے پیسے بازیاب کرانا جان جوکھوں کا کام ہے۔ تم اسے گولا گنڈا کھانا نہ سمجھو۔"

"کیا وکیل صاحب میرا مقدمہ نہیں لڑ سکتے؟" وہ مایوسی سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم تو کہہ رہی تھیں کہ یہ بہت چوٹی کے وکیل ہیں۔ مجھے عدالت سے انصاف دلوا دیں گے۔"

میں نے کہا۔ "عدالت سے انصاف حاصل کرنے کے لئے بھی کچھ قاعدے قوانین ہیں عاقل میاں! عدالت کسی کی بات کا یقین نہیں کرتی۔ وہاں اپنے موقف کو ثابت کرنا پڑتا ہے اور کسی بھی چیز کو ثابت کرنے کے لئے واقعاتی شہادتیں اور دیگر ثبوتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہارے پاس کیا ہے؟"

وہ میرے سوال پر نازنین کو دیکھنے لگا۔ وہ بولی۔ "سوائے ایک دردناک اور غم انگیز کہانی کے کہ اصغری اور سلطان نے مل کر یا فرداً فرداً تمہیں الو بنایا ہے۔ ایک طرف تمہارا مکان ہتھیا لیا گیا ہے اور دوسری جانب حسنہ کا چارا ڈال کر تمہاری رقم ہضم کر لی گئی ہے۔ لوگ تمہاری اس افسوس ناک بپتا کو سن کر ہمدردی تو جتا سکتے ہیں مگر کوئی بھی تمہاری قرار واقعی مدد نہیں کر سکتا۔"

وہ سراسیمہ لہجے میں بولا۔ "مگر وکیل صاحب جو طریقہ بتا رہے ہیں اس میں بھی تو بہت سے خطرات پوشیدہ ہیں۔"

"مثلاً کس قسم کے خطرات؟" میں نے پوچھا۔

''پہلی بات تو یہی ہے کہ غنڈوں اور بدمعاشوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔'' وہ اپنے تئیں فلسفہ بگھارتے ہوئے بولا۔ ''کیا پتہ وہ سلطان اور اصغری سے مل جائیں اور مجھ سے دشمنی پر اتر آئیں۔''

نازنین نے سر تھام لیا پھر بولی۔ ''بھئی وہ اصل بدمعاش نہیں کریں گے۔ وہ تمہارے خریدے ہوئے لوگ ہوں گے، تمہارے ہی اشاروں پر ناچیں گے۔''

وہ ایک مرتبہ پھر نہ اور نہیں نہیں کی گردان کرنے لگا۔

میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ اور کیا خطرات ہو سکتے ہیں؟''

''اس کے علاوہ......'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ میں جس بات سے بہت زیادہ ڈر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ابھی تک تو سلطان مجھ سے سیدھے منہ بات بھی کر رہا ہے۔ اگر میں نے مصنوعی غنڈوں سے اسے ڈرایا دھمکایا تو عین ممکن ہے وہ مجھ سے خدا واسطے کا بیر شروع کر دے۔ وہ بہت کمینہ اور سفاک شخص ہے۔ وہ میرا جینا محال کر دے گا۔''

میں نے نازنین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نازنین! میں بلی کا آپریشن کر کے اسے ببر شیر میں تو تبدیل نہیں کر سکتا۔''

بلی کا لفظ میں نے احتیاطاً استعمال کیا تھا تا کہ عاقل کی دل آزاری نہ ہو۔ ورنہ تو اس مثال کے لئے ''گیدڑ'' کا لفظ نہایت ہی مناسب اور موزوں تھا۔

نازنین نے بھی مایوسی سے گردن ہلائی اور کہا۔ ''بیگ صاحب! یہ آئیڈیا تو فلاپ ہو گیا۔''

''یہ کیا بات کر دی تم نے۔'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''کسی آئیڈیئے کے فلاپ یا ہٹ ہونے کا فیصلہ تو آئیڈیئے کی تکمیل کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ ابھی تو اس ڈرامے کا ایک سین بھی فلمایا نہیں گیا تھا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ کہانی ''سیٹ'' پر گئی ہی نہیں تھی۔''

''کہانی سیٹ پر جانے سے پہلے ہی ''اَپ سیٹ'' ہو گئی۔'' نازنین نے کہا۔ ''بس یوں سمجھ لیں کہ آغاز سے پہلے انجام دیکھ لیا۔ دی اینڈ!''

''نامعلوم آغاز سے قبل حسرت ناک انجام۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

نازنین بولی۔ ''میں نے عاقل کی مدد کا بیڑا اٹھایا ہے تو اتنی آسانی سے شکست تسلیم نہیں کروں گی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے براہِ راست مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! اب تو دوسرا طریقہ آزمانا ہوگا۔''

''یعنی پولیس کا تعاون؟''

''ٹرائی کرنے میں کیا حرج ہے؟''

''کوئی حرج نہیں۔'' میں نے ریسیور کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ٹرائی کر لیتے ہیں۔''

میری میز پر تین ٹیلی فون سیٹ رکھے ہوئے تھے جن میں سے ایک انٹرکام کے طور پر کام کرتا

تھا۔ باقی دونوں سیٹ میرے پرسنل تھے۔ میں نے پرسنل نمبر سے عاقل کے علاقے کے تھانے میں فون کیا اور یہ جاننے کی کوشش کی کہ آج کل وہاں کا انچارج کون تھا۔

دوسری جانب کا جواب سن کر مجھے تقویت محسوس ہوئی۔ اس تھانے کا ایس ایچ او میرا جاننے والا تھا اور گزشتہ ماہ ہی اس تھانے میں متعین ہوا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ عاقل جس تھانیدار کے پاس فراڈ کی رپورٹ درج کروانے گیا تھا اس کا تبادلہ کہیں اور ہو گیا تھا۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی اور عاقل کے کیس میں یہ پہلی خوشگوار تبدیلی واقع ہوئی تھی۔

تھانوں میں دن کے وقت عموماً تھانہ انچارج پائے نہیں جاتے۔ میں نے عاقل سے کہا کہ وہ آٹھ بجے رات کے بعد دوبارہ میرے پاس آ جائے۔ میں اسے لے کر تھانہ انچارج سے ملوں گا۔ ممکن ہے، اس کے حق میں کوئی بہتری ہو جائے۔

عاقل مجھے سلام کر کے رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد نازنین نے کہا۔ ''بیگ صاحب! میں تو آپ کے ساتھ نہیں جا سکوں گی۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی۔ ''تھانے میں جانے کتنی دیر لگ جائے۔ تمہیں تو سیدھا اپنے گھر جانا چاہئے۔ کل تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کیا گزری ہے عاقل پر بیاکل ہونے تک۔''

نازنین نے زیرلب مسکرانے پر اکتفا کیا۔

میں اپنے موکلوں کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ جس وقت عاقل میرے پاس آیا تھا جب تک میرے دفتر میں کلائنٹس کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی مگر اب انتظار گاہ میں اچھا خاصا ہجوم ہو رہا تھا۔

نازنین نمبروار موکلوں کو میرے پاس بھیجنے لگی۔

رات کو عاقل حسب وعدہ دوبارہ میرے پاس آیا اور میں اسے اپنے ساتھ لے کر متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ اس وقت تک تھانہ انچارج توفیق غوری بھی تھانے پہنچ چکا تھا۔ اس نے میرا پُرتپاک استقبال کیا۔

ہمارے درمیان کچھ دیر تک باہمی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی، پھر اس نے پوچھا۔ ''آج اچانک کیسے آمد ہو گئی بیگ صاحب؟''

میں نے اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے اسے عاقل کے بارے میں بتایا۔

اس موقع پر عاقل نے اپنی داستانِ طویل و دراز کو شروع کرنا چاہا تو میں نے اسے فوراً روک دیا۔ وہ اللہ کا بندہ اگر ایک مرتبہ شروع ہو جاتا تو ممکن تھا صبح سے پہلے اختتام تک نہ پہنچتا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''عاقل! تمہارا مسئلہ میں تھانے دار صاحب کو بتاتا ہوں۔ ہاں اگر تم سمجھو کہ میں کوئی بھول کر رہا ہوں تو تم یاد دلا دینا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا مگر اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود اپنی زبان سے پُر درد واقعات کی منظر کشی کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے اسے اس لئے بھی اپنی بپتا سنانے سے روکا تھا کہ اس کا الجھا ہوا اور مشکوک قسم کا طرزِ بیان ممکن تھا توفیق غوری کو بھی کسی اُلجھن میں مبتلا کر دیتا اور وہ کوئی نکتہ سمجھنے میں غلطی کر بیٹھتا۔

میں نے نہایت ہی جامع اور مختصر الفاظ میں توفیق غوری کو عاقل کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بارے میں آگاہی دی۔

پوری بات سننے اور حالات و واقعات کی نزاکت کو جاننے کے بعد وہ ترحم نظر سے عاقل کو دیکھنے لگا۔ اس کے تکنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ کسی دنیاوی آدمی کو نہیں بلکہ کسی دوسرے سیارے کی مخلوق کو ملاحظہ کر رہا ہو۔ بالآخر اس نے میرے اندازے کی ترجمانی بھی کر دی۔

عاقل کا بغور جائزہ لینے کے بعد اس نے پوچھا۔ ''کیا تم اسی دنیا کے باشندے ہو؟''

عاقل نے خفت آمیز انداز میں گردن ہلا دی۔

تھانیدار نے پوچھا۔ ''تمہاری عمر کیا ہے؟''

''یہی کوئی پینتالیس چھیالیس سال۔'' عاقل نے جواب دیا۔

یہ عاقل کا پالیسی بیان تھا۔ وہ سب کو دس سال گھٹا کر عمر بتایا کرتا تھا۔ تھانیدار نے کہا۔ ''مجھے تو چھیالیس سے کافی زیادہ لگ رہی ہے۔''

عاقل آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔

تھانے دار نے پوچھا۔ ''قیامِ پاکستان کے وقت تم کتنے سال کے تھے؟''

عاقل کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ جان چھڑانے کے لئے الٹے سیدھے جواب دینے لگا۔ تھانے دار کے ماہرانہ سوالات سے یہ بات سامنے آ گئی کہ عاقل کم از کم پچپن سال کا تو تھا ہی۔ تھانیدار کا اندازہ بڑی حد تک درست تھا۔ اس نے عاقل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''اتنی عمر تم نے کہاں گزاری ہے میاں؟''

عاقل جز بز ہو کر مددطلب نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے تھانیدار کو مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''غوری صاحب! یہ بے چارہ تو پہلے ہی بہت پریشان ہے۔ آپ اس قسم کے چبھتے ہوئے سوال کر کے اسے مزید ہراساں نہ کریں۔ اس کی مدد کے سلسلے میں اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو بتائیں۔''

''مدد تو ہم اس کی ضرور کریں گے وکیل صاحب!'' وہ چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ''اس غریب کے ساتھ واقعی بڑی ناانصافی ہوئی ہے۔'' پھر وہ براہِ راست مجھ پر چوٹ کرتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ کے میدان (عدالت) میں اس قسم کے مظلوموں کی دادرسی نہیں کی جاتی؟''

ہمارے درمیان اکثر اس قسم کا دوستانہ مذاق چلتا رہتا تھا اور ہم ایک دوسرے پر ہلکی پھلکی چوٹیں بھی کرتے رہتے تھے۔ عام طور پر وکیلوں اور پولیس والوں کی آپس میں زیادہ نہیں بنتی۔ خاص طور پر صفائی کے وکیلوں اور پولیس والوں کی۔ مگر یہ حیرت انگیز بات تھی کہ اکثر پولیس افسران سے میری اچھی خاصی دوستی تھی۔

میں نے توفیق غوری کی بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ہاں ہر کام قرینے اور قاعدے سے ہوتا ہے۔ پرائمری کا امتحان اسکول میں، میٹرک کا بورڈ کے تحت اور گریجویشن وغیرہ کا یونیورسٹی کے انڈر۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے فاتحانہ انداز میں تھانیدار کو دیکھا اور اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''عاقل کے ساتھ جو ناانصافی یا ظلم ہوا ہے اس کی کیٹگری پرائمری سطح کی ہے۔ میرا مطلب ہے، آپ اس علاقے کے تھانیدار ہیں۔ یہاں بسنے والوں کی جان، عزت اور مال کے رکھوالے۔ اگر یہاں کسی شخص کے ساتھ ناانصافی یا زیادتی ہوتی ہے تو یہ آپ کا فرض بنتا ہے کہ آپ مظلوم کا ساتھ دیں اور ظالم کے ہاتھ توڑ دیں۔ خاص طور پر ایسی صورت میں کہ مظلوم شکایت لے کر آپ کے پاس بھی آ جائے۔ کچھ عرصہ قبل عاقل یہاں سے مایوس ہو کر جا چکا ہے۔''

''آپ تو ابھی ابھی عاقل کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔'' وہ بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا۔

''ہاں، میں تو ابھی آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ سے پہلے جو تھانے دار تھے، عاقل ان کے پاس فریاد لے کر آیا تھا مگر اسے ڈانٹ ڈپٹ کر واپس بھیج دیا گیا۔''

پھر میں نے توفیق غوری کو پولیس کی سابق کارگزاری کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً سیدھا ہو گیا اور تعاون آمیز لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے، آپ مجھے دو دن کی مہلت دیں۔ میں اصغری اور سلطان کو اپنے طور پر تھانے بلا کر کچھ تفتیش کرتا ہوں۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں دو دن بعد آپ سے فون پر رابطہ کروں گا۔ مجھے امید ہے، آپ کوئی اچھی خبر ہی سنائیں گے۔''

''انشاء اللہ۔'' وہ بھی اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہم نے باری باری توفیق غوری سے مصافحہ کیا اور اس کے کمرے سے نکل آئے۔

راستے میں، میں نے عاقل کو ایک ایسی جگہ ڈراپ کر دیا جہاں سے اسے اپنے گھر جانے کے لئے آسانی سے بس مل سکتی تھی۔

جب میں اپنے گھر پہنچا تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

☆

دوسرے روز نازنین کو میں نے تھانیدار سے رات والی گفتگو کے بارے میں تفصیلاً بتایا۔ اس نے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ کا کیا خیال ہے، یہ تھانہ انچارج توفیق غوری عاقل کے معاملے کو

سنجیدگی سے لے گا؟''

''میرا تو خیال ہے وہ اس معاملے کو پوری سنجیدگی سے لے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے وہ ہر ممکنہ طور پر عاقل کی مدد بھی کرے گا۔ اس نے ہم سے دو دن کی مہلت لی ہے۔ دیکھیں دو روز بعد کیا چاند چڑھتا ہے۔''

''اللہ کرے، جو بھی نتیجہ برآمد ہو اس میں عاقل کے لئے خیر کا پہلو موجود ہو۔'' نازنین نے دعائیہ انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے، ایسا ہی ہوگا۔''

دو روز بعد توفیق غوری سے میری فون پر بات ہوئی۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے اور میں تمام مصروفیات بیرونی ختم کر کے گھر پہنچ چکا تھا۔

''جی غوری صاحب!'' میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اینی پراگریس؟''

وہ بولا۔ ''سلطان تو ان دنوں شہر میں نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے، وہ حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ دو تین روز میں واپس آجائے گا۔ البتہ میں نے اصغری سے خاصی طویل پوچھ تاچھ کی ہے۔''

''نتیجہ کیا برآمد ہوا غوری صاحب؟''

''تقریباً صفر کے برابر۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''میں سمجھاتا ہوں۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے میں موجود کسی شخص کو باہر جانے کے احکامات صادر کئے۔ دوسری طرف مبہم گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ تنہائی میں مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اگلے ہی لمحے ریسیور میں غوری کی آواز سنائی دی۔

''ہاں بیگ صاحب! تو میں آپ سے کیا کہہ رہا تھا!''

میں نے اس کی گفتگو کے آخری جملے کو دہراتے ہوئے کہا۔ ''آپ فرما رہے تھے کہ آپ مجھے کچھ سمجھانا چاہتے ہیں۔''

''ہاں ہاں......'' وہ بھاری بھر کم لہجے میں بولا۔ ''میں اصغری کے بارے میں بتا رہا تھا کہ اس سے پوچھ گچھ کے بعد کوئی مفید اور مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔''

''اس نے کیا بیان دیا ہے؟''

''وہ اپنے سابق بیان پر ڈٹی ہوئی ہے۔'' توفیق غوری نے کہا۔ ''وہی بیان جو اس کا موقف بھی ہے یعنی اس نے سلطان اور عاقل کے درمیان صرف پراپرٹی ایجنٹ کا کردار ادا کیا تھا۔ عاقل کا مکان پینتیس ہزار میں فروخت ہوا تھا۔ اصغری نے اپنے کمیشن کے پانچ ہزار رکھ کر باقی تیس ہزار عاقل کے حوالے کر دیئے تھے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتی۔ جہاں تک عاقل کو گھر میں رکھنے کا

سوال ہے تو یہ کام اس نے انسانی ہمدردی کے ناتے کیا تھا جو بہت ہی مہنگا ثابت ہو رہا ہے اور اس نے آئندہ کے لئے تہیہ کر لیا تھا کہ کسی سے بھی بھلائی نہیں کرے گی۔''

غوری کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ''ہاں بھئی، یہ تو واقعی پہلے والا بیان ہے۔ لگتا ہے ان دونوں میں بڑی مضبوط انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ یہ چکر انہوں نے اتنی ہوشیاری سے چلایا ہے کہ ان پر انگلی رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔''

توفیق غوری نے کہا۔ ''میں نے ایک سادہ لباس عورت کو اصغری کی ٹوہ میں لگا دیا ہے۔ وہ اسی بستی میں رہتی ہے۔ دراصل وہ پولیس کی مخبر ہے۔ وہ اندر کی بات معلوم کرنے کی کوشش کرے گی۔ امید ہے کوئی سودمند بات سامنے آہی جائے گی۔''

اس کے بعد غوری نے بھی وہ خدشہ ظاہر کیا جو میرے اور نازنین کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا۔ یعنی اصغری کی پوزیشن بظاہر بالکل صاف نظر آرہی تھی۔ اس نے عاقل کا مکان پینتیس ہزار روپے میں بکوا کر اپنا پانچ ہزار روپے کا کمیشن کھرا کر لیا۔ دوسری جانب سلطان نے پینتیس ہزار روپے ادا کر کے عاقل کا مکان خرید لیا۔ اس نیٹ اینڈ کلین صورت حال میں وہ دونوں سچے نظر آتے تھے۔ عاقل کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا تھا اس میں ان دونوں کی چالاکی سے زیادہ عاقل کی بے وقوفی کا ہاتھ تھا۔

میں نے توفیق غوری سے کہا۔ ''اب تو سلطان کی واپسی کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''اس کا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔'' غوری نے میری تائید کی۔ ''مگر مجھے پوری امید ہے کہ وہ مخبر عورت بھی جلد ہی کوئی اہم خبر لے کر آئے گی۔''

''اس سلسلے میں آپ نے اصغری کی بیٹی حسنہ کو چیک نہیں کیا؟'' میں نے پوچھا۔

غوری نے بتایا۔ ''میں نے اس سے بھی کافی سوالات کئے ہیں مگر اس کا بیان اصغری کے بیان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ عاقل کی بیان کردہ اسٹوری میں اس کا نام زبردستی اور کسی سازش کے تحت شامل کیا گیا ہے۔ اس کے عاقل سے کبھی بھی اس قسم کے مراسم نہیں رہے جن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ عاقل کی عمر اس کے باپ سے بھی زیادہ ہے۔ وہ اس سے اس قسم کے تعلقات کے بارے میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔ خوامخواہ اسے بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔''

''حسنہ تو وہی کہے گی جو پٹی اس کی ماں نے پڑھائی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''ویسے ایک بات ہے۔'' غوری بولا۔ ''حسنہ اور عاقل کی عمروں میں بڑا تفاوت ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم یہ فرق تیس سال کا تو ہوگا۔ اس روشنی میں حسنہ کی بات وزنی دکھائی دیتی ہے۔ ایک پچیس سالہ حسین وجمیل لڑکی کسی پچپن چھپن سالہ بڈھے کھوسٹ سے رومانس کیونکر کرنے لگی؟''

میں نے کہا۔ ''غوری صاحب! محبت، عشق اور رومانس کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔ یہ ایک عجیب و

غریب دورہ ہے۔ کسی کو کسی بھی وقت پڑ سکتا ہے۔''

''ممکن ہے عاقل ہی غلط بیانی سے کام لے رہا ہو۔''

''اس بات کے امکانات معدوم ہیں۔''

''معدوم ہوں گے مگر ہیں ضرور۔'' توفیق غوری نے کہا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' ٹھیک ہے، میں عاقل کو ایک مرتبہ پھر گھسنے کی کوشش کرتا ہوں۔ آپ ذرا سلطان کی خبر لیں۔''

''اس کی خبر تو میں ایسی لوں گا جیسی کسی نے نہیں لی ہوگی۔'' توفیق غوری نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''ایک بار وہ حیدرآباد سے واپس تو آجائے۔''

پھر چند رسمی باتوں کے بعد میں نے فون بند کردیا۔

اگلی صبح میں حسب معمول عدالت گیا، پھر دفتر آ گیا نازنین کو میرا انتظار تھا۔ میں جیسے ہی اپنے چیمبر میں پہنچا، وہ میرے پاس آئی اور پوچھا۔'' کیا خبریں ہیں بیگ صاحب؟''

''کس بارے میں؟''

''دو دن گزر گئے۔'' وہ بولی۔'' تھانے دار صاحب نے کوئی پیش رفت کی عاقل کے معاملے میں؟''

میں نے کہا۔'' ہاں بھئی، رات کو غوری کا فون آیا تھا۔ اس نے اصغری سے لمبی چوڑی پوچھ گچھ کی ہے۔''

''پھر کیا رہا؟'' نازنین نے پوچھا۔

''ابھی تک کوئی کارآمد بات معلوم نہیں ہو سکی۔'' میں نے بتایا۔'' وہ اپنے سابق بیان پر ڈٹی ہوئی ہے۔''

''اور سلطان کیا کہتا ہے؟''

''وہ حسب روایت کراچی سے باہر گیا ہوا ہے۔''

''کہاں؟''

''حیدرآباد۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے، تھانے دار صاحب نے اس کی کلاس نہیں لی ہوگی ابھی تک۔'' نازنین نے کہا۔

میں نے جواب دیا۔'' ظاہر ہے، وہ واپس آئے گا تو ہی اس کا انٹرویو ہو سکے گا۔ میرا مطلب ہے توفیق غوری کو ابھی تک اس پر طبع آزمائی کا موقع نہیں مل سکا۔''

نازنین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔'' بیگ صاحب! آپ نے بھی یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ سلطان حیدرآباد بہت جاتا ہے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ممکن ہے، کوئی خاص وجہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وجہ عام سی ہو۔'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔'' میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔''

نازنین میرے چیمبر سے نکل کر اپنے کیبن میں چلی گئی۔ کیونکہ کلائنٹس کی آمد وشد کا آغاز ہو گیا تھا۔

اس رات میں دفتری مصروفیات سے فارغ ہو کر جب گھر پہنچا تو میرے رہائشی فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ میں نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور ماؤتھ پیس میں کہا۔'' ہیلو!''

''ہیلو، بیگ صاحب؟'' دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

''ہاں، میں مرزا امجد بیگ ایڈووکیٹ بات کر رہا ہوں۔'' میں نے تصدیقی لہجے میں کہا۔'' آپ کون ہیں؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے دوسری طرف سے کہا گیا۔'' لیں جناب، ہمارے تھانیدار صاحب سے بات کریں۔''

میں انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایئر پیس میں توفیق غوری کی آواز ابھری۔'' ہیلو بیگ صاحب! کچھ سنا آپ نے؟''

''بھائی تم کچھ سناؤ گے تو سنوں گا نا۔'' میں نے جھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔

وہ بولا۔'' میں سلطان کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''کیا ہوا سلطان کو؟''

''اس کا مطلب ہے، آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں۔''

''ہاں، مجھے کچھ بھی علم نہیں۔'' میں نے کہا۔'' اب شروع ہو جاؤ، کیا بتانا چاہتے ہو؟''

وہ شروع ہو گیا۔'' آپ فوراً تھانے آجائیں۔ ایک سنسنی خیز خبر آپ کا انتظار کر رہی ہے۔''

''اور یہ خبر سلطان سے متعلق ہے۔ ہے نا؟''

''ہاں، آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ بولا۔'' بس اب فوراً نکل پڑیں۔''

میں نے کہا۔'' غوری صاحب! میں صبح کا نکلا ہوا ابھی گھر میں داخل ہوا ہوں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ تم مجھے فون پر ہی وہ سنسنی خیز خبر سنا دو۔ مجھے تھانے آنے کی زحمت نہ دو۔ میں کل دن میں چکر لگا لوں گا۔''

''کل صبح تو میں سلطان کو عدالت میں پیش کرنے جاؤں گا۔'' اس نے دھماکا آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد وہ عدالتی ریمانڈ پر میری تحویل میں ہوگا۔ پھر میں آپ کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں دوں گا۔''

''عدالت، ریمانڈ؟'' میں نے سٹپٹائے ہوئے لہجے میں کہا۔'' یہ کیا کہہ رہے ہو بھائی؟''

وہ ستانے والے انداز میں بولا۔'' ہم نے سلطان کو آج مغرب کے وقت اصغری کے گھر سے

گرفتار کیا ہے۔ اس نے اصغری کو قتل کر دیا ہے۔ بس اس سے زیادہ میں آپ کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اگر مزید جاننا چاہتے ہیں تو ابھی اور اسی وقت تھانے چلے آئیں۔''

کے ساتھ ہی توفیق غوری نے ٹیلی فونک رابطہ منقطع کر دیا۔

تھانیدار توفیق غوری نے جو دھماکا خیز انکشاف کیا تھا اسے آسانی سے ہضم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے فوراً نازنین کو فون کیا اور اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی سنسنی محسوس کرنے لگی اور کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے بیگ صاحب؟''

میں نے بے خیالی میں پوچھا۔ ''کس بارے میں؟''

وہ بولی۔ ''تھانے جانے یا نہ جانے کے بارے میں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو ابھی گھر پہنچا ہی ہوں۔ میں نے ابھی تو کھانا بھی نہیں کھایا۔''

نازنین نے کہا۔ ''میں کھانا کھا چکی ہوں۔ اگر آپ تھانے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں آپ کی طرف آ جاتی ہوں، اپنے شوہر کے ساتھ۔ اس دوران میں آپ کھانا کھالیں، پھر ہم ایک ساتھ تھانے چلیں گے۔ میں تو اپنے پورے وجود میں ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس کر رہی ہوں۔''

''میرا بھی یہی حال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تم میری طرف آ جاؤ، پھر تھانے چلتے ہیں۔''

''کیا عاقل کو بھی ساتھ لے چلیں؟'' نازنین نے پوچھا۔ ''اس کا گھر تھانے سے زیادہ دور نہیں ہے۔''

میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''نہیں، اس احمق کو ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہیں وہ ''شادی مرگ'' کا عملی نمونہ نہ پیش کر دے۔ پہلے ہم وہاں کی صورت حال معلوم کرتے ہیں پھر جو مناسب سمجھیں گے وہ عاقل کو بتا دیں گے۔''

نازنین نے میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد کہا۔ ''میں بس نکل ہی رہی ہوں۔''

اختتامیہ جملوں کی ادائیگی کے بعد میں نے ریسیور رکھ دیا۔

اس رات جب ہم تھانے پہنچے تو تھانیدار رفیق غوری نے بڑے فاتحانہ انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ نازنین کی گاڑی میں نے اپنے گھر پر کھڑی کر دی تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی میری گاڑی میں میرے ساتھ تھانے پہنچے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد غوری نے ہمارے لئے چائے منگوائی اور سلطان کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات کرنے لگا۔ وہ سلطان کا ابتدائی بیان ریکارڈ کر چکا تھا۔ سلطان سے کچھ اگلوانے میں غوری کو کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ سلطان چونکہ رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا اس لئے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ وہ اس وقت تھانے کی حوالات میں بند تھا۔

تھانیدار توفیق غوری سے جو معلومات حاصل ہوئیں ان کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔

سلطان نے شدید طیش کے عالم میں اصغری کو قتل کر دیا تھا۔ واقعات کے مطابق اس روز سلطان اصغری کے گھر پہنچا اور اس سے وعدہ ایفا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اصغری نے سلطان سے وعدہ کر رکھا تھا کہ اگر وہ عاقل کا مکان پینتیس ہزار میں خرید لے تو وہ حسنہ کی شادی اس سے کر دے گی۔ حسنہ کے لالچ میں سلطان نے پچپن ہزار کا مکان پینتیس ہزار میں خرید لیا تھا۔ اس تمام معاملے میں اصغری نے زبردست چال چلی تھی۔ ایک طرف تو اس نے عاقل کو جھانسا دیا کہ وہ اس کا مکان پچپن ہزار میں بکوا رہی ہے جبکہ دوسری جانب وہ سلطان کو یہ تسلی دیتی رہی کہ وہ عاقل کے سامنے پچپن ہزار کا سودا منظور کرے مگر ادائیگی اسے صرف پینتیس ہزار کی کرنا ہوگی۔ اس سلسلے میں جو ڈراما رچایا جائے گا اس کا ایک ایک سین اصغری نے سلطان کو ذہن نشین کروا دیا تھا۔ ساتھ ہی اس نے سلطان کو یہ خواب بھی دکھایا تھا کہ دس ہزار مہنگا مکان خریدنے کے بدلے میں وہ اپنی بیٹی حسنہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے گی۔

دراصل سلطان کافی عرصے سے حسنہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اصغری اس کے عزائم سے بخوبی آگاہ تھی۔ وہ سلطان کی شہرت سے بھی واقف تھی۔ وہ روبرو آ کر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے حسنہ کی مد میں سلطان سے دس ہزار زیادہ دلوانے میں کامیابی حاصل کر لی۔

دوسری جانب وہ عاقل کی عقل پر دبیز پردے ڈالتی چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ عاقل کسی گوری چٹی اور دبلی پتلی کم عمر لڑکی کا ''امیدوار'' ہے۔ اس نے حسنہ کی جھلک دکھا کر عاقل کے پاس موجود رقم ہتھیا لی۔ بعد ازاں اسے کرائے کے فلیٹ میں دھکیل کر اس سے ایسی بے رخی کا مظاہرہ کیا کہ وہ پاؤں پٹختا اور سر جھٹکتا رہ گیا۔ نہ تو اسے حسنہ ملی اور نہ ہی مکان کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم اس کے پاس رہی۔

عاقل تو ایک بے چارہ انسان تھا۔ وہ کوشش کے باوجود بھی اصغری کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔ لیکن سلطان کسی اور ہی مزاج کا آدمی تھا۔ مکان خریدنے کے بعد اس نے اصغری سے حسنہ کا مطالبہ شروع کر دیا۔ وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اسے ٹالتی رہی۔ دراصل وہ اس بات کا انتظار کر رہی تھی کہ کسی طرح عاقل سے رقم نکلوا کر اسے اپنے گھر سے بے دخل کر دے۔ پھر سلطان سے بھی نمٹ لے گی۔

عاقل جب فلیٹ میں منتقل ہوا تو سلطان کے مطالبے میں تیزی آ گئی۔ سلطان کی ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ اسے ہر ماہ دو تین مرتبہ حیدر آباد بھی جانا پڑتا تھا۔ اس نے لوگوں سے یہی کہہ رکھا تھا کہ وہ کاروبار کے سلسلے میں حیدر آباد آتا جاتا رہتا ہے۔ درحقیقت وہ کچھ غیر قانونی دھندوں میں مصروف تھا جس کی وجہ سے اسے اکثر کراچی اور حیدر آباد کے درمیان سفر میں رہنا پڑتا تھا۔ سلطان کے ان ''مذموم دھندوں'' کا یہاں ذکر کرنا ضروری نہیں۔

قصہ مختصر، وقوعہ کے روز سلطان حیدر آباد سے سیدھا اصغری کے گھر پہنچا اور اس نے حسنہ کا مطالبہ کردیا۔ اصغری گزشتہ پیوستہ حیلوں وسیلوں سے اسے بہلانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ اب اس کی باتوں میں آنے والا نہیں تھا۔

سلطان نے قہرناک لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم بستی چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہونے کا ارادہ رکھتی ہو۔ مگر میں ملک الموت کی طرح تمہیں بچ کر نہیں جانے دوں گا۔''

''تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اصغری نے کمزور لہجے میں کہا۔

وہ دہاڑا۔ ''غلط فہمی کی بچی! مجھے پکی اطلاع ملی ہے۔ لیکن کان کھول کر سن لو۔ آج میں حسنہ کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔ تم نے مجھے بہت تسلی دلاسے دے لئے۔ آج میں تمہاری کوئی بھی بات نہیں سنوں گا۔''

''سلطان! تم مجھے صرف ایک ہفتے کی مہلت دے دو۔'' اصغری نے التجا کی۔

''تاکہ تم آسانی سے فرار ہو سکو؟''

''میں ہرگز فرار نہیں ہوں گی۔'' وہ یقین دہانی کے انداز میں بولی۔ ''میں دراصل یہ چاہتی ہوں کہ حسنہ کی شادی کے لئے ضروری انتظامات کرلوں۔ میں اسے طریقے سلیقے سے وداع کرنا چاہتی ہوں۔''

''بند کرو اپنی یہ بکواس۔'' وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''اب تم مجھے چکمہ نہیں دے سکو گی۔''

سلطان نے جارحانہ انداز میں پیش رفت کی تو اصغری مزاحمت پر اتر آئی۔ اسی دوران میں ان میں ہاتھا پائی ہونے لگی۔ پھر ایک مرحلے پر سلطان کا غصہ آسمان سے باتیں کرنے لگا۔ اصغری نے ایک مردانہ فحش گالی سے اسے نواز کر اس کے دماغ کا فیوز اڑا دیا تھا۔ وہ آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے اصغری کو فرش پر گرا دیا۔ اس کے بعد وہ اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا گلا دبانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی کوشش میں اصغری کا دوپٹہ اس کے ہاتھ آ گیا۔ سلطان نے اصغری کے گلے میں پڑے ہوئے دوپٹے کو اس کی گردن کے گرد کسنا شروع کر دیا۔ اصغری کے حلق سے پھنسی پھنسی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ اس کی آنکھیں بھی ابل کر دیدوں سے باہر آ رہی تھیں۔

اس صورت حال نے حسنہ کو خوف زدہ کر دیا۔ وہ بے اختیار باہر کو دوڑی اور چیخ چیخ کر لوگوں کو اندر پیش آنے والی قیامت خیز اور ہلاکت آمیز سچویشن سے آگاہ کرنے لگی۔

دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے لوگ وہاں جمع ہو گئے۔ جب انہیں صورت حال کی سنگینی کا علم ہوا تو وہ مکان کے اندرونی حصے کی جانب دوڑے اور پھر دو تین ہٹے کٹے لڑکوں نے سلطان کو قابو کر لیا مگر وقت کا پرندہ پھر سے اُڑ گیا تھا۔ اصغری کا بے جان لاشہ کمرے کے فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔

کسی نے ایفی شنسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پولیس کا فون کر دیا۔ پھر پولیس موبائل کو وہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ سلطان کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے گئے۔

سلطان نے پولیس کا کام انتہائی آسان کر دیا۔ اس نے جرم کا اقرار کر کے تھانیدار توفیق غوری کو اس کی وجوہات بھی بتا دیں۔ اصغری نے سلطان اور عاقل دونوں کو حسنہ کے برتے پر اُلّو بنایا تھا۔ عاقل کم ہمت تھا۔ وہ تو سلطان کے سامنے جعلی ڈرامہ رچانے کا حوصلہ نہیں کر سکا تھا، اصغری سے دو دو ہاتھ کس طرح نمٹتا۔ لیکن سلطان کسی اور ہی قماش کا انسان تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ اصغری اس کے قابو میں نہیں آ رہی تو طیش کے عالم میں اس نے اصغری کا قصہ ہی پاک کر دیا۔

''خس کم، جہاں پاک'' کے مصداق اصغری اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ عدالتی کارروائی سے گزرنے کے بعد سلطان کو بھی قرار واقعی سزا ہو جانا تھی۔ یعنی وہ بھی اپنے اچھے برے انجام کو پہنچ جاتا۔ اب آ جا کر عاقل کا معاملہ باقی رہ گیا تھا۔ اس کی رقم اصغری نے ہڑپ کی تھی۔ مکان اگرچہ سلطان نے خریدا تھا مگر اس خریداری میں بھی دھوکا دہی شامل تھی۔ میں عاقل کے لئے اپنے دل میں درد محسوس کرنے لگا۔ اس بے چارے کو کچھ نہیں مل سکا تھا۔

وہ پوری رات میں عاقل کے بارے میں سوچتا رہا۔ بالآخر ایک توانا خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ سلطان کے اقبالِ جرم اور اصغری کی المناک موت سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اس بے چارے کے ساتھ فراڈ کیا گیا تھا۔ میں نے نازنین کو بتایا کہ میں اب عاقل کا کیس عدالت میں لے جانے کی پوزیشن میں ہوں۔ صورت حال اچانک عاقل کی حمایت میں بدل گئی تھی۔

آئندہ چند دنوں میں، میں نے تمام شواہد کو مجتمع کیا اور کیس تیار کر کے داخل عدالت کر دیا۔ میں نے ایسے تمام ثبوت اور ضروری دستاویزات کیس میں شامل کر دی تھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ عاقل کے ساتھ انتہائی درجے کی زیادتی کی گئی تھی۔

یہ کیس لگ بھگ ایک سال تک چلتا رہا اور آخر کار عدالت نے عاقل کے حق میں فیصلہ سنا دیا۔ اس دوران میں سلطان سزا پا کر جیل جا چکا تھا۔ میری کوششوں سے عاقل کو اس مکان کا قبضہ واپس مل گیا تھا جو وہ سلطان کے ہاتھ بیچ چکا تھا۔ اب اس مکان کی ویلیو خاصی اہم ہو گئی تھی۔ کیونکہ وہ ان اتھرائز ہونے کے باوجود عدالتی فیصلے کے ساتھ اس کے حوالے کیا گیا تھا۔

اس موقع پر عاقل کی خوشی دیدنی تھی۔ وہ خوش ہوتا تھا تو پہلے سے زیادہ احمق دکھائی دینے لگتا تھا۔

میں ایک بات کا اعتراف کروں گا۔ عاقل بھلے احمق اور بے وقوف تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ خوش قسمت بھی تھا ورنہ وہ حالات کے جس بھنور میں پھنس گیا تھا وہاں سے نکلنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ یہ اس کی خوش بختی ہی تھی کہ اس کا ڈوبا ہوا سرمایہ اسے واپس مل گیا تھا۔

اصغری اور سلطان کے انجام کے برخلاف عاقل کے انجام کو ''انجام بخیر'' کہا جا سکتا تھا۔

چلتے چلتے سسپنس ڈائجسٹ کے ذہین قارئین کے لئے ایک امتحان۔ آپ اندازہ لگائیں کہ اس تمام کھٹ راگ میں حسنہ کا کیا ہوا ہوگا؟

⁂☆⁂

سیانا کوّا

ماہِ اپریل کی ایک سہانی صبح میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ میرے رہائشی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری جانب سے نجمی صاحب کی مانوس آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''ہیلو بیگ صاحب! صبح بخیر۔ کیسے ہیں آپ؟''

''الحمدللہ، آپ کی دعا سے بہ خیریت ہوں۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''آپ سنائیں، کیا احوال ہے؟''

نجمی صاحب نے جواب دیا۔ ''اللہ کا کرم ہے۔''

''آج اتنی صبح کیسے یاد فرمایا نجمی صاحب!'' میں نے استفسار کیا۔

میرے سوال کا براہِ راست جواب دینے کے بجائے انہوں نے کہا۔ ''میرا خیال تھا، آپ عدالت کے لئے گھر سے روانہ ہو چکے ہوں گے۔ اچھا ہوا آپ مل گئے۔ ورنہ مجھے آپ کے دفتر یا پھر عدالت تک آپ کا تعاقب کرنا پڑتا۔''

''میرے تعاقب کی ضرورت کیوں پیش آ گئی جناب!'' میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ویسے آپ کا اندازہ صد فی صد درست ہے۔ میں ایک آدھ منٹ میں گھر سے نکلنے ہی والا تھا۔ مجھے یہاں سے سیدھا دفتر جانا تھا اور پھر عدالت کا رخ کرنا تھا۔ خیر، آپ کچھ بتانے جا رہے تھے؟''

میں نے اپنے آخری جملے میں سوالیہ انداز سموتے ہوئے بات ختم کی تو نجمی صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولے۔ ''بیگ صاحب! وہ بات اصل میں یہ ہے کہ میرے پریس مین کو پولیس اٹھا کر لے گئی ہے۔''

''اوہ!'' میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

انہوں نے بتایا۔ ''کل شام کو یہ واقعہ پیش آیا ہے۔''

نجمی صاحب کا پورا نام فواد نجمی تھا۔ پاکستان چوک کے نزدیک ان کا ایک پرنٹنگ پریس تھا۔ ''نجمی پرنٹنگ پریس'' جہاں پر شادی کارڈ، وزیٹنگ کارڈ، لیٹر پیڈ، ہینڈ بل اور اسی نوعیت کی دوسری چیزوں کی تسلی بخش چھپائی کا کام کیا جاتا تھا۔ میں اپنے دفتر کی اسٹیشنری کی پرنٹنگ وہیں سے کرواتا تھا۔ نجمی صاحب سے میرے دیرینہ اور دوستانہ مراسم تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''نجمی صاحب! پولیس نے آپ کے پریس مین کو کس جرم میں گرفتار کیا ہے؟''

''جرم شرافت۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں!'' میں نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

''قیصر نہایت ہی سیدھا اور شریف انسان ہے۔'' نجمی صاحب نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے، قیصر کا ایک بروکر سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ اسی بروکر کے ایما پر پولیس قیصر کو پکڑ کر لے گئی ہے۔''

نجمی صاحب کے مذکورہ پریس مین کا نام قیصر محمود تھا۔ ایک دو مرتبہ میں نے اسے پریس میں کام کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا ایک صلح جو اور امن پسند انسان تھا۔ ایسے لوگوں کا فی زمانہ گزارہ بہت مشکل ہوتا ہے۔

میں نے نجمی صاحب سے پوچھا۔ ''آپ کے پریس مین قیصر اور بروکر میں جھگڑا کس بات پر ہوا تھا؟''

''تفصیل تو مجھے معلوم نہیں۔'' نجمی صاحب نے کہا۔ ''سننے میں آیا ہے کہ رقم کے لین دین کا معاملہ ہے۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے سوال کیا۔ ''نجمی صاحب! آپ نے یہی بتایا ہے نا کہ کل شام میں پولیس نے قیصر کو گرفتار کیا ہے؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بتایا ہے۔''

''نجمی صاحب! کل تو اتوار کا دن تھا۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ چھٹی کے دن بھی پریس کھولنے لگے ہیں؟''

''نہیں بیگ صاحب!'' وہ جلدی سے بولے۔ ''اتوار کو میرا پریس مکمل طور پر بند رہتا ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے وضاحت کی۔ ''دراصل قیصر کو مذکورہ اسٹیٹ بروکر کی ایجنسی سے گرفتار کیا گیا ہے۔ وہیں پر ان دونوں کے بیچ جھگڑا ہوا تھا۔ گالم گلوچ کے بعد ہاتھا پائی کی نوبت آ گئی تھی۔ پھر معاملہ توڑ پھوڑ اور مار پٹائی تک جا پہنچا۔ مجھے معلوم ہوا ہے، اسٹیٹ ایجنٹ نے قیصر کو خاصا زدوکوب کیا ہے اور بعد ازاں پولیس کو بلا کر اسے گرفتار بھی کروا دیا۔''

''کیا آپ قیصر سے ملاقات کر چکے ہیں؟''

''نہیں، میں ابھی تک تھانے نہیں جا سکا۔''

''وہ کون سے تھانے میں بند ہے؟''

نجمی صاحب نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا۔ میں نے کہا۔ ''نجمی صاحب! آپ کی فراہم کردہ معلومات سنی سنائی باتوں پر منحصر ہیں۔ آپ نے قیصر سے ملاقات کی ہے اور نہ ہی اس کی گرفتاری کی حقیقت.... در پردہ حقیقت سے آپ آگاہ ہیں۔ ایسی صورت میں آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''بیگ صاحب! قیصر کو پولیس نے کل شام کو گرفتار کیا ہے۔'' نجمی صاحب نے کہا۔ ''میرا

خیال ہے وہ آج اسے عدالت میں پیش کریں گے۔''

میں نے کہا۔''اصول تو یہی ہے۔ پولیس گرفتاری کے بعد چوبیس گھنٹے سے زیادہ کسی ملزم کو اپنی حراست میں نہیں رکھ سکتی۔ اسے عدالت میں پیش کر کے ریمانڈ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بشرطیکہ واقعی اس کی ضرورت بھی درپیش ہو۔ ورنہ بلوے اور لڑائی بھڑائی کے چھوٹے موٹے معاملات تھانے ہی میں نمٹ جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہماری پولیس ماشاءاللہ خاصی مستعد اور فعال ہے۔''

''اگر ایسا ہو جائے تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی۔'' نجمی صاحب نے کہا۔''بے چارہ قیصر کہاں عدالتی بکھیڑوں میں خوار ہوتا پھرے گا۔ آپ اس سلسلے میں قیصر کی مدد کر سکتے ہیں بیگ صاحب؟''

میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔''میں ہر قسم کی جائز قانونی مدد کے لئے تیار ہوں مگر ابھی تک میں اس کیس کے بارے میں صفر سے زیادہ کچھ نہیں جانتا۔ میرا مطلب ہے، قانونی نقطہ نظر سے آپ نے ابھی تک مجھے کوئی اہم بات نہیں بتائی۔''

''مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔'' نجمی صاحب نے کہا۔''آپ اگر آج خود قیصر سے ملاقات کر لیں تو کیسا رہے گا۔ میرا مطلب ہے، وہیں عدالت میں!''

میں نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔''نجمی صاحب! آپ نے جو صورت حال بتائی ہے اس کے پیش نظر میرا نہیں خیال کہ پولیس قیصر کو عدالت میں لے جائے گی۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے استفسار کیا۔''قیصر کے لواحقین اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟''

''لواحقین!'' نجمی نے ہمدردانہ انداز میں کہا۔''بیگ صاحب! قیصر اس دنیا میں بالکل تنہا ہے۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں۔ اسی لئے تو مجھے اس غریب کی زیادہ فکر بھی ہے۔ میں قیصر کو اس مصیبت سے نکالنے کے لئے آپ کی فیس اور دیگر اخراجات برداشت کرنے کو تیار ہوں۔ وہ لگ بھگ پندرہ سال سے میرے پریس پر کام کر رہا ہے۔ ایسے محنتی اور دیانت دار ملازم اب ناپید ہو چکے ہیں بیگ صاحب!''

نجمی صاحب کی خدا ترسی اور انسان دوستی سے میں بخوبی آگاہ تھا۔ میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''نجمی صاحب! آپ جو حالات بتا رہے ہیں ان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ شاید ابھی تک کوئی شخص قیصر سے ملنے تھانے بھی نہیں گیا ہوگا۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے۔'' نجمی صاحب نے تائیدی لہجے میں کہا۔

میں نے پوچھا۔''آپ کا آج کا کیا پروگرام ہے؟''

''سب سے پہلے تو میں پریس ہی جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔''آپ پریس کے معاملات کو دیکھ کر پہلی فرصت میں تھانے جا کر قیصر سے ملاقات کریں۔ اس سے حقیقت حال معلوم کر کے آپ بعد از دوپہر میرے دفتر تشریف

لے آئیں۔ پھر دیکھتے ہیں اس سلسلے میں کیا، کیا جا سکتا ہے۔''

''اور اگر پولیس نے ریمانڈ حاصل کرنے کے لئے قیصر کو عدالت میں پیش کر دیا تو پھر کیا ہوگا؟'' نجمی صاحب نے ایک واضح امکان کے پیش نظر کہا۔

''پھر ہماری ملاقات عدالت ہی میں ہوگی نجمی صاحب!'' میں نے کہا۔ پھر ایک عدالت کا ذکر کرنے کے بعد کہا۔''میں آپ کو مذکورہ عدالت میں مل جاؤں گا۔''

''آپ نے میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹا دیا ہے بیگ صاحب!'' نجمی صاحب نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔''آپ واقعی حق دوستی نبھانا جانتے ہیں۔''

میں نے نجمی صاحب کے تعریفی کلمات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔''ایک بات کو ذہن میں رکھئے گا نجمی صاحب۔''

''ہاں ہاں، کہئے۔'' وہ جلدی سے بولے۔

میں نے کہا۔''دن کے وقت عموماً تھانہ انچارج تھانے میں غیر موجود ہوتے ہیں۔ اگر قیصر کو آج عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تو سن گن لینے کی کوشش کیجئے گا کہ پولیس کا آئندہ کیا پروگرام ہے۔ ایسے معاملات میں عام طور پر ایف آئی آر نہیں کاٹی جاتی اور گرفتار شدہ شخص کے وارثوں کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ کچھ لے دے کر مُک مُکا کر لیا جائے۔ ہو سکتا ہے، قیصر کا کیس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا؟''

''بہ خوبی سمجھ رہا ہوں جناب!'' نجمی صاحب معنی خیز لہجے میں بولے۔

میں نے کہا۔''تو پھر ٹھیک ہے۔ آپ قیصر کے وارث کے طور پر فی الفور تھانے پہنچیں اور وہاں کی صورت حال کا جائزہ لیں۔ معاملات کی سنگینی اور نزاکت کا اندازہ لگانے کے بعد مجھ سے رابطہ کریں۔ انشاءاللہ بہتری کی کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔''

''بہت بہتر جناب۔'' نجمی صاحب نے تائیدی لہجے میں کہا۔

مزید دو منٹ کی گفتگو کے بعد میں نے ٹیلی فونک رابطہ ختم کر دیا۔ میں اپنے معمول سے دس منٹ لیٹ ہو چکا تھا لہٰذا اب فوری طور پر گھر سے نکلنا ضروری ہو گیا تھا۔ آئندہ چند منٹ میں، میں اپنی گاڑی میں بیٹھا دفتر کی جانب رواں دواں تھا۔

☆☆☆

عدالتی مصروفیات دوپہر تک جاری رہیں۔ میں اپنی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں اس قدر مشغول رہا کہ وقتی طور پر نجمی صاحب اور قیصر میرے ذہن سے محو ہو گئے۔ پھر جب میں عدالت سے رخصت کے وقت پارکنگ سے اپنی گاڑی نکال رہا تھا تو ایک دیرینہ شناسا سے ملاقات ہو گئی۔ ان حضرت کے ساتھ کینٹین میں بیٹھ کر چائے وغیرہ بھی پینا پڑی۔ چنانچہ مجھے اپنے دفتر پہنچنے میں ذرا تاخیر ہو گئی۔

اسی تاخیر کے سبب میں نے باقاعدہ لنچ کا پروگرام ملتوی کیا اور اپنے چیمبر میں پہنچتے ہی سیکرٹری سے کہا کہ وہ آفس بوائے کو بھیج کر میرے لئے کوئی لائٹ ریفریشمنٹ منگوا لے۔

میری بات مکمل ہونے پر سیکرٹری نے ''او کے سر'' کہا پھر بولی۔ ''سر! تھوڑی دیر پہلے نجمی صاحب آپ سے ملنے آئے تھے۔''

''ملنے آئے تھے......کیا مطلب؟''

وہ میرے سوال کا مقصد سمجھتے ہوئے بولی۔ ''انہوں نے ویٹنگ روم میں کچھ دیر آپ کا انتظام کیا پھر جلد ہی دوبارہ آنے کا کہہ کر دفتر سے نکلے ہیں۔ بس آپ کی آمد سے دس منٹ قبل۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''اب وہ جیسے ہی آئیں، مجھے فوراً مطلع کرنا۔''

''او کے سر۔'' سیکرٹری نے شائستہ انداز میں کہا۔

میں نے انٹر کام کا ریسیور رکھ دیا اور نجمی صاحب کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی آفس بوائے پیٹ پوجا کے لوازمات لے آیا اور میں مصروف ہو گیا۔ میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ سیکرٹری نے انٹر کام پر اطلاع دی۔

''سر! نجمی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔''

''انہیں فوراً میرے چیمبر میں بھیج دو۔'' میں نے کہا۔

''سر! تین کلائنٹ بھی آ چکے ہیں۔'' سیکرٹری نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''نجمی صاحب کے جانے کے بعد انہیں ترتیب وار میرے پاس بھیجنا۔ کوئی ایمرجنسی معاملہ ہو تو پہلے مجھ سے بات کر لینا۔ او کے؟''

''او کے سر۔'' وہ فرمانبرداری سے بولی۔

اگلے ہی لمحے نجمی صاحب میرے چیمبر میں داخل ہوئے۔ ان کے چہرے پر تفکر کی پرچھائیں میں نے واضح طور پر محسوس کی۔ پُرجوش مصافحے کے بعد میں نے انہیں بیٹھنے کے لئے کرسی پیش کی پھر رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

''نجمی صاحب! ٹھنڈا چلے گا یا گرم؟ بلاتکلف بتائیں۔''

''آپ سے کوئی تکلف نہیں ہے بیگ صاحب۔'' نجمی صاحب نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''میرا خیال ہے موسم کی مناسبت سے ٹھنڈا ہی منگوالیں۔''

میں نے انٹر کام پر کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا، پھر نجمی صاحب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''جی نجمی صاحب! قیصر سے ملاقات ہو گئی؟''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور بولے۔ ''آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ قیصر کو اگر پولیس نے آج عدالت میں پیش نہیں کیا تو اس سے ان کے کون سے عزائم کا اظہار ہوتا ہے۔''

میں نے باقاعدہ جواب دینے کے بجائے اثبات میں گردن ہلا دی۔ انہوں نے کہا۔ ''آپ کا

اندازہ بالکل درست ہے۔ پولیس جوڑ توڑ کے چکر میں ہے۔''

''کیا آپ کی تھانہ انچارج سے ملاقات ہوئی تھی؟''

''نہیں جناب! آپ کی پیش گوئی کے عین مطابق ایس ایچ او صاحب وہاں موجود نہیں تھے۔'' نجمی صاحب نے جواب دیا۔ ''البتہ ایک ''سمجھ دار'' اے ایس آئی سے کچھ مفید معلومات حاصل ہوئی ہیں۔''

''مثلاً کیسی معلومات؟'' میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور رف پیڈ کو اپنے سامنے سرکا لیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا قلم بھی کھول لیا تھا۔

نجمی صاحب نے بتایا۔ ''مجھے ڈھکے چھپے الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ شمس الدین نامی پراپرٹی ایجنٹ نے قیصر کو بند کروانے کے لئے پورے پانچ ہزار روپے خرچ کئے ہیں چنانچہ قیصر کو چھڑوانے کے لئے دس ہزار روپے خرچ کرنا ہوں گے۔''

''اوہ، یعنی ڈبل گیم۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ پھر پوچھا۔ ''کیا آپ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں کہ قیصر کو کس الزام میں بند کیا گیا ہے؟''

نجمی صاحب نے دکھ بھرے لہجے میں بتایا۔ ''جو کچھ سننے میں آیا ہے، میں تو اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوں۔''

''سننے میں کیا کچھ آ رہا ہے نجمی صاحب؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ اصل معاملہ کسی لڑکی کا ہے۔'' نجمی صاحب نے بے یقینی کے لہجے میں کہا۔ ''اسٹیٹ ایجنسی پر افسانہ نامی کوئی خوب صورت لڑکی کام کرتی ہے۔ پولیس اے ایس آئی کے مطابق قیصر، افسانہ کے چکر میں تھا۔ معاملہ آگے بڑھا تو بحالت مجبوری شمس الدین عرف شمشو کو مداخلت کرنا پڑی۔ جواب میں قیصر آمادہ پیکار ہو گیا۔ نتیجے کے طور پر شمشو نے قیصر کو حوالہ پولیس کر دیا۔'' نجمی صاحب چند لمحات کو رک کر دوبارہ گویا ہوئے۔ ''لیکن بیگ صاحب! یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔ میں قیصر کو پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ وہ ایسے کسی چکر میں پڑنے والا شخص نہیں ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، اسے کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت پھانسا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نجمی صاحب! فون پر تو آپ نے بتایا تھا کہ قیصر اور پراپرٹی ایجنٹ کے درمیان رقم کے لین دین پر جھگڑا ہوا تھا اور اب بیچ میں افسانہ نامی ایک خوب رو لڑکی آن ٹپکی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی جناب!'' نجمی صاحب نے کہا۔ ''اے ایس آئی کی فراہم کردہ معلومات کے مطابق قیصر کا دعویٰ ہے کہ شمشو نے فلیٹ دلوانے کا جھانسہ دے کر اس کی ایک موٹی رقم ہضم کر لی ہے جبکہ شمشو کے بیان کے مطابق قیصر فلیٹ خریدنے کے بہانے اس کی ایجنسی کے چکر لگاتا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ وہ ایجنسی کی ایک ورکر افسانہ کی خاطر وہاں آتا تھا۔ شمشو نے اس

کی آمد و شد کو روکنا چاہا تو قیصر نے ہنگامہ کر دیا اور شمشو پر الزام لگایا کہ وہ اس کی رقم ہڑپ کر گیا ہے۔ معاملہ مار پیٹ تک پہنچا تو شمشو نے قیصر کو تھانے میں بند کروا دیا۔''

''اور اس ''نیک کام'' کے لئے شمس الدین عرف شمشو نے پورے پانچ ہزار روپے پولیس کی خدمت میں پیش کئے ہیں۔'' میں نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''نجمی صاحب! مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔''

''مجھے تو ساری دال ہی کالی دکھائی دے رہی ہے۔'' نجمی صاحب نے کہا۔ ''اول تو یہ کہ قیصر لڑکیوں وڑکیوں کے چکر میں پڑنے والا شخص نہیں ہے۔ دوم، قیصر کا فلیٹ خریدنے والا معاملہ بھی خالی از حقیقت نظر آتا ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ مجھے ضرور بتاتا یا پریس میں کسی اور ملازم سے اس کا ذکر کرتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قیصر کم گو اور اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہے۔ اپنے ذاتی معاملات میں وہ دوسروں کو شامل نہیں کرتا مگر فلیٹ کی خریداری ایسی بات نہیں جسے چھپایا جاتا یا وہ چھپانے کی کوشش کرتا۔''

میں نے نجمی صاحب کے خاموش ہونے پر سوال کیا۔ ''اس بارے میں خود قیصر کا کیا موقف ہے؟''

''اگر اس سے ملاقات ہوتی تو میں اس کا موقف بھی معلوم کرتا۔'' نجمی صاحب نے بے دلی سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تھانے میں قیصر سے آپ کی بات چیت نہیں ہوئی؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ''مجھے قیصر سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اے ایس آئی کا کہنا ہے کہ تھانیدار صاحب شام کو آئیں گے۔ اس کے بعد ہی ملاقات ممکن ہو سکے گی۔ اے ایس آئی نے اشاروں کنایوں میں مجھے باور کروا دیا ہے کہ قیصر سے ملاقات کا چکر ٹھیک نہیں۔ بس سیدھا سیدھا میں شام کو مبلغ دس ہزار روپے لے کر تھانے پہنچ جاؤں اور قیصر کو اپنے ساتھ لے جاؤں۔''

پولیس والوں کے ان حربوں سے میں بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس سے کم از کم ایک بات تو واضح ہو گئی کہ قیصر کے خلاف سنگین قسم کے الزامات نہیں تھے۔ پولیس والے از خود اسے چھوڑنے پر تیار تھے تاہم ان کی کچھ ''خدمت'' کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے فواد نجمی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''نجمی صاحب! ان حالات میں آپ کیا قدم اٹھانا چاہیں گے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولے۔ ''میرا خیال ہے قیصر کی جان چھڑانے کے لئے دس ہزار روپے کی قربانی دے دینی چاہئے۔''

میں نے کہا۔ ''نجمی صاحب! ایک بات ذہن میں ضرور رکھیں۔ اگر ہم پولیس کے درپردہ

مطالبے کو نظر انداز کر دیں تو وہ چند روز بعد خود ہی قیصر کو چھوڑ دیں گے۔ اگر ان کے پاس قیصر کو عدالتی کارروائی تک پہنچانے کے لئے کوئی جاندار صورت ہوتی یا ایسا کرنے کا ان کا ارادہ ہوتا تو وہ اتنی تاخیر کرتے اور نہ ہی دس ہزار روپے کے عوض معاملہ ''سیٹل'' کرنے کی بات کرتے۔ پھر ایک اور بات بھی ہے۔''

''وہ کیا بیگ صاحب؟'' نجمی صاحب نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''قیصر نے مبینہ طور پر دعویٰ کیا ہے کہ شمشو نے اس کی ایک تگڑی رقم دھوکے سے ہضم کر لی ہے۔ پولیس قیصر کو زیادہ دنوں تک اپنی کسٹڈی میں رکھ کر اپنے لئے دشواری پیدا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی۔''

''یہ قانونی باریکیاں میری تو سمجھ سے باہر ہیں۔'' نجمی صاحب الجھے ہوئے انداز میں بولے۔ ''میں تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ قیصر اس مصیبت سے نکل آئے۔ اس کام کے لئے آپ جس راہ کا بھی انتخاب کریں گے، میں سفر کے لئے تیار ہوں۔''

''راہ کے انتخاب سے پیشتر قیصر سے ایک ملاقات ضروری ہے۔'' میں نے پُر خیال لہجے میں کہا۔ ''اس کے بعد ہی میں کوئی حتمی فیصلہ کر سکوں گا۔''

نجمی صاحب نے کہا۔ ''قیصر سے ملنے کی کوشش میں، میں تو ناکامیاب ہو گیا ہوں۔ آپ کی بات دوسری ہے۔ آپ قانون جانتے ہیں۔ پولیس والے آپ سے زیادہ اڑی نہیں کر سکتے۔''

میں نے گفتگو کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''میں آج دفتر سے جاتے ہوئے متعلقہ تھانے کا بھی چکر لگا لوں گا۔ آپ اس سلسلے میں بے فکر ہو جائیں۔''

''میرے لئے اب کیا حکم ہے بیگ صاحب؟''

''آپ اطمینان سے جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں پہلے قیصر سے ملاقات کر لوں۔ صورتِ حال واضح ہو جائے پھر آپ سے بات ہو گی۔''

''میں رات میں آپ کو فون کروں گا۔'' نجمی صاحب نے کہا۔

''اچھی بات ہے۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔ ''مگر ایک بات کا خیال رہے کہ آپ دس بجے کے بعد فون کریں گے۔''

''اوکے۔'' نجمی صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔ ''بیگ صاحب! میں آپ کے معمولات سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ میں انشاء اللہ رات دس کے بعد اور بارہ سے پہلے ہی فون کروں گا۔''

میں نے زیر لب مسکرانے پر اکتفا کیا۔ نجمی صاحب نے الوداعی مصافحہ کیا پھر وہ میرے چیمبر سے نکل گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اپنے دیگر کلائنٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

رات گھر جانے سے قبل میں نے متعلقہ تھانے میں جا کر قیصر سے تفصیلی ملاقات کر لی۔ بہ حیثیت وکیل، اس ملاقات کے لئے مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ قیصر سے لگ بھگ

ایک گھنٹے کی ملاقات کے بعد مجھے معلومات کا خزانہ حاصل ہوا۔ میں نے قیصر کو تسلی دی کہ وہ بہت جلد اس مصیبت سے نجات پا جائے گا۔ نہ صرف وہ پولیس کے چنگل سے نکل آئے گا بلکہ اس کی ڈوبی ہوئی ایک موٹی رقم بھی اسے واپس دلوانے کی میں پوری کوشش کروں گا۔ میں جب اس کے پاس سے رخصت ہوا تو وہ خاصا پُر امید اور مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔ حالانکہ جب میں وہاں پہنچا تھا تو وہ مجھے کسی مردے سے مشابہ نظر آیا تھا۔ شمشو نے اس کی جو ٹھکائی کی تھی سو کی تھی، پولیس والوں نے بھی ڈرانے دھمکانے کے نام پر اس کی اچھی خاصی درگت بنائی تھی۔

قارئین کرام! کہانی کو آگے بڑھانے سے پہلے ضروری ہے کہ میں وہ پس منظر پیش کروں جس کے سبب قیصر حوالات کی ہوا کھانے پر مجبور ہوا تھا تا کہ بعد کے واقعات اور عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کا ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ ان میں بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں لیکن تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے میں ترتیب وار بیان کر رہا ہوں۔

قیصر محمود پر ٹوٹنے والی بپتا کا احوال بیان کرنے سے پہلے میں آپ کی خدمت میں متعلقہ تھانے کے انچارج صاحب سے ہونے والی مختصر گفتگو کو ضرور پیش کروں گا۔ جب میں تھانے پہنچا تھا تو تھانیدار اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا لیکن جب میں حوالات سے فارغ ہوا تو موصوف اپنے کمرے میں سیٹ پر بہ نفس نفیس موجود تھا۔ مجھ سے علیک سلیک ہوئی تو اس نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

''وکیل صاحب! معمولی لڑائی جھگڑے کے ملزم سے ملاقات کی خاطر آپ جیسے بڑے وکیل کا تھانے آنا عجیب سا لگتا ہے۔''

''آپ درست کہتے ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بات واقعی معمولی لڑائی جھگڑے کی ہے جبھی تو آپ نے صرف دس ہزار پر قناعت کر لی۔ ورنہ آپ کی ''فرمائش'' تو پیٹیوں سے شروع ہوتی ہے۔''

''کیسے دس ہزار جناب؟'' وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''تفصیل میں جا کر کیا کریں گے تھانیدار صاحب۔ حقیقت آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ یہ بتائیں، مبینہ ملزم اور میرے موکل کو کب ''رخصت'' کرنے کا ارادہ ہے؟''

میں نے قیصر محمود کو اپنا موکل اس لئے کہا تھا کہ ملاقات کے دوران میں، میں نے وکالت نامے پر اس کے دستخط لے لئے تھے۔ تھانیدار نے میری بات کے جواب میں کہا۔

''ایسی بھی کیا جلدی ہے وکیل صاحب! ابھی تو پنچھی آیا ہے۔ ہمیں ابھی اس کی خاطر تواضع کا کچھ موقع ملنا چاہئے نا۔ اتنی جلدی کیسے رخصت کر دیں؟''

''یہ خاطر تواضع کہیں آپ کو مہنگی نہ پڑ جائے۔ اس کا ضرور خیال رکھئے گا۔'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''معاملہ ویسا نہیں ہے جیسا شمشو نے آپ کو بتایا ہے۔ کہیں اس کی ''خدمت'' کو حلال کرنے کا الٹا نتیجہ نہ نکل آئے۔''

وہ سرد و گرم چشیدہ تھا، فوراً معاملے کی تہ تک پہنچ گیا تاہم ہموار لہجے میں بولا۔ ''معاملہ جیسا بھی ہے وہ ہم سے زیادہ اور کون جانتا ہے بیگ صاحب! اور مجھے یہ بھی معلوم ہے، آپ چوٹی کے وکیل ہیں۔ دیکھ بھال اور چھان پھٹک کر ہی کسی کیس میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب! ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھار کیس پہلے میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور چھان پھٹک کا کام میں بعد میں کرتا ہوں۔ موجودہ معاملہ بھی کچھ ایسا ہی سمجھ لیں۔ کیس آج صبح میرے ہاتھ میں آ گیا تھا اور اب میں نے چھان پھٹک اور اٹھا پٹخ شروع کر دی ہے۔ میرا موکل آپ کی تحویل میں ہے۔ اس کا خیال رکھئے گا، کہیں اس کی رہائی کے لئے مجھے قانونی چارہ جوئی نہ کرنا پڑے۔''

اتنا کہہ کر میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ تھانیدار نے کہا۔ ''بیگ صاحب! قیصر کو ہم نے شوقیہ بند نہیں کر رکھا۔ اس کے خلاف ہمارے پاس باقاعدہ شکایت موجود ہے۔ شمشو کی ایجنسی پر ہونے والی ہنگامہ آرائی کی ذمے داری۔''

''میں نے جو کہنا تھا وہ کہہ چکا۔'' میں نے دروازے کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ ''پراپرٹی ایجنٹ شمس الدین عرف شمشو سے تو میں خود نمٹ لوں گا۔ آپ کو اگر قیصر کے حوالے سے کسی ''پیدا'' کی توقع ہے تو ایسا خیال ذہن سے نکال دیں۔ اللہ حافظ!''

پھر میں وہاں رکے بغیر تھانے سے باہر نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ تھانیدار میرے رخصت ہونے کے بعد پیچ و تاب کھا کر رہ گیا ہو گا۔ دل ہی دل میں نہیں بلکہ اس نے با آواز بلند مجھے ناقابل اشاعت گالیوں میں تولا ہو گا اور اس کے کمرے میں موجود اس کے ساتھیوں نے اس کی گالی میں گالی بھی ملائی ہو گی۔ پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہِ وقت کو بھی برا بھلا کہہ لیتے ہیں، میں تو پھر ایک وکیل تھا..... قانون کا ایک پرزہ!

☆☆☆

میرا موکل قیصر محمود گزشتہ لگ بھگ پندرہ سال سے ''نجمی پرنٹنگ پریس'' پر بہ حیثیت پریس مین کام کر رہا تھا۔ جب اس نے پریس پر ملازمت اختیار کی تو اس کی تنخواہ صرف چھ سو روپے تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس کی تنخواہ میں اضافہ ہوتا رہا جو اب ڈھائی ہزار روپے ماہوار تک پہنچ گئی تھی۔ قیصر کی رہائش گاہ کورنگی کے علاقے میں تھی جہاں وہ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ مذکورہ کوارٹر کا کرایہ چھ سو روپے ماہانہ تھا۔ قیصر اس کوارٹر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ تمام قریبی رشتے داروں کا انتقال ہو چکا تھا اور دور دراز کے رشتے داروں سے اس کے مراسم نہیں تھے۔

نجمی صاحب کے بقول قیصر ایک سیدھا سادھا اور شریف انسان تھا، اپنے کام سے کام رکھنے والا، محنتی اور دیانت دار۔ درج بالا خوبیوں سے انکار نہیں مگر قیصر اتنا بھی سیدھا اور بھولا نہیں تھا جتنا نجمی صاحب سمجھتے تھے۔ وہ اپنے تئیں بہت ہوشیار اور چالاک بنتا تھا جس کی وجہ سے اس نے ہمیشہ

نقصان اٹھایا تھا۔ اپنی ڈیڑھ ہوشیاری ہی کے سبب وہ اپنے ذاتی معاملات کی کسی کو ہوا نہیں لگنے دیتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ عاقل و بالغ ہے لہٰذا اسے کسی سے مشورہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے سارے منصوبے خفیہ رکھنے کا عادی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نجمی صاحب اس کے بارے میں زیادہ تفصیلات نہیں جانتے تھے۔ نجمی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ فلیٹ کی خریداری کا قصہ خالی از حقیقت تھا۔ اس کے لئے دلیل انہوں نے یہ دی تھی کہ اگر ایسا کوئی معاملہ ہوتا تو چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

معاملہ واقعی چھپا نہیں رہا تھا۔ پریس میں قیصر کے فلیٹ کے حوالے سے دیگر ورکرز میں خاصا تبادلہ خیالات ہوا کرتا تھا تاہم نجمی صاحب کو اس واقعے کی خبر نہیں تھی، نہ ہی کسی دوسرے ملازم یا خود قیصر نے انہیں بتانے کی کوشش کی تھی۔ اس کی ایک عجیب وجہ وہ بدمزگی بھی تھی جو فلیٹ کی خریداری کے حوالے سے قیصر اور دیگر ملازمین میں ہوئی تھی۔

نجمی پرنٹنگ پریس کے ملازمین کو جب کسی طرح معلوم ہوا کہ قیصر ایک فلیٹ خریدنے والا ہے تو ہر ایک نے حسب توفیق قیصر کی سادگی نما بے وقوفی کو دیکھتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

پریس کے مستقل کاتب راجا ارشد نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔ ''قیصر بھائی! سنا ہے آپ کوئی فلیٹ خرید رہے ہیں۔ یہ فلیٹ کہاں پر ہے اور آپ کتنے میں خرید رہے ہیں؟''

قیصر کو بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ فلیٹ والا معاملہ اب ناگفتہ نہیں رہا پھر وہ کاتب ارشد پر قدرے زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ اس نے نہایت ہی رازدارانہ انداز میں بتایا۔

''فلیٹ ادھر نزدیک ہی برنس روڈ پر ہے۔ ایک اسّی میں خرید رہا ہوں۔''

''ایک اسّی؟'' راجا ارشد نے حیرت سے دہرایا۔ ''یعنی ایک لاکھ اسّی ہزار روپے قیصر بھائی؟''

قیصر نے اثبات میں سر ہلایا، پھر سرگوشیانہ انداز میں کہا۔ ''دیکھو، یہ بات میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں کیونکہ میں تم پر اعتماد کرتا ہوں۔ کسی اور تک فلیٹ والے معاملے کی خبر نہیں پہنچنا چاہئے۔''

''آپ بالکل بے فکر ہو جائیں قیصر بھائی۔'' راجا ارشد نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''سمجھ لیں یہ بات میں نے اپنے دل میں دفن کر دی۔ مگر ایک بات مجھے ہضم نہیں ہو رہی۔''

''کون سی بات یار؟'' قیصر نے الجھے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''ایک اسّی والی بات۔''

''میں سمجھا نہیں!''

''یار قیصر!'' راجا ارشد نے وضاحتی لہجے میں کہا۔ ''تمہارے پاس اتنی بڑی رقم کہاں سے آ گئی۔ کیا کہیں ڈاکا ڈالا ہے یا کوئی لاٹری نکل آئی ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' قیصر نے بتایا۔ ''دراصل فلیٹ کی کل قیمت ایک لاکھ اسّی ہزار روپے ہیں۔ لیکن سہولت یہ ہے کہ ساری ادائیگی یکمشت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف اسّی

ہزار روپے ادا کر کے قبضہ حاصل کر لوں گا۔ باقی ایک لاکھ ماہانہ اقساط کی صورت میں دینا ہوں گے۔ جب ادائیگی پوری ہو جائے گی تو فلیٹ میرے نام ٹرانسفر ہو جائے گا۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہارے پاس اسّی ہزار روپے موجود ہیں؟'' ارشد نے عجیب سی نظروں سے قیصر کو دیکھا۔ ''تم تو چھپے رستم نکلے یار!''

قیصر نے بتایا۔ ''پچھلے کئی برسوں سے قطرہ قطرہ جمع کر رہا تھا تب کہیں جا کر اتنی رقم اکٹھی کر پایا ہوں۔ بس یار دعا کرو، فلیٹ والا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ جائے۔ کرائے کے کوارٹر سے جان چھوٹے گی اور نزدیکی کی وجہ سے بسوں کے کرائے سے بھی نجات مل جائے گی۔ برنس روڈ سے پاکستان چوک تک تو دس منٹ میں پیدل بھی پہنچا جا سکتا ہے۔''

''اچھا ہے یار، تمہارا کام ہو جائے گا۔'' راجا ارشد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ ''مگر ایک بات کا خیال رکھنا قیصر بھائی! یہ جائیداد کی خرید و فروخت کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے، کسی تجربہ کار آدمی سے ضرور مشورہ کر لینا۔''

''کسی سے مشورے کی ضرورت نہیں ہے راجا صاحب!'' قیصر نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔ ''میں پوری طرح مطمئن ہوں۔ پھر پراپرٹی ڈیلر پر مجھے پورا بھروسہ ہے۔ شمشو بھائی بہت نیک اور ایماندار آدمی ہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''چلو، پھر تو ٹھیک ہے۔'' راجا ارشد نے بات ختم کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اللہ کرے، جلد از جلد آپ کا کام ہو جائے قیصر بھائی۔''

''دیکھو راجا ارشد!'' قیصر نے تنبیہی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں اپنا دوست سمجھتے ہوئے اتنی بات بتا دی ہے، کسی اور سے نہ کہنا۔ ہاں، جب میں فلیٹ میں منتقل ہو جاؤں گا تو خود سب کی دعوت کروں گا۔''

راجا ارشد نے اسے یقین دلایا کہ وہ اس راز کو ذاتی راز سمجھ کر اس کی حفاظت کرے گا۔ مگر قیصر کے حوالے سے یہ اتنی بڑی خبر تھی کہ راجا، قیصر سے کئے ہوئے وعدے کو ایفا نہ کر سکا۔ اس نے اپنے ایک ساتھی الیاس احمد سے بات کی۔ الیاس نے فرحان خان کو بتایا۔ بات پورے پریس میں پھیل گئی۔ نجمی پرنٹنگ پریس میں یہی چار افراد کام کرتے تھے۔ بس بے خبر تھے تو صرف نجمی صاحب۔ انہیں اس لئے بھی نہیں بتایا گیا کہ فرید خان شرارت کے موڈ میں تھا۔ وہ قیصر سے تفریح لینا چاہتا تھا۔ ایک روز لنچ کے وقت فرید خان نے قیصر کو چھیڑ دیا۔

''قیصر بھائی! کل آپ کے جانے کے بعد کسی پراپرٹی ڈیلر کا فون آیا تھا آپ کے لئے۔''

وہ چاروں ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ اتفاق سے اس روز نجمی صاحب کسی ضروری کام سے گئے ہوئے تھے چنانچہ ملازمین خود کو خاصا ''ایزی'' محسوس کر رہے تھے۔

فرید خان کے جملے پر قیصر نے دزدیدہ نظر سے راجا ارشد کی طرف دیکھا مگر وہ سر جھکائے

کھانے میں مصروف تھا۔ قیصر نے فرید خان سے پوچھا۔ ''کیا کہہ رہا تھا پراپرٹی ڈیلر؟''

''مجھ سے تو کچھ نہیں کہا۔'' فرید خان نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''بس آپ کا پوچھا، میں نے بتایا کہ آپ چھٹی کر کے جا چکے ہیں تو اس نے فون بند کر دیا۔''

فتیلے کو آگ فرید خان نے دکھادی تھی۔ یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا جا رہا تھا اس لئے اس سلسلے کو آگے بڑھانے کے لئے الیاس احمد نے کہا۔

''قیصر بھائی! کیا کوئی فلیٹ وغیرہ خریدنے کا ارادہ ہے؟''

''نہیں بھائی۔'' قیصر نے پُرزور تردید کی۔ ''میری اتنی پسلی کہاں۔''

''پسلی تو آپ کی بہت ہے قیصر بھائی۔'' اس مرتبہ فرید خان نے گرہ لگائی۔ ''ایک آدمی کا خرچہ ہی کتنا ہوتا ہے۔ کافی مال جمع کر رکھا ہوگا آپ نے۔ ایک کیا، آپ تو دو دو فلیٹ خرید سکتے ہیں۔''

راجا ارشد نے ہمدردانہ لہجے میں راز افشائی کی۔ ''کیا بات کر رہے ہو فرید بھائی! قیصر صاحب کے پاس اسی ہزار کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے، وہ چھڑے چھانٹ ہیں مگر یہ بھی تو دیکھو کہ مہنگائی کس قدر ہو چکی ہے۔''

''بھائی! یہ اسی ہزار کا کیا قصہ ہے؟'' الیاس احمد نے حیرت بھری نظر سے قیصر کی جانب دیکھا۔ سب کچھ پلاننگ کے مطابق ہو رہا تھا۔

قیصر کو احساس ہو گیا کہ راجا ارشد نے بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ اسے راجا سے اس بات کی توقع تو نہیں تھی مگر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس وقت وہ تینوں خطرناک موڈ میں تھے۔ قیصر پہلوتہی کی جتنی کوشش کرتا، وہ اتنا ہی زیادہ اس کے سر ہو جاتے۔ اس نے فوری فیصلہ کیا کہ زیادہ مناسب یہی ہوگا کہ انہیں فلیٹ کے معاملے کے بارے میں سرسری سا بتا دیا جائے۔ بعد میں بھی بات کھلنا ہی ہے۔ اگر اس وقت اس نے تردیدی انداز اختیار کیا تو وہ اٹھتے بیٹھتے اس کا جینا حرام کر دیں گے۔

قیصر نے شکایتی نظر سے راجا ارشد کو دیکھا پھر جھینپے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''دراصل آج کل پراپرٹی ایجنٹ سے ایک فلیٹ کی خریداری کی بات چل رہی ہے۔ اسی سلسلے میں اس نے فون کیا ہو گا۔''

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا قیصر بھائی! آپ کی پسلی بہت مضبوط ہے۔'' فرید خان نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

الیاس نے پوچھا۔ ''قیصر بھائی! فلیٹ کیسا ہے اور کتنے میں خرید رہے ہو؟''

''دو کمروں کا فلیٹ ہے۔'' قیصر نے بتایا۔ ''اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا لاؤنج بھی ہے۔ ایک لاکھ اسی ہزار میں مل رہا ہے۔ ادھر نزدیک ہی برنس روڈ پر ہے۔''

''اچھا تو اسی ہزار کا قصہ یہ تھا۔'' فرید خان نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ نے راجا ارشد کو سب کچھ بتا رکھا تھا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے پوچھا۔ ''اسی ہزار کی بات تو ظاہر ہو

گئی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے، آپ نے اسی ہزار جمع کر رکھے ہیں۔ باقی ایک لاکھ کہاں سے دیں گے قیصر بھائی؟''

''وہ ایک لاکھ روپے ماہانہ اقساط کی صورت میں دینا ہوں گے۔'' قیصر نے بتایا۔

''ماہوار قسط کیا ہوگی؟''

''ایک ہزار روپے۔'' قیصر نے کہا۔

''یہ تو بہت کم ہے۔'' فرید خان نے تبصرہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک لاکھ کی رقم لگ بھگ سوا آٹھ سال میں ادا ہو گی۔ کیا آپ نے یہ رقم ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن کو ادا کرنا ہے؟''

''نہیں جناب!'' قیصر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ رقم پراپرٹی ڈیلر کو ادا کروں گا۔''

''پراپرٹی ڈیلر کو؟'' الیاس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''بھائی! ایسا دریا دل اور خدا ترس پراپرٹی ڈیلر کون ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو اس سے ملواؤ قیصر بھائی۔''

الیاس احمد زمین و جائیداد کی خرید و فروخت کی معلومات رکھتا تھا اسی لئے اسے اتنی حیرت بھی ہوئی تھی۔ فرید خان نے پوچھا۔ ''قیصر بھائی! فلیٹ مالکانہ حقوق پر خرید رہے ہو یا پگڑی سسٹم کے تحت؟ میں یہ بات اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ برنس روڈ کے علاقے میں زیادہ تر فلیٹ پگڑی پر ہی خریدے اور بیچے جاتے ہیں۔''

الیاس احمد نے اپنی معلومات بگھارتے ہوئے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ برنس روڈ پر زیادہ تر پرانی عمارتیں ہیں جن میں فلیٹوں کی خرید و فروخت پگڑی سسٹم کے تحت ہی ہوتی ہے۔ مگر نئی عمارتوں میں آج کل مالکانہ حقوق کا رواج عام ہو رہا ہے۔ میرے ایک دوست نے پچھلے دنوں وہیں مالکانہ حقوق پر ایک فلیٹ کا سودا کیا ہے۔''

''قیصر بھائی! پھر تو آپ کو اس سلسلے میں الیاس صاحب سے ضرور مشورہ کرنا چاہئے۔'' راجا ارشد نے کہا۔ ''آج کل کے پراپرٹی ڈیلروں کا کیا اعتبار۔ آپ نے تو اپنا پیٹ کاٹ کر اسی ہزار جمع کئے ہیں۔''

الیاس احمد نے قیصر سے پوچھا۔ ''قیصر بھائی! آپ نے بتایا ہے کہ باقی کے ایک لاکھ روپے آپ ماہانہ اقساط کی صورت میں پراپرٹی ایجنٹ کو ادا کریں گے۔ کیا آپ نے یہ فلیٹ پراپرٹی ایجنٹ سے خریدا ہے؟ میرا مطلب ہے، کیا وہ فلیٹ پراپرٹی ڈیلر کی ملکیت ہے؟''

''ہاں، یہی تو بات ہے۔'' قیصر نے پانی کے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اس بلڈنگ کے تمام فلیٹ پراپرٹی ڈیلر نے خرید لئے ہیں اور اب ایک ایک کر کے وہ انہیں فروخت کر رہا ہے۔''

''کیا آپ نے اس بات کی تصدیق کر لی کہ مذکورہ فلیٹ اسی پراپرٹی ایجنٹ کی ملکیت ہے؟'' الیاس احمد نے تشویش ناک لہجے میں سوال کیا۔ تشویش کا سبب قیصر کا سیدھا پن تھا۔ کوئی بھی پراپرٹی ایجنٹ اسے دھوکا دینے کے لئے اس قسم کا چارا استعمال کر سکتا تھا۔

قیصر نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''پراپرٹی ڈیلر بہت بھروسے کا آدمی ہے۔ مجھے اس کے کہے پر پورا یقین ہے۔ وہ تمام فلیٹ اسی کی ملکیت ہیں۔ اس بات کی تصدیق سلیم اور افسانہ نے بھی کی ہے۔''

''سلیم اور افسانہ؟'' فرید خان نے شوخ لہجے میں دریافت کیا۔ ''یہ دونوں مرد و زن کون ہیں؟''

قیصر نے جھینپے ہوئے انداز میں بتایا۔ ''سلیم پراپرٹی ایجنٹ کے ساتھ کام کرتا ہے اور افسانہ پراپرٹی ایجنٹ کی چھوٹی بہن...... میرا مطلب ہے، وہ بھی ایجنسی ہی میں کام کرتی ہے۔''

''بھائی! یہ تو مجھے کوئی اور ہی چکر لگ رہا ہے۔'' فرید خان نے معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ پراپرٹی ایجنٹ کی چھوٹی بہن افسانہ والا معاملہ گڑبڑ ہے۔''

قیصر کی حالت دیدنی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات سے یوں ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہو۔ تاہم اس نے بات نبھانے کی خاطر لیپا پوتی کرتے ہوئے کہا۔

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ پراپرٹی ڈیلر اپنی ملازم افسانہ کو بالکل چھوٹی بہن کی طرح سمجھتا ہے۔ وہ سلیم کو بھی اپنے چھوٹے بھائی کی جگہ تصور کرتا ہے۔ میں نے بتایا ہے نا، پراپرٹی ایجنٹ بہت ایماندار، نیک اور بھروسے کا آدمی ہے۔''

الیاس احمد نے کہا۔ ''بہر حال قیصر بھائی! رقم کا لین دین کرنے سے پہلے اچھی طرح سوچ لینا۔ اگر پسند کرو تو میں تمہارے ساتھ چلوں گا تاکہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ نہ ہو جائے۔''

''فراڈ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جناب!'' قیصر نے جوشیلے انداز میں کہا۔ ''آپ کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں الیاس صاحب۔ میں پراپرٹی ایجنٹ سے پوری طرح مطمئن ہوں۔''

''اللہ کرے، آپ کا اطمینان مثبت رنگ لائے۔'' الیاس احمد نے بات سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''ویسے میری خدمات ہر وقت حاضر ہیں۔''

''آپ خوامخواہ فکر کر رہے ہیں۔'' قیصر نے بے اعتنائی سے کہا ''میں نے اچھی طرح ہر معاملے کی جانچ پڑتال کر لی ہے۔''

راجا ارشد نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''او، اللہ کے بندے!'' اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو، او اللہ میاں کی گائے۔ ''کہیں تم نے اسی ہزار روپے پراپرٹی ڈیلر کے حوالے تو نہیں کر دیئے؟''

''ہاں۔'' قیصر نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''پیشگی ادائیگی کے سلسلے میں اسی ہزار روپے تو میں پراپرٹی ایجنٹ کو دے چکا ہوں۔''

قیصر کے اس جواب نے ان تینوں کو بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر دیا۔ الیاس احمد نے پوچھا۔ ''کمال ہے قیصر بھائی! آپ نے چپ چپاتے ایسے ہی خاموشی سے اتنی بڑی رقم پراپرٹی ایجنٹ کی جیب میں ڈال دی۔''

''رقم میری تھی۔ میں اسے کسی کو بھی دوں، آپ کو کیا اعتراض ہے۔'' قیصر نے روکھے پھیکے انداز میں کہا۔ ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے، آپ کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔''

قیصر کی بے مروتی کے انداز نے انہیں احساس دلایا کہ اب اس موضوع پر مزید بات چیت نہیں ہو سکتی۔ قیصر جب ہتھے سے اکھڑ جاتا تھا تو پھر اس کے ناراض ہونے میں ذرا دیر نہیں لگتی تھی۔ کوئی بات اس کے مزاج کے خلاف ہو جائے تو وہ پل بھر میں چراغ پا ہو جاتا تھا۔ اس کی ناراضی سے سبھی ڈرتے تھے۔

تاہم الیاس احمد نے جرأتِ رندانہ کرتے ہوئے کہا۔ ''قیصر صاحب! ٹھیک ہے، یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے اور پراپرٹی ڈیلر پر بھی آپ اندھا اعتماد کر رہے ہیں حالانکہ اسٹیٹ ایجنٹ سے ڈیل کرتے ہوئے کھلی آنکھیں بھی بعض اوقات دھوکا کھا جاتی ہیں۔ لیکن آپ کی ناراضی کی پرواہ کئے بغیر میں یہ پوچھے بنا نہیں رہ سکتا کہ آپ نے جو اسی ہزار روپے کی ادائیگی کی ہے اس کا کوئی ثبوت بھی ہے آپ کے پاس؟''

پراپرٹی ڈیلر نے مجھے باقاعدہ رسید دی ہے۔'' قیصر نے فخریہ لہجے میں بتایا۔

''کیا آپ وہ رسید مجھے دکھائیں گے؟''

''آپ خوامخواہ شک میں مبتلا ہو رہے ہیں الیاس صاحب۔'' قیصر نے کہا۔ ''میں اس رسید سے مطمئن ہوں۔ اس پر رسیدی ٹکٹ لگا ہوا ہے اور باقاعدہ پراپرٹی ڈیلر نے دستخط بھی کئے ہیں۔''

الیاس احمد کا دل چاہا کہ قیصر کی حماقت پر اپنا سر پیٹ لے۔ وہ قیصر کی خفگی کی پرواہ کئے بغیر بولا۔ ''قیصر بھائی! جائیداد کی خرید و فروخت کا اپنا ایک قانونی طریقہ کار ہوتا ہے۔ سودا طے پانے کے بعد سیل ایگریمنٹ بنتا ہے جو عموماً کسی وکیل کے ذریعے تیار کروایا جاتا ہے۔ اس میں رقم کی پیشگی ادائیگی کا ذکر ہوتا ہے۔ بعد میں ادا کی جانے والی رقم کی تاریخ بھی درج کی جاتی ہے۔ باقاعدہ قانون اور قاعدے کے تحت تحریر کی جاتی ہے۔ دونوں پارٹیوں کا نام، ان کے مکمل ایڈریس، شناختی کارڈ کے نمبر وغیرہ کا اندراج ہوتا ہے۔ دونوں طرف سے ایک ایک معتبر گواہ بھی اس ایگری منٹ پر دستخط کرتا ہے۔ جائیداد بیچنے والی پارٹی مقررہ تاریخ پر قبضہ دینے کی پابند ہوتی ہے۔ بعد ازاں رجسٹرار کے سامنے دونوں پارٹیوں کو حاضر ہونا پڑتا ہے۔ جائیداد کے کاغذات کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے پھر سیل ڈیڈ وغیرہ بنتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''قیصر بھائی! آپ کا معاملہ تو میری سمجھ سے باہر ہے۔ پتہ نہیں، آپ کہاں پھنسنے جا رہے ہیں؟''

''آپ میرے پھنسنے کی فکر نہ کریں۔'' قیصر نے باقاعدہ خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں اپنے پراپرٹی ڈیلر پر پورا بھروسہ رکھتا ہوں اور...... بہ فرض محال اگر میرے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی ہے تو میں آپ سے کوئی شکایت کروں گا نہ آپ سے کسی قسم کی مدد مانگوں گا۔''

راجا ارشد نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔ ''قیصر بھائی! اسّی ہزار تو سمجھیں گئے آپ کے۔ ان پر تو فاتحہ پڑھ ہی ڈالیں۔''

قیصر تو پہلے ہی راجا ارشد پر ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ اسی نے فلیٹ کے سلسلے کو ''عام'' کیا تھا ورنہ قیصر تو اب تک یہ ''راز'' سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔ راجا کی تازہ ترین چھیڑ چھاڑ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور بات تو تکار سے شروع ہو کر بول چال بند ہونے تک جا پہنچی۔ تاہم دو چار دن کے بعد حالات نارمل ہو گئے۔

چند روز بعد انہیں کسی طرح معلوم ہوا کہ قیصر محمود پندرہ مارچ کو فلیٹ کا قبضہ لینے والا ہے۔ ڈرتے ڈرتے سب نے قیصر کو مبارکباد دی اور ساتھ ہی مٹھائی کی فرمائش بھی کر دی۔

قیصر نے سابق ناراضگی کو فراموش کر کے ان سے وعدہ کیا کہ وہ فلیٹ میں شفٹ ہو جائے گا تو پھر انہیں مٹھائی بھی کھلائے گا۔ راجا ارشد کی رگِ شرارت پھڑکی اور وہ ضد پر اتر آیا۔ اس نے تیز لہجے میں کہا۔ ''مٹھائی تو آپ کو ابھی منگوانا پڑے گی قیصر بھائی۔''

''تم تو ہر وقت مفتا توڑنے کے لئے پیٹ کھولے بیٹھے رہتے ہو۔'' قیصر نے راجا ارشد کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''کچھ شرم کرو۔''

''میں مفتا توڑتا نہیں بلکہ مفتا جوڑتا ہوں۔'' راجا ارشد نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ابھی چند روز پہلے ہی تو میں نے آپ کے گھر میں ایک مفتا جوڑا ہے۔''

راجا ارشد کتابت کے ساتھ ساتھ پلمبنگ کا کام بھی کرتا تھا۔ پچھلے دنوں قیصر کے گھر میں ایک پائپ میں کچھ خرابی ہو گئی تھی اور ارشد نے بلا معاوضہ ٹوٹے ہوئے پائپ کو جوڑ دیا تھا اسی لئے اس نے ''مفتا جوڑنے'' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ یعنی مفت میں قیصر کا پائپ ٹھیک کر دیا تھا یا جوڑ دیا تھا۔

''تم نے خود ہی معاوضہ نہیں لیا تھا۔'' قیصر نے فرطِ جذبات میں اپنا ہاتھ جیب کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''بولو کتنے پیسے دوں؟ میں ابھی تمہارے منہ پر مارتا ہوں تمہارا معاوضہ۔ بولو، جلدی بولو۔''

''قیصر بھائی!'' راجا ارشد نے کہا۔ ''آپ تو خوامخواہ جذبات میں آ رہے ہیں۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔''

''میرے اندر جذبات ہیں تو جذبات میں آ رہا ہوں نا۔'' قیصر نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ''تم تو بے حس آدمی ہو...... ناقابل اعتبار اور بے بھروسہ۔''

اس چوٹ پر راجا ارشد تلملا اٹھا۔ وہ سمجھ گیا کہ قیصر کا اشارہ اعتبار کے حوالے سے کس جانب ہے۔ اس نے بھی گرمی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں بھئی، ہم تو آپ کے دشمن ہیں۔ آپ کے لئے قابل بھروسہ تو آج کل صرف ایک ہی شخص ہے اور وہ شخص ہے پراپرٹی ڈیلر۔ ہماری بلا سے، جہنم میں جائیں آپ اور آپ کے اسّی ہزار بھی۔ میں تو اب آپ کی مٹھائی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔''

الیاس احمد نے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔ ''راجا! تم قیصر بھائی کی مٹھائی کی جانب آنکھ اٹھا کر مت دیکھنا، آنکھیں جھکائے جھکائے کھا لینا۔'' پھر وہ قیصر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''آج یکم مارچ ہے۔ پراپرٹی ایجنٹ پندرہ مارچ کو قبضہ دے گا۔ اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

اس دوران میں قیصر کا غصہ قدرے ٹھنڈا ہو چکا تھا تاہم انداز ابھی تک پٹری سے اترا ہوا تھا۔ اس نے بتایا۔ ''فلیٹ میں مرمت کا کچھ کام ہے۔ پھر رنگ روغن بھی ہونا ہے۔ دس پندرہ دن تو لگیں گے۔ اس کے بعد ہی شفٹنگ ہو سکے گی۔''

''اچھا اچھا۔'' الیاس احمد نے اثبات میں گردن ہلائی پھر کہا۔ ''میرا ایک جاننے والا بہت اچھا روغن کا کام کرتا ہے۔ معاوضہ بھی معقول لے گا۔ اگر آپ کہیں تو......''

قیصر نے قطع تعلق کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے یہ سارے بکھیڑے پراپرٹی ڈیلر پر چھوڑ دیئے ہیں۔ وہی سارے کام کروا دے گا۔ میں تو سجے سجائے فلیٹ پر جاؤں گا۔''

''سجے سجائے!'' راجا ارشد نے لقمہ دیا۔ ''اللہ خیر کرے، لگتا ہے حجلۂ عروسی اسی فلیٹ پر سجے گا۔''

قیصر نے قہر آلود نظر سے راجا کی جانب دیکھا تاہم اس سے پہلے کہ ان کے درمیان کسی جھڑپ کا آغاز ہوتا، الیاس احمد نے قیصر کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اس کام کے لئے آپ نے پراپرٹی ڈیلر کو مزید کوئی رقم تو نہیں دی؟''

''اٹھائیس ہزار روپے دیئے ہیں۔'' قیصر نے بتایا۔

''اٹھائیس ہزار روپے؟'' فرید خان نے حیرت بھرے لہجے میں دہرایا پھر دریافت کیا۔ ''قیصر بھائی! اس فلیٹ میں کیا کچھ کروانے کا ارادہ ہے؟''

قیصر نے راجا ارشد کو نظر انداز کرتے ہوئے فرید خان اور الیاس احمد سے بات چیت جاری رکھتے ہوئے بتایا۔ ''میں نے اٹھائیس ہزار روپے ایسے ہی ادا نہیں کر دیئے۔ پراپرٹی ڈیلر کے ذمے بہت سے کام بھی لگا دیئے ہیں۔ دونوں کمروں میں مرمت کا اچھا خاصا کام ہے۔ پھر در و دیوار پر رنگ و روغن ہونا ہے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے ہوئے ہیں، وہ بھی نئے لگیں گے۔ کچن کی نئے سرے سے سیٹنگ ہو گی۔ ٹھنڈے گرم پانی کی الگ الگ لائن ڈالی جائے گی۔ گیزر بھی نصب کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں دونوں کمروں میں کارپٹ بچھے گا اور ٹیلی فون کا نیا کنکشن دلوانا بھی انہی اٹھائیس ہزار روپے میں شامل ہے۔''

"ماشاء اللہ، سبحان اللہ۔" فرید خان نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔ "خاصا لمبا چوڑا پروگرام ہے آپ کا تو قیصر بھائی۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ "اس سے تو یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ فلیٹ میں منتقلی کے فوراً بعد آپ کا شادی کا بھی ارادہ ہے۔"

قیصر نے تردید کی نہ تصدیق۔

راجا ارشد اس موقع پر خاموش نہ رہ سکا، جلدی سے بولا۔ "قیصر بھائی! آپ جتنی دلچسپی سے تفصیلات بتا رہے تھے، میں تو یہی سمجھا تھا کہ پراپرٹی ایجنٹ کے ذمے لگائے جانے والے کاموں کے اختتام پر آپ یہ انکشاف کریں گے کہ ان اٹھائیس ہزار روپے میں ایک عدد دلہن بھی شامل ہے۔"

قیصر نے اس تبصرے پر غصیلی نظر سے راجا ارشد کو گھورا تاہم کوئی سخت بات یا جھگڑا کرنے کی بجائے متحمل انداز میں کہا۔ "بچے! چہک لو جتنا چہکنا ہے۔ اب میں زبانی کلامی نہیں بلکہ مناسب موقع پر تمہیں عملی منہ توڑ جواب دوں گا۔ اگر تم میں ذرا سی بھی عقل نما شرم یا شرم نما عقل ہے تو میرے منہ لگنے کی کوشش نہ کرنا۔"

قیصر کی اس خفیہ دھمکی کی پرواہ کئے بغیر راجا ارشد نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "قیصر بھائی! آپ کو میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میں آپ کا دشمن نہیں بلکہ سچا اور پُرخلوص دوست ہوں۔ آپ کی شادی کی سب سے زیادہ خوشی مجھے ہی ہو گی۔ بلکہ اگر واقعی یہ تیاریاں شادی کے سلسلے میں ہو رہی ہیں تو بات مٹھائی تک محدود نہیں رہے گی۔ آپ سے ہم ایک بھرپور ٹریٹ بھی لیں گے۔"

"تمہاری تو وہی مثال ہے...... جہاں دیکھا توا پرات، وہیں گزاری ساری رات۔" قیصر نے جلے بھنے انداز میں کہا۔ "لگتا ہے، تم شدید قسم کی قحط سالی کے دوران میں پیدا ہوئے تھے۔ ہر وقت تمہاری رال ٹپکتی رہتی ہے۔"

"یا ہو سکتا ہے، راجا کے پیٹ میں کیڑے ہوں۔" فرید خان نے ازراہِ تفنن کہا۔ "ایسی صورت میں بھی منہ سے رالیں آتی ہیں۔"

راجا ارشد نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور بولا۔ "میں یار دوستوں کے مذاق کا برا نہیں مناتا۔ یاری دوستی میں سب نرم گرم چلتا رہتا ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ "میں قیصر بھائی کی طرح تھوڑی ہوں...... اِدھر ہم نے ان کی شادی کا ذکر کیا، اُدھر ان کا پارا چڑھنا شروع ہوا۔"

اس موقع پر حسب روایت الیاس احمد نے سمجھ داری کا مظاہرہ کیا اور موضوع گفتگو کو بڑی خوبصورتی سے بدل دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ چاروں پرنٹنگ کے سلسلے میں اپنے اپنے تجربات بیان کر رہے تھے۔

شادی کا بیان قیصر محمود کا نازک پوائنٹ تھا۔ اس موضوع پر نہایت سنجیدگی سے کی گئی بات بھی

بعض اوقات اسے بری لگ جاتی تھی۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کی نصف سنچری مکمل کر چکا تھا مگر ابھی تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ جب وہ جوان تھا تو اس معاملے کی جانب زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اچھے سے اچھے رشتے کو ٹھکراتا رہا۔ اسے جس معیار کے آئیڈیل کی تلاش تھی، وہ مل کر نہیں دے رہا تھا۔ رفتہ رفتہ عمر کی گاڑی آگے بڑھتی رہی، اس کے ساتھ ہی آئیڈیل کے معیار میں گنجائش پیدا ہونے لگی مگر گنجائش کی پیدائش اور عمر کی رفتار میں توازن نہیں تھا لہٰذا بہت زیادہ عمر گزر جانے کے بعد بھی گنجائش اتنی کم پیدا ہو پائی تھی کہ بات بنتے بنتے بگڑ جاتی تھی۔

قیصر کی اسی کمزوری کو کائیاں اور شاطر پراپرٹی ڈیلر ایجنٹ شمس الدین نے بھانپ لیا تھا۔ شمس الدین کا بگاڑ شمسو ہوتا ہے لیکن بذاتِ خود شمس الدین اس لفظ کی ادائیگی پوری طرح نہیں کر پاتا تھا۔ وہ شمسو کو شمشو کہتا تھا اس لئے وہ بڑے، چھوٹے ہر شخص کے لئے شمس الدین عرف "شمشو بھائی" کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

شمشو گزشتہ دو سال سے "یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی" چلا رہا تھا۔ قیصر کو دیکھتے ہی اس نے تاڑ لیا کہ وہ اس کے مطلب کا آدمی تھا۔ شمشو ایک دھوکے باز اور بے ایمان شخص تھا۔ قیصر جیسے سادہ دل شخص کو اپنے جال میں پھانسنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ قیصر فلیٹ کی خریداری کے سلسلے میں شمشو کی ایجنسی پر پہنچا تھا۔ دس منٹ کی گفتگو ہی میں شمشو قیصر کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کر چکا تھا مثلاً...... قیصر دنیا میں اکیلا تھا، اسے ایک فلیٹ کی ضرورت تھی، اس کے پاس لگ بھگ ایک لاکھ روپے کی رقم موجود تھی، اس کی ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور شادی نہ ہونے کی وجہ پسند کے آئیڈیل کی عدم دستیابی تھی۔

قیصر کو ابھی تک اپنا آئیڈیل نہیں ملا تھا تاہم شمشو بھائی کا آئیڈیل شکار اپنے قدموں سے چل کر اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ قیصر اس کے لئے تر نوالہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے قیصر کی سب سے بڑی کمزوری سے کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ خوبصورت، کم عمر اور دُبلی پتلی لڑکی قیصر کی پہلی ترجیح تھی اور یہ تینوں خصوصیات یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی پر کام کرنے والی لڑکی افسانہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

شمشو بھائی نے افسانہ کو چارے کے طور پر آگے بڑھایا۔ قیصر سے اس کا تعارف اپنی چھوٹی بہن کی حیثیت سے کرواتے ہوئے یہ بھی ہدایت کر دی کہ کسی کو افسانہ اور شمشو کے رشتے کا علم نہیں ہونا چاہئے۔ شمشو نے قیصر کو بتایا کہ وہ ایجنسی میں افسانہ کو اپنی ملازمہ ہی ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے وہ بھی اس راز کو راز ہی رکھے۔ قیصر نے اپنی سادگی کے باعث شمشو کے بیان پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیا۔

شمشو کی ہدایت کے مطابق افسانہ نے قیصر کو شیشے میں اتارنا شروع کر دیا۔ پہلے اس نے قیصر کو اپنی اداؤں میں الجھایا پھر ایک روز تنہائی میں وہ قیصر سے اظہارِ محبت کر بیٹھی۔ یہ تنہائی پلاننگ کے مطابق شمشو نے انہیں خود مہیا کی تھی۔ افسانہ، قیصر کے آئیڈیل کی منہ بولتی تعبیر تھی، اس کے منہ سے

محبت کے اظہار نے قیصر پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری کر دی۔ وہ خود کو ہواؤں میں اُڑتے ہوئے محسوس کرنے لگا۔ مزید دو چار ملاقاتوں میں افسانہ نے اس کی آتش شوق کو مزید بھڑکا دیا۔ جب قیصر کو یقین آ گیا کہ وہ اپنے آئیڈیل سے دو چار ہاتھ ہی دور ہے تو اس نے حصول کی خاطر ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر افسانہ نے منصوبے کے مطابق نہایت جذباتی لہجے میں کہا۔

''اب ہمیں شادی کر لینا چاہئے قیصر!''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں۔'' قیصر نے لرزیدہ لہجے میں کہا۔ ''اور بہت جلدی چاہتا ہوں مگر......''

''مگر کیا؟'' افسانہ نے شوخ نظر سے اسے دیکھا۔

''کیا تمہارے بھائی جان راضی ہو جائیں گے؟'' قیصر اُلجھن زدہ انداز میں بولا۔ ''بھائی جان'' سے اس کی مراد شمشو بھائی تھی۔

''شمشو بھائی کو میں راضی کر لوں گی۔'' افسانہ نے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ ''ان سے بات تو پہلے تم کو کرنا ہوگی۔ وہ مجھ سے پوچھیں گے تو میں تمہارے حق میں فیصلہ سنا دوں گی۔'' تھوڑی دیر رک کر افسانہ نے کہا۔ ''قیصر! میں ایک مشرقی اور حیادار لڑکی ہوں۔ اپنی شادی کی بات خود اپنی زبان سے تو نہیں کر سکتی نا۔ تم مرد ہو، رشتہ تو تمہیں ہی ڈالنا ہوگا۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو۔'' قیصر نے تائیدی لہجے میں کہا۔ ''رشتہ لڑکے والوں کی جانب سے چلایا جاتا ہے۔ میں چونکہ بالکل اکیلا ہوں اس لئے تمہارے بھائی سے مجھے خود ہی بات کرنا ہوگی۔ تم نے بالکل ٹھیک کہا، میں ایک مرد ہوں۔ رشتہ میں ہی ڈالوں گا۔''

دوسرے روز قیصر نے موقع پا کر شمشو بھائی سے اس سلسلے میں بات کی۔ قیصر فلیٹ کی خریداری کے سلسلے میں تقریباً ہر دوسرے تیسرے دن ایجنسی کے چکر لگاتا تھا اور جب سے افسانہ سے ''مراسم'' پیدا ہوئے تھے، یہ ''چکر'' کچھ زیادہ ہی لگنے لگے تھے۔

شمشو بھائی نے پوری سنجیدگی سے قیصر کی درخواست سنی، پھر کہا۔ ''قیصر! میری نظر میں تم ایک معقول اور شریف آدمی ہو۔ میں مانتا ہوں کہ میری بہن کو تم سے زیادہ اچھا لڑکا نہیں مل سکتا۔ لیکن میں افسانہ کی رضامندی جانے بغیر تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ تم مجھے ایک دو دن کی مہلت دو۔''

شمشو کی جانب سے حوصلہ افزا جواب پا کر قیصر کی باچھیں کھل گئیں۔ خاص طور پر شمشو نے قیصر کے لئے لفظ ''لڑکا'' استعمال کر کے اسے آسمان سے لگا دیا تھا۔ وہ فرطِ جذبات سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔

''شمشو بھائی! آپ ضرور افسانہ سے اس کی رائے معلوم کریں۔ مجھے معلوم ہے، آپ مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹائیں گے۔''

دو روز بعد شمشو نے قیصر کو خوشخبری سنائی کہ افسانہ نے اس کے حق میں ووٹ دے دیا ہے۔ شمشو نے قیصر کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''میری ایک ہی بہن ہے قیصر! بہت نازوں میں

پلی ہوئی۔ مجھے امید ہے تم اسے کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دو گے۔''

''آپ بالکل فکر نہ کریں شمشو بھائی۔'' قیصر نے اپنی خضاب دار مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اور سینہ تانتے ہوئے فخریہ لہجے میں کہا۔ ''میں افسانہ کو پھولوں سے بھی زیادہ احتیاط سے رکھوں گا۔''

''مجھے یقین ہے، تم ایسا ہی کرو گے۔'' شمشو نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا پھر قدرے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''ایک بات مجھے پریشان کر رہی ہے قیصر میاں!''

''کون سی بات شمشو بھائی؟'' قیصر پلک جھپکتے میں فکرمند نظر آنے لگا۔

''میں سوچ رہا ہوں، شادی کے بعد تم افسانہ کو رکھو گے کہاں؟'' شمشو نے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔ ''تم تو کورنگی کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے ہو اور وہ کوارٹر بھی کرائے کا ہے۔ میری بہن تو......''

قیصر نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''شمشو بھائی! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ میں بھلا افسانہ کو اس تنگ و تاریک کوارٹر میں بیاہ کر لے جاؤں گا؟ نہیں شمشو بھائی! یہ نہیں ہو سکتا۔ بس آپ جلد از جلد مجھے ادھر قریب ہی کوئی اچھا سا فلیٹ دلوا دو۔''

شمشو نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں کوشش تو کر رہا ہوں، انشاء اللہ جلد ہی کوئی صورت نکل آئے گی۔''

آئندہ تین روز کے بعد شمشو نے قیصر کو نوید سنائی کہ دو کمروں (ایک بیڈ+ایک ڈرائنگ) کا ایک فلیٹ نظر میں آیا ہے۔ قیصر کو چاہئے کہ فوراً اسے خریدے۔

''یار قیصر!'' شمشو بھائی نے اسے اپنائیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم چند روز بعد میرے بہنوئی بننے والے ہو اس لئے میں تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے جس فلیٹ کا ذکر کیا ہے، وہ میری ہی ملکیت ہے بلکہ یوں کہو کہ اس بلڈنگ کے بیشتر فلیٹس میری ملکیت ہیں۔ میں چاہوں تو تمہیں بلا معاوضہ بھی وہ فلیٹ دے سکتا ہوں۔ لیکن اتنے دنوں میں، میں نے تمہارے بارے میں جو اندازہ لگایا ہے اس کے مطابق تم ایک ایماندار اور خوددار انسان ہو۔ تم کسی کا ایک پائی کا احسان لینا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ اگر میں نے تمہیں بلا معاوضہ فلیٹ دینے کی کوشش کی تو تمہاری خودداری کو ٹھیس پہنچے گی، تمہاری عزتِ نفس مجروح ہوگی۔ اس لئے میں تمہیں اس قسم کا کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا۔ کیا میں نے تمہارے بارے میں غلط اندازہ لگایا ہے؟''

''آپ کا اندازہ صد فی صد درست ہے شمشو بھائی!'' قیصر اپنی تعریف، ہونے والے سالے کی زبانی سن کر خوشی سے پھول گیا، جلدی سے بولا۔ ''آپ نے مجھے بالکل ٹھیک پہچانا ہے۔ مجھے آپ کی طرف سے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ صرف افسانہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں آپ کا

یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ فلیٹ تو میں اپنی رقم سے خریدوں گا۔ آپ بتائیں، جس فلیٹ کا ابھی آپ نے ذکر کیا ہے، اس کی مالیت کتنی ہوگی؟''

''اس کی مالیت تمہاری گنجائش سے کچھ زیادہ ہے۔'' شمشو نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ''تاہم میں نے اس سلسلے میں بھی ایک ترکیب سوچ رکھی ہے، تمہیں پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں اس بات پر جتنا بھی فخر کروں، کم ہوگا کہ میرا ہونے والا بہنوئی خوددار اور غیرت مند انسان ہے۔''

شمشو نے قیصر کو یہی بتا رکھا تھا کہ ان کے والدین کا انتقال ہو چکا ہے چنانچہ بڑا بھائی ہونے کے ناتے افسانہ کا ہر قسم کا اختیار اسی کو حاصل ہے۔ اس اختیار پر وہ مزید رَدّے قیصر کی بار بار تعریف کر کے چڑھا رہا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں قیصر کو خوددار، محنتی، ایماندار، مردِ آہن، غیرت مند وغیرہ کے القابات سے نواز رہا تھا اور قیصر اپنی سادگی اور سیدھے پن کے باعث پوری طرح اس کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔

اس نے قدرے جوشیلے لہجے میں دریافت کیا۔ ''شمشو بھائی! آپ بتائیں تو سہی، اس فلیٹ کی کتنی قیمت ہے؟''

شمشو نے تامل کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس فلیٹ کی کم از کم قیمت تو ڈھائی لاکھ روپے ہوگی اس وقت۔ مگر میں نے دو سال پہلے چونکہ صرف ایک لاکھ اسّی ہزار روپے میں خریدا تھا اس لئے تم سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں لوں گا۔ تم ایک اسّی ہی دے دینا۔''

قیصر متذبذب نظر سے متوقع سالے کو دیکھنے لگا، پھر ندامت آمیز لہجے میں بولا۔ ''لیکن میرے پاس تو فی الحال ایک لاکھ دس ہزار روپے ہوں گے۔''

''اسی لئے تو میں نے کہا ہے کہ اس سلسلے میں، میں نے ایک ترکیب سوچ رکھی ہے۔'' شمشو نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

''کیسی ترکیب شمشو بھائی؟'' قیصر سراپا گوش ہو گیا۔

شمشو بھائی نے ایک مرتبہ پھر قیصر کا کندھا تھپتھپایا اور مشفقانہ انداز میں گویا ہوا۔ ''قیصر یار! میں نے اپنے طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم فی الحال اسّی ہزار روپے مجھے دے دینا، باقی ایک لاکھ روپے میں ماہانہ اقساط میں تم سے لے لوں گا اور یہ میرا وعدہ ہے کہ مذکورہ ماہانہ اقساط تمہاری شادی کے تین ماہ بعد شروع ہوں گی۔ بولو، منظور ہے؟''

''دل و جان سے منظور ہے۔'' قیصر کی حالت فرطِ انبساط سے خاصی ''دگرگوں'' ہو رہی تھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ''شمشو بھائی! ماہانہ قسط کیا ہوگی؟''

شمشو نے جواب دینے کی بجائے الٹا سوال کر دیا۔ ''تمہاری تنخواہ کتنی ہے قیصر میاں؟''

قیصر نے بتایا۔ ''ڈھائی ہزار روپے۔''

''اور تم کورنگی والے کوارٹر کا کرایہ کتنا دیتے ہو؟''

''چھ سو روپے۔''

''کورنگی سے آنے اور جانے میں بھی اچھی خاصی رقم خرچ ہوتی ہوگی۔'' شمشو نے خیال آرائی کی۔ ''اور وقت بھی ضائع ہوتا ہوگا!''

قیصر نے کہا۔ ''بالکل جناب! کرائے تو آئے دن بڑھتے ہی رہتے ہیں اور وقت بھی خاصا لگتا ہے وہاں سے آنے جانے میں کم از کم دو گھنٹے تو صرف ہو ہی جاتے ہیں۔''

''یہاں نزدیک آ جاؤ گے تو وقت کے ساتھ ساتھ پیسے بھی بچیں گے۔'' شمشو نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''پھر اپنے ذاتی فلیٹ کی تو بات ہی اور ہوتی ہے۔''

''یہ بات تو آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں شمشو بھائی!'' قیصر نے شاطر پراپرٹی ڈیلر کی ہاں میں ہاں ملائی۔

شمشو نے اپنا چکنا چپڑا بیان جاری رکھا۔ ''دیکھو قیصر میاں! میں سچا اور کھرا انسان ہوں اس لئے دوٹوک بات کرنے کا عادی ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے قیصر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا، پھر سلسلہ کلام کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے یہ طے کیا ہے کہ باقی ماندہ ایک لاکھ روپے کی رقم میں تم سے ایک ہزار روپے ماہانہ قسط کے حساب سے واپس لوں گا۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

''آپ کتنے اچھے ہیں شمشو بھائی!'' قیصر نے عقیدت مندانہ انداز میں کہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے ہونے والے نام نہاد سالے کے ہاتھ چوم لیتا۔ ''شمشو بھائی! ہر ماہ ایک ہزار روپے دینا تو میرے لئے کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ بس چار سو روپے ہی تو مزید ملانا ہوں گے۔ چھ سو روپے تو میں کرائے کی مد میں دے ہی رہا ہوں۔ ڈھائی ہزار روپے تنخواہ میں سے چار سو روپے نکالنا بہت آسان ہوگا۔''

شمشو نے کہا۔ ''بس تم یہی سمجھنا کہ تمہارا کرایہ چھ سو روپے سے بڑھ کر ایک ہزار روپے ہو گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی تمہاری آمدنی بھی بڑھ جائے گی۔'' شمشو نے اسے ایک سنہری خواب دکھایا۔

''آمدنی کیسے بڑھے گی شمشو بھائی؟'' قیصر نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

شمشو نے کہا۔ ''قیصر میاں! میں نے تمہارے بارے میں یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ شادی کے بعد تمہاری پریس کی نوکری چھڑوا کر تمہیں اپنے ساتھ بروکری کے کام میں لگا لوں گا۔ نوکری میں کچھ نہیں رکھا میرے بھائی! اپنے کام میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ دو چار سال میں تم اپنی علیحدہ اسٹیٹ ایجنسی کھول لینا اور لاکھوں میں کھیلنا۔ کیا سمجھے پیارے؟ تم بھی کیا یاد کرو گے یار۔'' شمشو بے تکلفی پر اتر آیا۔ ''کیسے سالے سے پالا پڑا تھا۔ زندگی بھر یاد کرو گے!''

سادہ لوح قیصر، شمشو کی چال سے مطلق بے خبر خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔ شمشو جیسے چرب زبان اور چرم دل مکار شخص نے اسے کھلی آنکھوں والا اندھا بنا دیا تھا۔ اس روز قیصر رات کو جب واپس اپنے کوارٹر میں پہنچا تو بقول شخصے، اس کا منوں خون بڑھ چکا تھا۔ اس رات وہ افسانہ کی کھٹی میٹھی یادوں کے ساتھ لپٹ کر گہری نیند سویا۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو نگاہ جدھر جاتی تھی، ادھر افسانہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ ناشتہ اس نے ایک ہوٹل میں کیا اور سیدھا "یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی" پہنچ گیا۔ شمشو بھائی کو اس نے اسی ہزار روپے ابتدائی ادائیگی کرنے کے بعد مضبوط لہجے میں کہا۔

"شمشو بھائی! آپ نے میرے بارے میں جو کچھ سوچا ہے، میں اس سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ اس لئے یہ اسی ہزار تو آپ قبول کریں۔"

شمشو نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ارے، اتنی بھی کیا جلدی تھی۔"

"نیک کام میں تاخیر مناسب نہیں ہوتی۔" قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں، یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" شمشو اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر اپنی میز کی دراز کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ٹھہرو، میں تمہیں اس رقم کی رسید دے دوں۔"

قیصر جلدی سے بولا۔ "رسید کی کیا ضرورت ہے شمشو بھائی۔ ہمارا رشتہ ایسا ہے کہ...... میرا مطلب ہے، ہمارے درمیان جو رشتہ قائم ہونے جا رہا ہے اس کی موجودگی میں رسید سے زیادہ اہم اعتبار ہے...... اور میں آپ پر مکمل بھروسہ رکھتا ہوں شمشو بھائی!"

"میں تمہارے ان جذبات اور خلوصِ نیت کی قدر کرتا ہوں قیصر میاں!" شمشو نے سنجیدگی سے کہا۔ "مگر میری ایک بات ذہن میں بٹھا لو، کاروبار اپنی جگہ اور رشتے داری اپنی جگہ۔ کیا سمجھے؟"

پھر قیصر کے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ خود بول اٹھا۔ "رسید تو میں تمہیں ضرور دوں گا۔"

جب قیصر اسی ہزار کی رقم کی وصولی کی رسید اپنی جیب میں رکھ چکا تو شمشو نے کہا۔ "ابھی تو تم پریس جا رہے ہو۔ واپسی میں یہاں کا چکر لگاتے جانا۔ میں تمہیں آج ہی وہ فلیٹ دکھا دوں گا۔"

اس روز قیصر ایک گھنٹہ پہلے ہی پریس سے چھٹی لے کر شمشو کے پاس پہنچ گیا۔ چند لمحے بعد شمشو اسے پرنس روڈ پر واقع ایک پرانی بلڈنگ میں فلیٹ دکھانے لے گیا۔ فلیٹ کے مکمل معائنے کے بعد قیصر نے کہا۔

"یہ فوری طور پر رہائش کے قابل تو نہیں ہے۔"

"ہاں، یہ بات تو ہے۔" شمشو نے اس کے خیال کی تائید کی۔ "تھوڑا امرمت کا کام ہے۔ پھر چند ماہ سے خالی بھی پڑا ہے اس لئے زیادہ ہی اجڑا ہوا نظر آ رہا ہے۔ صفائی ستھرائی اور رنگ و روغن ہوگا تو ایک دم نکھر آئے گا۔ اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے، یہاں کا کام تم خود کروا لو یا میرے ذریعے ہونے دو۔"

قیصر نے صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "شمشو بھائی! مجھے تو ان کاموں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ آپ ہی مہربانی کر کے تمام کام مکمل کروا دیں۔"

"میاں! اس میں مہربانی کی کیا بات ہے۔" شمشو نے مذاق کے رنگ میں سنجیدہ بات کہہ ڈالی۔ "پیسے تو تمہارے ہی خرچ ہوں گے۔"

"ہاں، ہاں۔" قیصر نے گردن کو اثباتی جھٹکا دیا۔ "سارا خرچہ میں ہی اٹھاؤں گا۔ آپ کا یہی احسان کافی ہے کہ آپ اپنی نگرانی میں یہ کام کروا دیں۔"

شمشو نے افسانہ کا جادو چلا کر قیصر کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفلوج کر دیا تھا۔ اب اس کا دماغ پوری طرح شمشو کے قبضے میں تھا اور دل پر افسانہ کی حکمرانی تھی۔ شمشو نے موٹا موٹا حساب لگانے کے بعد کہا۔

"قیصر! تم مجھے اٹھائیس ہزار روپے فی الحال دے دو۔ کمی بڑھتی کا حساب بعد میں ہو جائے گا۔" پھر ایک کاغذ قیصر کی جانب بڑھا دیا۔ "میں اس رقم میں یہ کام کروا دوں گا۔"

قیصر نے کاغذات کے مندرجات کا جائزہ لیا۔ اس میں ٹیلی فون کی تنصیب، وال ٹو وال کارپٹ، ٹھنڈے گرم پانی کی لائنیں، مکمل رنگ و روغن اور مرمت، کچن کی سیٹنگ اور تمام ضروری برتن وغیرہ شامل تھا۔ قیصر نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں یہ رقم کل صبح آپ کو دے دوں گا شمشو بھائی!"

"اگر کوئی دشواری ہو تو ابھی رہنے دو۔" شمشو نے عام سے لہجے میں کہا۔ "بعد میں دے دینا۔ اپنے گھر کی بات ہے۔"

قیصر جلدی سے بولا۔ "نہیں شمشو بھائی! ایسی کوئی بات نہیں۔ میں بآسانی اتنی رقم ادا کر سکتا ہوں۔ آپ کل ہی سے فلیٹ پر کام شروع کروا دیں۔ جتنی جلدی یہ فلیٹ تیار ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"یہ بالکل ٹھیک کہا تم نے۔" شمشو نے کہا۔ "اس فلیٹ کی تیاری کے بعد ہی افسانہ دلہن بن کر یہاں آئے گی۔"

دلہن کے ذکر پر قیصر کا چہرہ گل گوں ہو گیا اور وہ نگاہ چرا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس موقع پر شمشو کے دل نے ایک نعرۂ فاتحانہ بلند کیا۔ "بکرا چھری کے نیچے آ چکا ہے۔ بس "اللہ اکبر" کرنے کی دیر ہے۔ پھر یہ خود بہ خود ہی "اناللہ" ہو جائے گا۔"

الغرض، دوسرے روز حسب وعدہ قیصر نے اٹھائیس ہزار روپے نقد شمشو کے حوالے کئے جس کے جواب میں شمشو نے پہلے سے تیار کردہ ایک اسٹامپ پیپر قیصر کے حوالے کر دیا۔ اس اسٹامپ پیپر پر کیڑا مکوڑا اردو تحریر میں چند سطریں گھسیٹی گئی تھیں۔ یہ تحریر شمشو ہی کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ پندرہ مارچ کو تیار فلیٹ قیصر کے حوالے کر دیا جائے گا۔ فلیٹ کا نمبر تیرہ ڈی درج تھا۔ تاہم یہ

فلیٹ کس بلڈنگ اور کس علاقے میں واقع تھا اس کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس اسٹامپ پیپر کے مضمون کا عنوان تھا۔ ''قبضہ لیٹر'' سب سے آخر میں شمشو نے اپنے دستخط کئے تھے۔ جن میں صرف انگریزی حرف ''ایس'' پڑھا جا رہا تھا۔ اس کے بعد اسپرنگ نما ایک لائن کھینچی ہوئی تھی۔ قیصر کے بقول یہ شمشو بھائی کے دستخط تھے۔ اس عجیب وغریب ''قبضہ لیٹر'' پر نہ تو کسی گواہ کے دستخط تھے اور نہ ہی نوٹری پبلک کی مہر وغیرہ۔ اقرار نامہ کی ایک نہایت ہی بھونڈی اور واہیات شکل تھی جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔

قیصر کا دل بھنگڑا ڈال رہا تھا اور وہ بے تابی سے پندرہ مارچ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس دوران میں گاہے بگاہے وہ ''یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی'' کے پھیرے بھی لگا رہا تھا جہاں اس کی جانِ جاناں مس افسانہ، حقیقت سے بہت دور اپنی اداؤں اور کھلی مہربانیوں سے اس کے دل کی دنیا تہ و بالا کرنے کے لئے موجود ہوتی تھی۔ پریس میں کام کرنے والے ورکرز نے ان دنوں قیصر میں کچھ نمایاں تبدیلیاں بھی محسوس کی تھیں۔ مثلاً وہ باقاعدگی سے شیو بنانے لگا تھا، مونچھوں اور بالوں پر سے خضاب کے اثرات کو زائل نہیں ہونے دیتا تھا۔ علاوہ ازیں اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی نوجوانوں جیسا بنا لیا تھا۔ پرانی کم قیمت رسٹ واچ کی جگہ چمچماتی نئی گھڑی اس کی کلائی پر نظر آنے لگی تھی۔ اس کے ساتھی پیٹھ پیچھے اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہتے تھے تاہم وہ منہ سامنے بات کرتے ہوئے محتاط رہتے تھے مبادا قیصر ان کی کسی حرکت سے جھڑک کر ناراض نہ ہو جائے۔

پندرہ مارچ کی صبح یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی پر جو واقعات پیش آئے وہ قیصر کی توقع کے برخلاف تھے۔ وہ فلیٹ کا قبضہ حاصل کرنے جب شمشو بھائی کے پاس پہنچا تو اس نے ایک اور نئی کہانی اس کے سامنے رکھ دی۔

''قیصر میاں!'' شمشو نے اپنائیت آمیز مشفقانہ لہجے میں کہا۔ ''فی الحال میں تمہیں فلیٹ کا قبضہ نہیں دے سکوں گا۔ امید ہے، تم مجھے اپنا سمجھ کر کچھ خیال نہیں کرو گے۔''

''خیر شمشو بھائی! آپ تو میرے بڑے بھائی کی طرح ہیں۔ میں آپ کی کسی بات کا برا کیسے منا سکتا ہوں؟'' قیصر نے فرمانبرداری سے کہا۔ ''مگر یہ بھی تو معلوم ہو کہ آخر قبضے کی راہ میں کیا رکاوٹ ہے؟''

''رکاوٹ بہت معمولی سی ہے۔'' شمشو نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔ ''دراصل میں ابھی تک فلیٹ میں کام شروع نہیں کروا سکا۔''

قیصر سارے کام شمشو کے ذمے لگا کر خود اس جانب سے بے پرواہ ہو گیا تھا۔ اس نے اس دوران میں فلیٹ پر ایک چکر بھی نہیں لگایا تھا۔ نئی صورتِ حال کے پیشِ نظر اس نے شمشو سے پوچھا۔ ''کام شروع نہ ہونے کی کوئی خاص وجہ ہے؟''

''ہاں، وجہ تو خاص ہی ہے قیصر میاں۔'' شمشو نے کہا۔ ''دراصل میرے کچھ رشتے دار ٹنڈو آدم

سے آئے ہوئے ہیں۔ یہاں کراچی میں ایک شخص کا آپریشن ہونا تھا۔ وہ رشتے دار خاصے دور کے ہیں۔ میں انہیں اپنے گھر میں نہیں ٹھہرا سکتا تھا اور انہیں لگ بھگ ایک ماہ کراچی میں قیام بھی کرنا تھا اس لئے میں نے انہیں تمہارے فلیٹ نمبر تیرہ۔ ڈی میں ٹھہرا دیا۔ وہ یکم اپریل کو فلیٹ خالی کر دیں گے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، مریض کا آپریشن کامیاب رہا۔ بس چند روز مزید قیام کے بعد وہ واپس ٹنڈو آدم چلے جائیں گے۔'' شمشو نے چند لمحے کا توقف کیا پھر قدرے معذرت خواہانہ آمیز لہجے میں بولا۔ ''یار قیصر! معاف کرنا، میں تمہیں ان حالات سے آگاہ نہ کر سکا۔ بس کیا کروں، پچھلے دنوں میں خاصا مصروف رہا ہوں۔ سوری قیصر میاں! میں نے اپنی کوتاہی سے اخلاقی جرم کیا ہے۔''

قیصر، شمشو کے مصنوعی جذباتی لہجے سے پسیج گیا، جلدی سے بولا۔ ''شمشو بھائی! آپ مجھ سے سوری کہہ کر مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں نے اس بات کو ذرا بھی محسوس نہیں کیا۔ آپ خواہ مخواہ اپنے دل پر کوئی دباؤ نہ ڈالیں۔ پندرہ مارچ نہ سہی، یکم اپریل سہی۔ میں چند روز مزید انتظار کر لوں گا۔''

افسانہ کے ہوشربا حسن اور قیامت خیز ناز و انداز نے قیصر کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بالکل بیدل کر دیا تھا ورنہ اس صورتِ حالات میں اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آنا چاہئے تھا کہ جب شمشو بھائی کے پاس اسی بلڈنگ میں اور بھی کئی فلیٹ خالی موجود ہیں تو پھر ٹنڈو آدم کے مصیبت زدگان کو تیرہ۔ ڈی ہی میں کیوں ٹھہرایا گیا۔ محبت اور عشق سب سے پہلے انسان کی عقل کو متاثر کرتے ہیں۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے...... کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا۔ قیصر، افسانہ کی افسانوی محبت میں گردن گردن دھنس چکا تھا اس لئے اس کے دماغ میں شمشو کی بدنیتی کا خیال آ ہی نہیں سکتا تھا۔

شمشو بھائی نے قیصر کے جواب میں کہا۔ ''یار! یکم اپریل کو تو وہ لوگ فلیٹ خالی کریں گے۔ بس تم مجھے تین چار دن اور دے دو، میں زیادہ مزدور لگا کر دن رات کام کرواؤں گا اور تمہیں ٹھیک پانچ اپریل کو تیار فلیٹ کی چابی دے دی جائے گی۔''

قیصر نے شمشو کی ٹیبل پر رکھے کیلنڈر پر نگاہ ڈالی اور چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''شمشو بھائی! پانچ اپریل کو تو اتوار پڑ رہا ہے۔ یہ تو چھٹی کا دن ہو گا۔''

''چھٹی کا دن ہو گا تو کیا ہوا۔'' شمشو نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہیں کہ میں اتوار کے روز بھی ایجنسی کھولتا ہوں۔ بس میں دو عیدین کی چھٹی کرتا ہوں باقی سال کے تین سو تریسٹھ دن میں کام کرتا ہوں۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''ایجنسی کے کھلنے یا بند ہونے سے تمہیں کیا فرق پڑتا ہے قیصر میاں! تم تو کسی بھی وقت میرے گھر آ سکتے ہو۔ اب چند روز بعد تم میرے گھر کے داماد یعنی بہنوئی بننے والے ہو۔''

شمشو کے آخری تجربہ خیز جملے نے اکسیر کا کام کیا۔ قیصر شرمانے یا لجانے کی بجائے خوشی سے

پھول گیا۔ اسی کیف و سرور کی کیفیت میں اس نے اس حقیقت کی جانب دھیان نہ دیا کہ شمشو کس خوب صورتی سے اسے بے وقوف پر بے وقوف بنائے جا رہا تھا۔

قیصر تصور میں افسانہ کا گھونگھٹ اٹھا رہا تھا جب شمشو کی پکار نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

''قیصر میاں! میں نے تمہیں ایک ''قبضہ لیٹر'' دیا تھا۔ وہ تم ساتھ لائے ہو؟''

''جی ہاں، وہ میری جیب میں ہے۔'' قیصر نے جواب دیا۔

''وہ میرے حوالے کر دو۔'' شمشو نے کہا۔ ''میں آج تمہیں نیا لیٹر دوں گا۔''

''شمشو بھائی! ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔'' قیصر نے افسانہ کو دوبارہ اپنے تصور میں سجاتے ہوئے کہا۔ ''ہم ایک دوسرے کے لئے غیر تھوڑی ہیں۔''

''میں تمہاری بات سے اتفاق کرتا ہوں قیصر!'' سمجھانے والے انداز میں شمشو نے بات جاری رکھی۔ ''ہم ہرگز ایک دوسرے کے لئے غیر یا ناقابل اعتبار نہیں ہیں۔ مگر یہ رسمی کارروائی بھی ضروری ہے۔ مجھے دفتری فائلوں کا پیٹ بھی بھرنا ہوتا ہے۔ ریکارڈ کی درستی کے لئے یہ اہم ہے۔ ویسے بھی لکھت پڑھت کوئی بری بات تو نہیں۔ اس سے کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان باقی نہیں رہتا۔''

شمشو کی باتوں نے قیصر کو اس کا مزید گرویدہ بنا دیا۔ اس کی نظر میں شمشو کی دیانت داری اور خلوصِ نیت کا گراف آسمان تک جا پہنچا اور بے چون و چرا اس نے ''قبضہ لیٹر'' شمشو کے حوالے کر دیا۔ شمشو نے مذکورہ لیٹر کو اپنی دراز میں رکھا اور وہیں سے ایک۔ اور تیار شدہ اسٹامپ پیپر نکال کر قیصر کی جانب بڑھا دیا۔ اس اسٹاپ پیپر کا عنوان تھا ''کنفرم قبضہ لیٹر'' گویا، قبل ازیں جو لیٹر قیصر کو دیا گیا تھا وہ ''جھانسا قبضہ لیٹر'' تھا۔

قیصر نے کنفرم قبضہ لیٹر کے مندرجات کا جائزہ لیا۔ تحریر شمشو ہی کی تھی۔ اس نے کیڑا مکوڑا الفاظ میں لکھا تھا...... ''یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی نے فیصلہ کیا ہے کہ قیصر صاحب کو فلیٹ نمبر تیرہ۔ ڈی کا کنفرم قبضہ پانچ اپریل کو دے دیا جائے۔ بالفرض اگر قیصر صاحب کو درج بالا تاریخ پر قبضہ نہیں ملتا تو ایجنسی انہیں دگنی رقم یعنی دو لاکھ سولہ ہزار روپے ادا کرے گی۔ یہ ہمارا پکا وعدہ ہے۔ چنانچہ قیصر صاحب بھی اس دوران میں اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ ہم سے قبل از وقت فلیٹ یا رقم کا مطالبہ نہ کریں۔'' آخر میں شمشو بھائی کے ''ایس'' والے معروف پیچیدہ دستخط موجود تھے۔ اس لیٹر پر بھی کسی قسم کے گواہ کا اندراج نہیں تھا اور نہ ہی اوتھ کمشنر کی سیل موجود تھی۔ گویا یہ ''ڈبل جھانسا قبضہ لیٹر'' تھا جس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں تھی۔

دوسری جانب قیصر کی نظر میں کاغذ کے اس ٹکڑے کی اتنی زیادہ قدر و قیمت تھی کہ اس نے اسی دن مذکورہ بوگس اسٹامپ پیپر کی پلاسٹک کوٹنگ بھی کروا لی تھی۔ اگر اس کا بس چلتا تو وہ اسے تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیتا۔

پندرہ مارچ کو قیصر لگ بھگ دوپہر کے وقت پریس پہنچا۔ اتفاق سے اس وقت نجمی صاحب، کاغذ کے ایک بیوپاری کے ساتھ لنچ کرنے قریبی ہوٹل چلے گئے تھے۔ پندرہ تاریخ کو قیصر کے ساتھی بھولے نہیں تھے۔ وہ اسے دیکھتے ہی سراپا سوال بن گئے۔

الیاس احمد نے استفسار کیا۔ ''قیصر بھائی! آج تو آپ کے فلیٹ کا قبضہ ملنا تھا شاید اسی لئے آپ کو کام پر آنے میں تاخیر ہوگئی ہے۔''

''ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آج آپ چھٹی کریں گے۔'' فرید خان نے کہا۔ ''کسی فلیٹ کا قبضہ حاصل کرنا معمولی بات تو نہیں۔''

''او جناب، قبضے شبضے کی باتیں چھوڑیں۔'' راجا ارشد نے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم، دوات میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''اصولی بات تو یہ ہے آج مٹھائی آنی چاہئے تھی۔''

الیاس احمد نے راجا ارشد کو سرزنش کی اور کہا۔ ''پہلے قیصر صاحب کا موقف تو سن لیں، مٹھائی کی بات بعد میں ہوگی۔ ہاں تو قیصر صاحب! کیا بنا قبضے کا؟''

قیصر نے اصل صورتِ حال کو نہایت ہی ہوشیاری سے خفیہ رکھتے ہوئے محتاط الفاظ میں انہیں بس اتنا ہی بتایا کہ قبضے کی تاریخ پندرہ مارچ سے تبدیل ہو کر پندرہ اپریل ہوگئی ہے۔ ''اب بدھ کے دن پندرہ اپریل کو اسے قبضہ ملے گا۔''

''اس تبدیلی کی وجہ؟'' الیاس نے دریافت کیا۔

اس سوال کا جواب قیصر پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اس نے کہا۔ ''دراصل ابھی وہاں کا کام مکمل نہیں ہو سکا۔ یا یوں سمجھ لیں کہ کام میری مرضی کے مطابق نہیں ہو سکا۔''

قیصر کا انداز خاصا مشکوک تھا، اس کے ساتھی سمجھ گئے کہ قیصر ان سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔ قیصر نے دانستہ پانچ اپریل کی بجائے انہیں پندرہ اپریل کا بتایا تھا تاکہ کم از کم ایک ماہ کے لئے تو ان کے منہ بند ہو جائیں۔

راجا ارشد نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے، یہ کام کبھی مکمل نہیں ہوگا۔ قیصر بھائی کی رقم ڈوبتی نظر آ رہی ہے۔''

''مجھے بھی اسی قسم کا خدشہ ہے۔'' فرید خان نے راجا ارشد کے خیال کی تصدیق کی۔

الیاس احمد نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا پھر کہا۔ ''قیصر بھائی! کہیں پندرہ اپریل سے پہلے ہی آپ کا قابل بھروسا پراپرٹی ڈیلر ٹین ڈبہ اٹھا کر کہیں اور نہ چلتا بنے۔ میرا تو مشورہ ہے، روزانہ ایجنسی کا ایک پھیرا ضرور لگا لیا کریں۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا الیاس صاحب!'' قیصر نے تیقن سے کہا۔ ''یہ بات صرف میں ہی جانتا ہوں کہ پراپرٹی ڈیلر کسی بھی صورت میں مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔''

الیاس احمد نے کہا۔ ''اللہ کرے، آپ کا اعتماد درست ثابت ہو۔ لیکن اگر آپ ناراض نہ ہوں تو میں آپ کو اسی قسم کا ایک سچا واقعہ سناتا ہوں۔''

''قیصر بھائی کیوں ناراض ہوں گے؟'' راجا ارشد نے کہا۔ ''آپ ضرور واقعہ سنائیں۔''

فرید خان نے کہا۔ ''واقعہ اگر سبق آموز اور عبرت اثر ہو تو ضرور سننا چاہئے۔''

الیاس نے قیصر کی طرف دیکھا اور مذکورہ واقعہ سنانے لگا۔

''جب ہم محمود آباد میں نئے نئے آ کر بسے تھے تو ہماری گلی کے کونے پر ایک ٹیلر کی نئی دکان کھلی تھی۔ ٹیلر ماسٹر نے اپنی دکان میں لگ بھگ دو درجن تیار سوٹ ٹانگے ہوئے تھے۔ وہ لیڈیز ٹیلر تھا۔ ان دنوں میٹھی عید سر پر تھی۔ میری بیوی نے کہا کہ اسی ٹیلر سے میں بھی دو تین سوٹ سلوا لیتی ہوں۔ اس کے پاس بالکل نئے ڈیزائن ہیں۔ میں نے کہا کوئی حرج نہیں، تم بھی سوٹ سلوا لو۔ اس ٹیلر ماسٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کسی شخص کو انکار نہیں کرتا تھا اور ہر آنے والے گاہک سے کپڑا لے کر رکھ لیتا تھا۔ جیسے جیسے عید نزدیک آ رہی تھی، اس کی دکان پر گاہکوں کا رش بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ اب دوسرے درزیوں نے بکنگ بند کر دی تھی۔ ہماری گلی والا ٹیلر سب کو ''ویل کم'' کہہ رہا تھا اور تقریباً ہر گاہک کو وہ کپڑوں کی واپسی کے لئے چاند رات کا وقت دے رہا تھا۔ ایسے موقع پر لوگ یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ آخر وہ درزی اتنے کم وقت میں اتنے زیادہ کپڑے کس طرح تیار کر پائے گا۔ بعض لوگ تو اس وعدے پر بھی کپڑے سلوانے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ انہیں عید کی صبح ہی کپڑے واپس ملیں گے۔'' الیاس نے چند لمحات رک کر سانس درست کی، پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''تو صاحب! ہوا یہ کہ وہ ٹیلر ماسٹر اچانک عید سے ایک روز قبل کہیں غائب ہو گیا۔ دکان پر تالا دیکھ کر جب لوگوں نے معاملے کی چھان بین کی تو پتہ چلا کہ وہ دکان چھوڑ چکا ہے۔ اس نے صرف عید کا سیزن لگانے کے لئے ایک ماہ کے لئے دکان کرائے پر لی تھی۔ لوگ جسے انتہائی ایماندار اور محنتی ٹیلر ماسٹر سمجھ رہے تھے، وہ ان کے کپڑے لے کر رفو چکر ہو گیا تھا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق وہ تقریباً ستر اسی سوٹ کا کپڑا لے کر فرار ہوا تھا۔ یقیناً اس ''معرکے'' کے بعد اس نے کسی دوسری جگہ جا کر ''لیڈیز کلاتھ اسٹور'' کھول لیا ہوگا۔'' الیاس نے معنی خیز نظروں سے قیصر کو دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''قیصر بھائی! کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا پراپرٹی ڈیلر بھی......''

الیاس احمد نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ قیصر نے پُرزور لہجے میں کہا۔ ''ایسا کبھی نہیں ہو سکتا جناب! میرا پراپرٹی ڈیلر بھروسے کا آدمی ہے۔''

قیصر کے ساتھیوں نے اتمام حجت کر کے دیکھ لیا تھا لیکن اس کی سوئی ایک ہی مقام پر رک چکی تھی یعنی اس کا پراپرٹی ڈیلر نہایت ہی ایماندار اور شریف انسان تھا۔ قیصر کے ساتھیوں نے خاموشی اختیار کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ قیصر کی غیر موجودگی میں فرید خان نے الیاس سے کہا۔

''میرا خیال ہے، ہمیں یہ سارا معاملہ نجمی صاحب کے گوش گزار کر دینا چاہئے۔ شاید وہی قیصر کو کچھ سمجھانے میں کامیاب ہو جائیں۔''

''کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' راجا ارشد نے کہا۔ ''یہ شخص کبھی نہیں سدھر سکتا۔''

الیاس احمد نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''فی الحال ہمیں اس ذکر کو فراموش کر دینا چاہئے۔ نجمی صاحب سے بھی اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کرنا چاہئے، خوامخواہ قیصر ہم سے ناراض ہو جائے گا۔ وہ پہلے ہی ہمیں تنبیہہ کر چکا ہے کہ نجمی صاحب کو خبر نہیں ہونی چاہئے۔ ویسے بھی ابھی اپریل میں پورا ایک مہینہ پڑا ہے۔ کوئی نہ کوئی بہتر صورت سامنے آ ہی جائے گی۔''

سب نے اس تجویز پر اتفاق کیا اور چپ سادھ کر بیٹھ گئے۔

قیصر نے بھی شکر بھیجا کہ اس کی جان چھوٹی مگر اس کی جان چھوٹنے کی بجائے ایک وبال میں پھنس گئی تھی۔ شمشو نے پانچ اپریل بروز اتوار فلیٹ کا قبضہ دینے کا عہد کیا تھا۔ اس نے اپنا عہد کچھ اس انداز میں پورا کیا کہ قیصر کو حوالہ پولیس کر دیا۔

شمشو کا موقف یہ تھا کہ قیصر نے فلیٹ خریدنے کے بہانے اس کی ایجنسی کے چکر کاٹنا شروع کر دیئے تھے۔ درحقیقت وہ ایجنسی پر کام کرنے والی ایک حسین وجمیل لڑکی افسانہ کے چکر میں تھا۔ شمشو نے اس بات کی بھی تردید کی تھی کہ قیصر نے کسی بھی سلسلے میں کوئی رقم اسے ادا کی تھی۔ قیصر نے ''کنفرم قبضہ لیٹر'' اور اسی ہزار روپے والی رسید کا ذکر کیا تو شمشو نے انہیں جعلی اور بوگس قرار دیا۔ افسانہ نے بھی پولیس کے سامنے یہی بیان دیا کہ قیصر جب بھی ایجنسی آتا تھا تو بھوکی نظر سے اسے دیکھتا رہتا تھا اور یہ کہ وہ موقع دیکھ کر اسے بے ہودہ اشارے بھی کرتا تھا۔ یہ تمام حالات قیصر کے خلاف جاتے تھے۔ اس پر طرہ یہ کہ قیصر کی گرفتاری کے لئے شمشو نے پولیس کی مٹھی میں پورے پانچ ہزار روپے بھی رکھ دیئے تھے۔ گویا ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے ہڑپ کرنے کے لئے صرف پانچ ہزار کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی۔ واضح رہے کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں مگر واقعات کے تسلسل کا خیال رکھتے ہوئے میں نے ترتیب وار بیان کر دیا ہے۔

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے قیصر کو حوالات میں پہنچا دیا تھا۔

☆☆☆

میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ فواد نجمی کا فون آ گیا۔ پہلے تو انہوں نے تاخیر سے فون کرنے کے لئے معذرت طلب کی، پھر انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''بیگ صاحب! مجھے بہت سی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ کیا حوالات میں قیصر سے آپ کی ملاقات ہو گئی؟''

میں نے اثبات میں جواب دیا اور پوچھا۔ ''نجمی صاحب! آپ کو کون سی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں؟''

''مجھے تو حیرت ہے، میں اب تک بے خبر کیوں تھا۔'' وہ تشویش ناک لہجے میں بولے۔

”میرے پریس کے ملازمین تو قیصر کے بارے میں کوئی اور ہی کہانی سنا رہے ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ کسی پراپرٹی ایجنٹ سے قیصر کا کوئی معاملہ چل رہا تھا جس کے نتیجے ہی میں یہ سب کچھ ہوا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کو درست بتایا گیا ہے۔ قیصر مجھے تمام حالات تفصیلاً بتا چکا ہے اس نے اپنے ساتھی ملازمین راجا ارشد، الیاس احمد اور فرید خان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ میرے خیال میں قیصر کو بے وقوف بنایا گیا ہے۔“

”نہ صرف بے وقوف بنایا گیا ہے بلکہ الٹا اسی کو تھانے میں بند بھی کروا دیا۔“ نجمی صاحب نے کہا۔ ”یہ تو سراسر زیادتی ہے۔ شمشو بھائی کو کیفرِ کردار تک پہنچنا ہی چاہئے نا۔“

میں نے کہا۔ ”بالکل پہنچنا چاہئے جناب۔ آپ مجھے بالتفصیل وہ باتیں بتائیں جو آپ کے علم میں آئی ہیں۔“

نجمی صاحب نے نہایت ہی جامع الفاظ میں مجھے حالات سے آگاہ کیا۔ جواب میں، میں نے بھی انہیں وہ باتیں بتائیں جو قیصر سے معلوم ہوئی تھیں۔ معلومات کے تبادلے کے بعد نجمی صاحب نے کہا۔

”بیگ صاحب! قیصر کو اس کی رقم واپس ملنی چاہئے۔“

میں نے کہا۔ ”نجمی صاحب! اگرچہ قیصر کی قانونی پوزیشن اس وقت خاصی کمزور اور نازک ہے تاہم مجھے امید ہے کہ اگر آپ پوری طرح تعاون کرنے پر تیار ہو جائیں تو حالات کو اپنی موافقت میں موڑا جا سکتا ہے۔“

نجمی صاحب نے کہا۔ ”میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار ہوں۔“

”بس تو پھر آپ کل شام میں اپنے ملازمین کو اپنے ساتھ لے کر میرے دفتر آ جائیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ان سے ملاقات کے بعد ہی کوئی راہ متعین کروں گا۔“

”وہ بے چارے کیا کریں گے بیگ صاحب؟“

”وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں ان سے ایسے کام لوں گا جو کسی کی نظر میں نہیں آئیں گے لیکن ان کاموں کے نتائج عدالت میں بہت مفید ثابت ہوں گے۔“

”عدالت میں؟“ نجمی صاحب حیرت سے بولے۔ ”کیا اس کے لئے ہمیں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا؟“

”ظاہر ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ”شمشو جیسے مکار اور عیار شخص کو گھیرنے کے لئے بڑے پاپڑ بیلنا پڑیں گے۔ ہم اس پر باقاعدہ فراڈ اور دھوکا دہی کا مقدمہ کریں گے۔“

”لیکن قیصر تو ابھی تک تھانے میں بند ہے۔“

”میرا خیال ہے، پولیس زیادہ دیر اسے اپنا ”مہمان“ بنا کر نہیں رکھے گی۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے ایس ایچ او پر صورت حال واضح کر دی تھی۔“

نجمی صاحب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے بیگ صاحب! میں کل شام میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔“

دو چار ضروری باتوں کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

آئندہ روز نجمی صاحب اپنے تمام ورکرز کے ساتھ میرے دفتر میں موجود تھے۔ تمام ورکرز سے میری مراد قیصر سمیت ہے۔ نجمی صاحب نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ ”بیگ صاحب! آپ کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ پولیس والوں نے آج دوپہر کو اسے چھوڑ دیا ہے۔“ اپنی بات ختم کر کے انہوں نے قیصر کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ”نجمی صاحب! شمشو ایک ہوشیار اور گرگ باراں دیدہ شکاری ہے۔ اس نے افسانہ کی مدد سے جس طرح قیصر کو ٹریپ کیا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ ایسے گھاگ اور منجھے ہوئے کلاکار سے نمٹنے کے لئے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا۔“

”سوچنے سمجھنے اور قدم اٹھانے کا کام آپ کریں بیگ صاحب! کیونکہ قانونی نکات اور باریکیوں سے ہم سب ناواقف ہیں۔ البتہ میں ہر قسم کے مالی تعاون کے لئے تیار ہوں۔ آپ کی پوری فیس کے علاوہ جو بھی عدالتی اخراجات ہوں گے، وہ میں ادا کروں گا۔ آپ بے فکر ہو کر سکون سے مقدمے کی تیاری کریں۔“

قیصر نے کہا۔ ”نجمی صاحب! اگر میری ڈوبی ہوئی رقم واپس مل جائے تو میں آپ کی خرچ ہونے والی تمام رقم آپ کو واپس کر دوں گا۔“

”انشاء اللہ! تمہاری رقم تمہیں ضرور ملے گی۔“ نجمی صاحب نے پُر وثوق انداز میں کہا۔ ”بیگ صاحب بہت بڑے وکیل ہیں۔ یہ شمشو بھائی کی ناک کے راستے تمہاری رقم اُگلوا لیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”نجمی صاحب! آپ نے مالی امور کی ذمے داری اپنے سر لے لی ہے۔ میں آپ کے تینوں ملازمین کو تین مختلف ڈیوٹیاں سونپ رہا ہوں۔ مجھے امید ہے، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”آپ ان سے کس قسم کی ڈیوٹی لینا چاہتے ہیں؟“

”یہ میں آپ کو فی الحال نہیں بتاؤں گا۔“

”چلیں، جیسے آپ کی مرضی۔“ وہ خوش دلی سے بولے۔ ”میں آپ سے اس بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔ میرے لئے اب کیا حکم ہے؟“

”آپ جانا چاہیں تو جا سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ قیصر کی بھی فی الحال ضرورت نہیں ہے۔“ پھر میں نے قیصر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”قیصر صاحب! آپ کل اسی وقت میرے پاس آ جائیں اور اپنے ساتھ وہ تمام کاغذات لے آئیں جو اس سلسلے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔“

”میرے پاس اسی ہزار کی ادائیگی والی رسید ہے یا پھر وہ اسٹامپ پیپر جس کا عنوان ہے کنفرم قبضہ لیٹر۔“ قیصر نے بتایا۔ ”اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگرچہ ان دونوں چیزوں کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ تاہم تم وہ مجھے ضرور

دکھاؤ۔ اور ہاں، تم سے کل کچھ ضروری امور پر بھی گفتگو کرنا چاہتا ہوں، خصوصاً افسانہ والے معاملے پر۔ یہ بات چیت تنہائی میں ہی ہوسکتی ہے۔''

قیصر نے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے وکیل صاحب! میں کل اکیلا ہی حاضر ہو جاؤں گا۔''

اس موقع پر ارشد، الیاس اور فرید نے ذومعنی نظروں سے قیصر کو دیکھا تھا تاہم نجمی صاحب کے دیکھنے کا انداز الجھن زدہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد نجمی صاحب قیصر کے ساتھ میرے دفتر سے رخصت ہو گئے۔''

اس کے بعد میں تقریباً دو گھنٹے تک باقی تین افراد کے ساتھ مصروف رہا۔ جب انہوں نے اپنی ذمہ داریاں بہ طریق احسن سمجھ لیں تو میں نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔ اب انہوں نے ایک ہفتے بعد باری باری میرے پاس آنا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ کامیاب لوٹیں گے۔ کیونکہ میں نے انہیں کوئی مشکل کام نہیں بتایا تھا

آئندہ روز قیصر اکیلا میرے پاس آیا۔ میں ایک گھنٹے تک اس سے مختلف سوالات کرتا رہا۔ وہ مجھے تسلی بخش جوابات دیتا رہا۔ میں نے اسے آئندہ لائحہ عمل سے آگاہ کیا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ میری ہدایت کے مطابق عمل کرے گا۔ نجمی صاحب کو بھی میں نے ایک نہایت ہی اہم کام سونپ دیا تھا۔ دو روز بعد انہوں نے یہ خوشخبری سنائی کہ کام ہو گیا ہے۔ مقررہ مدت کے اندر اندر پریس کے دیگر ملازمین نے بھی اپنی ذمے داریاں پوری کر دیں۔ میں نے ان سے پراپرٹی ایجنٹ شمس الدین عرف شمشو اور افسانہ کے بارے میں مختلف قسم کی معلومات اکٹھا کرنے کو کہا تھا۔ انہوں نے میری مرضی کے مطابق وہ کام کر دیا تھا۔ تاہم ان باتوں کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر آئے گا۔

اب میری تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ میں نے اگلے ہی روز بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ایک دھواں دھار نوٹس شمشو کی اسٹیٹ ایجنسی کے پتے پر روانہ کر دیا۔ مذکورہ نوٹس کا مضمون کچھ اس طرح تھا۔ میں یہاں نہایت سادہ الفاظ کا استعمال کر رہا ہوں۔

''میرے موکل قیصر محمود نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے مختلف حربوں اور حیلوں سے اسے فلیٹ دلوانے کا جھانسا دے کر لگ بھگ ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے ہتھیا لئے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ تم نے ایک موٹی رقم ہڑپ کر لی ہے بلکہ تم نے اس سادہ اور شریف آدمی کو پولیس کے حوالے بھی کر دیا۔ اس سے پہلے اسے زدوکوب بھی کیا۔ تمہارا یہ فعل سراسر غیر قانونی اور غیر اخلاقی ہے۔ میرے موکل نے مجھے کچھ ایسے ثبوت اور شواہد مہیا کئے ہیں جن کی بنا پر تمہارا جرم واضح ہو جاتا ہے۔ اگر تم عدالتی بکھیڑوں سے بچنا چاہتے ہو تو میرے موکل سے ہتھیائی ہوئی رقم عرصہ دس یوم کے اندر اسے واپس کر دو ورنہ تمہارے خلاف سخت قسم کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔''

اس کے علاوہ بھی نوٹس میں چند تکنیکی نوعیت کی باتیں تھیں جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں ہے۔

نوٹس کی ترسیل کے دوسرے روز شمشو بہ نفس نفیس میرے دفتر میں موجود تھا۔ وہ خاصا برہم دکھائی دیتا تھا۔ اس نے نوٹس والا لفافہ میری میز پر پٹخا اور اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

''یہ کارنامہ آپ نے انجام دیا ہے؟''

''کون سا کارنامہ؟'' میں نے بات سمجھنے کے باوجود لاتعلقی کا اظہار کیا۔

وہ غصے سے بولا۔ ''میں اس نوٹس کی بات کر رہا ہوں جو آپ کی جانب سے مجھے موصول ہوا ہے۔ آخر اس حرکت کا مقصد کیا ہے؟''

''ہر حرکت کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔'' میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ نے اس نوٹس کا مطالعہ کر لیا ہے تو مقصد آپ کی سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ بائی دا وے، آپ کی تعریف؟''

آخری جملہ میں نے اسے سلگانے کے لئے ادا کیا تھا۔ وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''میرا نام شمس الدین ہے۔ سب مجھے شمشو بھائی کہتے ہیں۔ میں یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی کا مالک ہوں۔''

''اوہ، تو آپ ہیں شمشو بھائی۔'' میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا، آپ خود میرے پاس آ گئے ورنہ آپ کو ناپنے کے لئے مجھے عدالت تک جانا پڑتا۔ کیا آپ رقم ساتھ لائے ہیں؟''

''کیسی رقم؟'' وہ تلملائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''میں نے آپ کے موکل سے ایک روپیہ نہیں لیا۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''میں ایک روپے کی نہیں، ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے کی بات کر رہا ہوں۔''

''وہ جھوٹا ہے، مکار ہے اور فریبی ہے۔'' شمشو نے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹنے والا رویہ اپناتے ہوئے کہا۔ ''اس نے آپ کے ساتھ غلط بیانی سے کام لیا ہے۔''

''اگر میرے موکل نے مجھ سے کوئی جھوٹ بولا ہے تو پھر حقیقت کیا ہے؟''

''حقیقت یہی ہے کہ میں نے اس سے کوئی دھیلا پیسہ نہیں لیا۔ وہ فلیٹ کی خریداری کا بہانہ بنا کر میری ایجنسی کے چکر کاٹتا رہا۔ بعد ازاں مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری ایک ورکر افسانہ کی خاطر وہاں آتا تھا۔ میں نے سختی سے ڈانٹ کر اسے بھگانے کی کوشش کی تو اس نے مجھ پر رقم کا الزام لگا دیا۔ جب اس نے ایجنسی میں باقاعدہ دنگا فساد شروع کیا تو مجھے مجبوراً اسے پولیس کے حوالے کرنا پڑا۔ بس اتنی سی بات ہے۔''

''اگر یہ اتنی سی بات ہے تو آپ میرے نوٹس کے جواب میں اس کا ذکر کر دیں۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''کیا آپ کے نوٹس کا جواب دینا ضروری ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اگر آپ نوٹس کا کوئی معقول اور تسلی بخش جواب نہیں دیں گے تو مجبوراً مجھے عدالت سے

رجوع کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر آپ کو استغاثہ کی جانب سے اٹھائے گئے ہر سوال کا جواب جج کے روبرو دینا ہوگا۔''

''آپ یہ بار بار عدالت کا ذکر کر کے مجھے دبانے کی کوشش نہ کریں۔'' وہ تڑخ کر بولا۔ ''میں ایسی دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔''

''میں نے آپ کو دبانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔'' میں نے اس کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ایسی کسی کوشش میں کامیاب ہو ہی نہیں سکتا، ماشاء اللہ خاصے صحت مند اور ہٹے کٹے نظر آرہے ہیں۔'' وہ میرے طنز کو سمجھا یا نہیں سمجھا، میں نے اس کی پرواہ کئے بغیر اپنی بات مکمل کر دی۔ ''میں آپ کو کسی نوعیت کی دھمکی نہیں دے رہا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر آپ کی جانب سے عدم تعاون کے آثار نظر آئے تو میرا موکل کل میرے کندھوں پر سوار ہو کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔''

وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''میں نے بہت کورٹ کچہری دیکھی ہے۔''

''یقیناً دیکھی ہوگی۔'' میں نے تصدیق کی۔ ''آپ ایک پراپرٹی ایجنٹ ہیں۔ زمین و جائیداد اور مکان و فلیٹ کی خرید و فروخت کی ذیل میں روزانہ آپ کا واسطہ عدالت یا اسی نوعیت کے قانونی کاموں سے پڑتا ہوگا۔ اس میں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

وہ میرے طنزیہ انداز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے اپنے نوٹس میں ذکر کیا ہے کہ آپ کے موکل قیصر نے آپ کو چند ثبوت اور شواہد مہیا کئے ہیں۔ کیا آپ ان کے بارے میں مجھے کچھ بتائیں گے؟''

''میں ایک پیشہ ور اور بہت مہنگا وکیل ہوں مسٹر شمشو!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''میرا وقت بہت قیمتی ہے۔ میں فضول قسم کے سوالوں کے جواب نہیں دیتا۔ اور خاص طور پر ایسی صورت میں جب سوال مخالف پارٹی کی جانب سے کیا جائے۔''

وہ قدرے نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ میری بات سمجھ نہیں سکے۔ دراصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ اگر شواہد و ثبوت سے آپ کی مراد قیصر کی مہیا کردہ بوگس رسید اور نقلی اسٹامپ پیپر ہے تو آپ خوامخواہ اپنا وقت اور اپنے موکل کا پیسہ ضائع کریں گے۔ اس کی بناء پر آپ عدالت میں کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔''

''مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''آپ عرصہ دس یوم...... جواب صرف آٹھ یوم رہ گئے ہیں، ان کے اندر اندر قیصر کی رقم لوٹا دیں ورنہ اس صورت حال کے لئے تیار ہو جائیں جو نوٹس میں بیان کی گئی ہے۔''

وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پھر پاؤں پٹختے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کو بھی دیکھ لوں گا۔'' اس کے بعد وہ میرے دفتر سے نکل گیا۔

آئندہ چند یوم میں، میں فائٹ کی مکمل تیاری کر چکا تھا۔ شمشو کو دیئے گئے نوٹس کی مدت ختم ہونے کے بعد میں نے مقدمہ عدالت میں لگا دیا۔

کسی بھی مقدمے کی ابتدائی عدالتی کارروائی کے بارے میں پہلے بھی دسیوں مرتبہ بتایا جا چکا ہے بلکہ اٹھارہ بیس سال سے بتایا جا رہا ہے اس لئے میں غیر اہم اور غیر ضروری کارروائی کو حذف کرتے ہوئے صرف شمشو، افسانہ اور اسٹیٹ ایجنسی کے ملازم سلیم کے بیانات کا یہاں ذکر کروں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتا چلوں کہ استغاثہ کی جانب سے نجمی صاحب، فرید خان، الیاس احمد، راجا ارشد اور قیصر کے کورنگی والے پڑوسی وصی الدین کا بیان بھی شامل تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ میرا موکل ایک انتہائی شریف، ایماندار اور محنتی شخص ہے اور یہ کہ وہ کوئی فراڈ کر سکتا ہے اور نہ ہی لڑکیوں وغیرہ کے چکر میں پڑ سکتا ہے۔ تاہم اس قسم کی باتوں کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہونا تھا۔ اصل معاملہ تو شمشو کو جھوٹا ثابت کرنے کا تھا اور اس سلسلے میں، میں نے مکمل بندوبست کر رکھا تھا۔

⁂☆⁂

منظر سیشن کورٹ کے ایک کمرے کا تھا اور کٹہرے میں ''یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی'' کا ملازم سلیم کھڑا تھا۔ اس کا مختصر بیان عدالت کے ریکارڈ پر موجود تھا۔ اس کی حیثیت صفائی کے گواہ کی تھی۔ مجھ سے پہلے وکیل صفائی اس پر طبع آزمائی کرتا رہا، پھر میری باری آئی۔

میں اپنی مخصوص نشست سے اٹھ کر گواہ کے کٹہرے کے قریب آگیا پھر جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اپنی جرح کا آغاز کیا۔

''سلیم صاحب!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ مذکورہ اسٹیٹ ایجنسی پر کتنے عرصے سے کام کر رہے ہیں؟''

میں نے جواب دیا۔ ''جب سے یہ ایجنسی کھلی ہے۔''

''اور یہ ایجنسی کب سے کام کر رہی ہے؟'' میں نے الفاظ ایجنسی اور کام پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''لگ بھگ دو سال سے۔''

''اس سے پہلے آپ کہاں کام کرتے تھے؟''

میں جان بوجھ کر ہلکے پھلکے سوالات کر رہا تھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''ایک دوسری ایجنسی پر۔ جو میٹروول میں ہے۔''

''آپ کی رہائش کہاں پر ہے؟''

''اورنگی ٹاؤن میں۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی میں کس نوعیت کا کام کرتے ہیں؟''

''میں عموماً گاہکوں کو مکان و فلیٹ وغیرہ دکھانے لے جاتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اس

کے علاوہ شمشو بھائی جو بھی کام بتا دیں۔''

''میرے موکل نے مجھے بتایا ہے کہ وہ بھی آپ کی ایجنسی پر ایک فلیٹ خریدنے ہی کے سلسلے میں گیا تھا۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے اسے بھی کوئی فلیٹ دکھایا تھا؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! قیصر کو فلیٹ دکھانے خود شمشو بھائی گئے تھے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ جو فلیٹ میرے موکل کے ہاتھ فروخت کیا جا رہا تھا اس کا مالک شمشو ہے۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اضافہ کیا۔ ''میں فلیٹ نمبر تیرہ۔ ڈی کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں فلیٹ کی ملکیت کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس بلڈنگ میں میرے موکل کو فلیٹ دکھایا گیا تھا وہاں کے اکثر فلیٹ شمشو کی ملکیت ہیں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''جنہیں وہ ایک ایک کر کے فروخت کر رہا ہے؟''

وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں بتا چکا ہوں کہ فلیٹ کی ملکیت کا مجھے علم نہیں ہے۔''

میں نے ذرا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''سلیم صاحب! اچھا یہ بتائیں، فلیٹ نمبر تیرہ ڈی میرا موکل کتنے میں خرید رہا تھا؟''

''ایک لاکھ اسی ہزار روپے میں۔'' اس نے کھٹ سے جواب دیا۔ ''اسی ہزار نقد اور ایک لاکھ آسان اقساط میں۔''

میں نے لوہا گرم دیکھتے ہوئے ایک اور چوٹ لگائی۔ ''سلیم صاحب! میرے موکل کا دعویٰ ہے کہ اس نے اسی ہزار کی ادائیگی کر دی تھی۔ کیا رقم کے لین دین کے وقت آپ موقع پر موجود تھے؟''

''نہیں جناب!'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میرا خیال ہے، قیصر نے کوئی رقم ادا نہیں کی تھی۔''

''آپ کے اس خیال کا سبب کیا ہے؟''

''یہ بات مجھے شمشو بھائی نے بتائی تھی۔''

''گویا آپ ادائیگی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب فلیٹ کی پیشگی ادائیگی اسی ہزار روپے سے ہے؟''

''جی...... میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''آپ خاصے بے خبر پیشہ در ہیں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

وہ خاموش نظر سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے اگلا سوال کیا۔ ''سلیم صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ پانچ اپریل بروز اتوار جب یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی پر وہ واقعہ پیش آیا تو آپ اس وقت وہیں

موجود تھے؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بیان دیا ہے۔''

''اس روز کیا ہوا تھا؟''

''ہونا کیا تھا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ''قیصر نے آ کر عجیب بات بتائی کہ اسے فلیٹ کا قبضہ چاہئے۔ ساتھ ہی اس نے ایک کنفرم لیٹر بھی دکھایا۔ مجھے تو حیرت ہوئی کہ یہ سودا کب کنفرم ہو گیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ قیصر فلیٹ کے سلسلے میں گاہے بگاہے ایجنسی کا چکر لگاتا رہتا تھا لیکن میرے خیال میں کسی فلیٹ کا سودا ابھی ہوا نہیں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، میرے موکل کا دعویٰ جھوٹا تھا؟''

''ظاہر ہے۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''اور وہ تمام ثبوت بھی جھوٹے ہیں جو وہ وقوعہ کے روز پیش کر رہا تھا یعنی اسی ہزار کی ادائیگی کی رسید اور کنفرم قبضہ لیٹر وغیرہ؟''

''بالکل جھوٹ۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ دونوں چیزیں دیکھی تھیں۔ مجھے تو وہ نقلی اور بوگس معلوم ہوئی تھیں۔ شمشو بھائی نہ تو اس قسم کی رسید دیتے ہیں اور نہ ہی قبضہ لیٹر کی تحریر اور مضمون اس نوعیت کا ہوتا ہے۔ میں کافی عرصے سے اس فیلڈ میں ہوں۔ اس قسم کی قانونی تحریریں عموماً گواہوں کی موجودگی میں تیار کی جاتی ہیں اور مضمون انگریزی میں ٹائپ شدہ ہوتا ہے۔ پھر ایک اور بھی خاص بات ہے اور وہ یہ کہ شمشو بھائی اپنے دستخط اردو میں کرتے ہیں جبکہ قیصر کی پیش کردہ دونوں نقلی تحریروں پر شمشو بھائی کے نقلی دستخط انگریزی میں گھسیٹے گئے تھے۔''

گواہ سلیم نے میرے موکل کے خلاف اور ملزم کے دفاع میں اچھی خاصی تقریر کر ڈالی تھی۔ وہ صفائی کا گواہ تھا اس سے اسی بات کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں نے سلسلہ سوالات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سلیم صاحب! شمشو بھائی نے میرے موکل پر الزام لگایا ہے کہ وہ ایجنسی کی ایک ملازم مس افسانہ کی خاطر وہاں آتا تھا۔ اس سلسلے میں آپ کیا کہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے، قیصر ہماری ایجنسی پر فلیٹ کے سلسلے ہی میں آیا تھا مگر بعد میں وہ افسانہ کے چکر میں پڑ گیا بلکہ وقوعہ کے روز تو اس نے حد ہی کر دی تھی۔''

''مثلاً کیا حد کر دی تھی؟'' میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

وہ بولا۔ ''پہلے تو اس نے فلیٹ کے قبضے کی بات کی۔ شمشو بھائی نے اس کے جھوٹے دعوے کو ٹھکرایا تو وہ افسانہ کے حوالے سے بڑی بڑی باتیں کرنے لگا۔ شمشو بھائی نے سخت رویہ اختیار کیا تو قیصر باقاعدہ مارنے مرنے پر آمادہ نظر آنے لگا۔ بلکہ اس نے شمسو بھائی پر ہاتھ بھی اٹھا دیا تھا۔ وہ اس وقت شدید طیش کے عالم میں تھا۔ میں بیچ بچاؤ کے لئے آگے بڑھا تو وہ مجھ سے الجھنے لگا۔ پھر

شمشو بھائی نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔"

"اور اس سے قبل آپ لوگوں نے اس کی اچھی خاصی مرمت بھی کر ڈالی تھی۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ "دست و گریباں والے معاملات میں ایسا تو ہو ہی جاتا ہے جناب۔ اگر ہم اسے قابو کرنے کے لئے دو چار ہاتھ نہ لگاتے تو وہ خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیتا۔ وہ بار بار مس افسانہ کی جانب بڑھ رہا تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "مس افسانہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"کیسا خیال جناب؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ بتایا جا رہا ہے، میرا موکل مس افسانہ میں دلچسپی لے رہا تھا تو کیا مس افسانہ بھی اس معاملے میں ملوث تھیں؟"

"میں نے مس افسانہ کو کبھی قیصر کی حوصلہ افزائی کرتے نہیں دیکھا۔" سلیم نے جواب دیا۔ "میرے خیال میں یہ یک طرفہ معاملہ تھا۔"

میں نے پوچھا۔ "سلیم صاحب! کیا کبھی قیصر نے ایجنسی پر افسانہ کے ساتھ کوئی نازیبا حرکت بھی کی تھی؟"

"میں ایسے کسی ناخوشگوار واقعے کا شاہد نہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "سلیم صاحب! آپ یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی پر ایک ملازم کی حیثیت سے کام کرتے ہیں مگر سننے میں آیا ہے کہ شمشو بھائی آپ کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے ہیں۔ کیا یہی رویہ ان کا دوسرے ملازمین کے ساتھ بھی ہے؟"

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ "سنا ہے، وہ مس افسانہ کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتے ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ نے بالکل درست سنا ہے۔"

"یعنی مس افسانہ شمشو بھائی کی سگی بہن نہیں ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

"دیکھیں جناب! یہ ٹھیک ہے کہ شمشو بھائی اپنے ملازمین کو بہن بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔" سلیم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم ان کے سگے بہن بھائی ہو گئے۔"

میں نے کہا۔ "میرے موکل کو تو شمشو نے یہی کہا تھا کہ افسانہ اس کی چھوٹی بہن ہے اور یہ کہ وہ افسانہ کی شادی قیصر یعنی میرے موکل سے کرنا چاہتا ہے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

"میں اس بارے میں صرف یہی کہوں گا کہ آپ کا موکل دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔"

سلیم نے پورے وثوق سے کہا۔ "جہاں تک میری معلومات اور مشاہدہ ہے، شمشو بھائی نے آپ کے موکل سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔" ایک لمحے کے توقف سے اس نے بتایا۔ "یہ بات ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ میری طرح افسانہ بھی ایک ملازم کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری شمشو بھائی سے کوئی رشتے داری نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "سلیم صاحب! آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ افسانہ کہاں رہتی ہے؟"

"جی ہاں، بالکل معلوم ہے۔" وہ سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ "مس افسانہ کی رہائش گارڈن میں ہے۔"

"گارڈن ایسٹ یا ویسٹ؟"

"ویسٹ۔"

"اور شمشو بھائی کی رہائش کہاں پر ہے؟"

"گارڈن ایسٹ میں۔" اس نے جواب دیا۔

"یعنی دونوں کے گھروں کے درمیان نشتر روڈ حد فاصل کا کام کرتی ہیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "ورنہ دونوں کی رہائش ایک ہی علاقے میں ہے؟"

"آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس دن بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

✲✫✲

صفائی کی گواہ مس افسانہ نے حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد وکیل صفائی نے اس سے چند سوالات کیے۔ مقصد ان سوالات سے صرف یہ ثابت کرنا تھا کہ شمشو بھائی انتہائی خدا ترس، شریف اور ایماندار انسان تھا اور یہ کہ قیصر ہاتھ دھو کر افسانہ کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ بحالت مجبوری شمشو کو اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنا پڑا تھا۔

وکیل صفائی اپنی جرح مکمل کر چکا تو میں سوالات کے لئے وٹنس باکس میں کھڑی افسانہ کے نزدیک آ گیا۔ میں نے اپنی جرح کا آغاز کرتے ہوئے پوچھا۔

"مس افسانہ! کیا میں آپ کو مس کہنے کی جرأت کر سکتا ہوں؟"

"آپ مجھے مخاطب کرتے ہوئے مس کا لفظ استعمال کر چکے ہیں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ "اب کون سی جرأت کی بات کر رہے ہیں آپ؟" اس کا انداز جارحانہ تھا۔ افسانہ کی عمر لگ بھگ بائیس سال تھی۔ وہ ایک دبلی پتلی اور انتہائی خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے حسن میں ایک تازگی اور شگفتگی پائی جاتی تھی۔ چہرے کے نقوش تیکھے اور پرکشش تھے۔ کوئی بھی صاحب دل اسے ایک نظر دیکھ کر گھائل ہو سکتا تھا۔ قیصر اگر اس پر فدا ہو گیا تھا تو اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس عمر

میں تو انسان کچھ زیادہ ہی حسن پرست ہو جاتا ہے اور خاص طور پر وہ انسان جو عمر کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد بھی کنوارا ہو۔

افسانہ کے جارحانہ انداز کا جواب میں نے اس سوال سے دیا۔ ''مس افسانہ! میں آپ کو مس افسانہ کہہ کر اس لئے مخاطب کر رہا ہوں کہ دنیا والوں کے سامنے یا کم از کم آدھی دنیا کے سامنے تو ابھی تک مس ہی ہیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہی ہیں نا؟''

میرے اس سوال پر افسانہ نے ہراساں نظر سے پہلے شمشو بھائی اور پھر وکیل صفائی کی جانب دیکھا۔ وکیل صفائی فوراً اس کی مدد کو لپکا۔ اس نے چیختے ہوئے کہا۔

''آبجیکشن یور آنر! وکیل استغاثہ خوامخواہ معزز گواہ کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ آدھی دنیا اور پوری دنیا کا زیر سماعت کیس سے کیا تعلق ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آدھی اور پوری دنیا کے حوالے کا تعلق براہ راست صفائی کی گواہ مس افسانہ سے ہے۔ اس لئے میرا سوال لاتعلق نہیں ہے اور آپ اسے غیر متعلق بھی نہیں کہہ سکتے۔''

کٹہرے میں کھڑی افسانہ نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ اپنے سوال کو آسان الفاظ میں دہرائیں۔ دراصل میں سمجھ نہیں پائی ہوں کہ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں۔''

میں نے ذرا مختلف زاویے سے اپنا سوال دہرایا۔ ''مس افسانہ! آپ کی حقیقت کیا ہے؟''

''میں ایک حقیقت ایک افسانہ ہوں۔'' وہ میرے چہرے پر نظر جماتے ہوئے بولی۔

میں نے کہا۔ ''آپ کی رہائش کس علاقے میں واقع ہے؟''

''میں گارڈن میں رہتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''گارڈن ایسٹ میں۔''

''گارڈن ایسٹ میں آپ کب سے رہ رہی ہیں؟''

''تقریباً دو سال سے۔''

''قبل ازیں آپ کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں تھی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

افسانہ نے جواب دیا۔ ''کھارادر میں۔''

''رہائش کی تبدیلی کی وجہ کیا تھی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بے ساختہ بولی۔ ''شادی کے بعد لڑکیوں کی رہائش تبدیل ہو ہی جایا کرتی ہے۔''

''پوائنٹ ٹو بی نوٹیڈ یور آنر۔'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے جوشیلے لہجے میں کہا پھر دوبارہ افسانہ کے نزدیک آ کر سوال کیا۔ ''تو گویا آپ کی شادی ہو چکی ہے مس افسانہ؟'' مس افسانہ کے الفاظ پر میں نے خصوصی زور دیا تھا۔

وہ بوکھلا گئی، برہمی سے بولی۔ ''آپ کو میری شادی سے کیا مطلب؟''

وکیل صفائی اس موقع پر فوراً اس کی دادرسی کے لئے آگے بڑھا اور جج کو مخاطب کرتے ہوئے

تیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! وکیل استغاثہ گواہ سے انتہائی ذاتی نوعیت کے سوال پوچھ کر اسے ذہنی انتشار کا شکار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی میرے فاضل دوست معزز عدالت کا قیمتی وقت بھی برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسا کرنے سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔''

میں نے جج کی طرف دیکھا، جج نے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ٹو دی پوائنٹ سوال کریں۔''

گویا جج نے وکیل صفائی کے اعتراض کو اہمیت دی تھی۔

جج کا یہ رویہ مجھے پسند نہ آیا تاہم میں اس بات سے مطمئن تھا کہ میرے کہنے پر اس نے خاص پوائنٹ نوٹ کر لیا تھا۔

''دیٹس او کے یور آنر۔'' میں نے گردن کو ہلکا سا خم دے کر نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ پھر وٹنس باکس میں کھڑی افسانہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''افسانہ صاحبہ!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اب میں آپ کو مس افسانہ کے بجائے محترمہ افسانہ یا افسانہ صاحبہ کہہ کر مخاطب کروں گا۔ آپ کو یا آپ کے وکیل صاحب کو اس طرز تخاطب پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

وکیل صفائی نے میرے اس سوال پر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ افسانہ نے کہا۔

''آپ مجھے افسانہ صاحبہ کہہ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''افسانہ صاحبہ! میرا موکل لگ بھگ چار ماہ پہلے پہلی مرتبہ آپ کی ایجنسی پر فلیٹ خریدنے کی غرض سے آیا تھا۔ کیا میرا اندازہ درست ہے؟''

''آپ کا اندازہ ایک بٹا دو درست ہے۔'' اس نے ٹھہرے سے لہجے میں جواب دیا۔

''ایک بٹا دو کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ''ایک بٹا ایک کیوں نہیں؟''

وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔ ''وہ اس لئے کہ آپ کے اندازے یا بیان کا پہلا حصہ درست ہے یعنی آپ کا موکل قیصر محمود چار ماہ قبل ہی پہلی مرتبہ فلیٹ خریدنے ہمارے یہاں آیا تھا مگر اس کے بیان کا دوسرا حصہ بالکل غلط ہے یعنی ''یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی'' میری نہیں ہے۔ میں وہاں پر صرف ایک ملازم کی حیثیت سے کام کرتی ہوں جبکہ آپ نے ''آپ کی ایجنسی'' کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔''

وہ الفاظ سے کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی، میں نے کہا۔ ''چلیں، آپ کے بیان کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ آپ شمشو بھائی کی ایجنسی پر ایک ملازم کی حیثیت سے کام کرتی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ شمشو بھائی آپ کو اپنی چھوٹی بہن سمجھتے ہیں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

میرے اس سوال پر افسانہ کا چہرہ متغیر ہو گیا تاہم وہ جلدی سے خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''اگر شمشو بھائی مجھے یا کسی بھی ملازم کو اپنا بھائی یا بہن سمجھتے ہیں تو آپ کو اس میں کیا اعتراض ہے؟''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے افسانہ صاحبہ!'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا، پھر پوچھا۔
''کیا شمشو بھائی نے میرے موکل سے آپ کا تعارف اپنی چھوٹی بہن کی حیثیت سے ہی کروایا تھا؟''
''میں نہیں جانتی، شمشو بھائی نے آپ کے موکل سے کیا کہا تھا اور کیا نہیں کہا تھا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولی۔
''آپ یہ تو جانتی ہوں گی افسانہ صاحبہ!'' میں نے ترش لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''کہ میرا موکل آپ میں دلچسپی لے رہا تھا؟''
''اس کے دلچسپی لینے سے مجھے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔''
''مگر شمشو بھائی کو تعلق واسطہ تھا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''وہ آپ کو اپنی چھوٹی بہن ظاہر کر کے قیصر سے آپ کی شادی کی بات کر رہے تھے۔''
''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولی۔
''افسانہ صاحبہ!'' میں نے با آواز بلند اسے مخاطب کیا۔ ''آپ نے معزز عدالت کو جو بیان دیا ہے، اس میں یہ بات فاضل وکیل کی بھی شامل ہے کہ میرا موکل ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ گیا تھا اس لئے مدعا الیہ شمشو بھائی کو اس کے ساتھ سخت رویے کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ سخت رویے کا مظاہرہ تو میں نے نہیں دیکھا تاہم اس رویے کے نتائج سے میں بے خبر نہیں ہوں۔ آپ اس وقت معزز عدالت کے روبرو یہ بتائیں کہ ''پیچھے پڑ گیا تھا ہاتھ دھو کر میرا موکل آپ کے'' سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ''ان الفاظ کا مطلب اتنا مشکل نہیں ہے کہ آپ کو مجھ سے پوچھنا پڑے۔ تاہم میں آپ کے سوال کے جواب میں یہی کہوں گی کہ آپ کا موکل جان و دل سے مجھ پر فدا ہو گیا تھا اسی لئے وہ بار بار ایجنسی کے چکر لگاتا تھا۔''
''اور آپ کو اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا؟''
''جی ہاں، مجھے آپ کے موکل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔''
''مگر شمشو بھائی خوب دلچسپی لے رہے تھے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''وہ ایک طرف تو میرے موکل کو فلیٹ دلوانے کا جھانسا دے کر ایک بڑی رقم اس سے بٹور چکے تھے اور دوسری جانب انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی چھوٹی بہن کی یعنی آپ کی شادی اس سے کر دیں گے۔''
''میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، میرا ان معاملات سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''جو کچھ شمشو بھائی نے کیا ہے اور کہا ہے، وہ آپ انہی سے پوچھیں۔''
''ان سے بھی پوچھا جائے گا۔'' میں نے اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہ بتائیں کہ اپنے ''مختصر عشق'' کے دوران میں میرے موکل نے آپ سے کوئی چھیڑ چھاڑ تو نہیں کی؟''

وکیل صفائی میرے اس سوال پر اچھل پڑا۔ ''آبجیکشن یور آنر!''
''آپ کو کس بات پر اعتراض ہے وکیل صاحب؟'' جج نے وکیل صفائی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔
''جناب عالی!'' وکیل صفائی نے ٹپٹائے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''وکیل استغاثہ تاخیری حربے استعمال کر کے معزز عدالت کا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں اور اس کام کے لئے یہ خاصے مشہور بھی ہیں۔''
میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''میں نے ابھی تک معزز عدالت کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر حقائق کو سامنے لانا تاخیری حربوں میں شمار ہوتا ہے تو مجھے فاضل وکیل کی اس سوچ پر سخت افسوس ہے۔ شاید وہ ذہنی طور پر کسی قسم کے انتشار یا خلجان کا شکار ہیں۔''
وکیل صفائی نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حقائق کو سامنے لانے کا یہ کون سا طریقہ ہے۔ آپ تو بال کی کھال کھینچ رہے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! بال کی کھال اتارنے ہی سے عمیق حقائق سامنے آتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ سچائی کو منصۂ شہود پر لانے کے لئے ہر وکیل کا اپنا طریقہ کار ہوتا ہے۔ ممکن ہے، آپ اس کام کے لئے میرے برخلاف کھال کے بال کھینچتے ہوں۔''
وہ میری اس چوٹ پر تلملا کر رہ گیا، بپھرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کا طریقہ دنیا سے نرالا ہے کیا۔ عدالت میں اس وقت جس مقدمے کی سماعت ہو رہی ہے، اس کا تعلق قیصر اور اس کے ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے سے ہے۔ آپ کے موکل کا دعویٰ ہے کہ میرے موکل نے اسے فلیٹ دلوانے کا جھانسا دے کر اس سے ایک بڑی رقم اینٹھ لی ہے۔ جبکہ میرا موکل ایسی کسی رقم اور اس کی ادائیگی سے صاف انکاری ہے۔'' وہ ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اور آپ صفائی کی گواہ سے مسلسل قیصر کے عشق کے بارے میں سوالات کر رہے ہیں۔ ہے نا عجیب بات؟''
''بات تو عام سی اور منطقی ہے بلکہ اسے برمحل کہنا چاہئے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اب اس کا کیا علاج کہ آپ کو عجیب سی لگ رہی ہے۔''
''اس کا علاج بھی آپ ہی بتا دیں۔'' وہ جلے بھنے لہجے میں بولا۔
میں نے اس شارٹ پچ ڈلیوری کو ہک کرنا فرض اولین سمجھا اور گیند کو چھ رن کے لئے باؤنڈری لائن سے باہر پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! اس کا علاج بہت سہل ہے۔ آپ صبح، شام خمیرہ بادام ایک چھوٹی چمچی کچھ دن باقاعدگی سے لیں۔ انشاء اللہ بہت فائدہ ہوگا اور اگر اس کے ساتھ دوالمسک بھی شامل کرلیں تو کیا کہنے، لطف دوبالا ہو جائے گا۔''
وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''بادام کا استعمال تو غالباً یادداشت کی کمزوری کو رفع کرنے کے

لئے کیا جاتا ہے۔''

''بجا فرمایا آپ نے۔'' میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔''آپ میرا اشارہ بخوبی سمجھ گئے ہیں۔ آپ کی یادداشت میں یہ بات ضرور ہونی چاہئے کہ قیصر کا مختصر عشق اور فلیٹ کی خریداری کا سلسلہ آپس میں مربوط اور منسلک ہیں، بالکل کسی زنجیر کی دو کڑیوں کی مانند۔ اس لئے جب ایک مسئلہ زیر بحث آئے گا تو دوسرے کا تذکرہ بھی یقیناً ہوگا۔''

جج ہماری اس بحثا بحثی کو موقوف کرنے کی غرض سے بولا۔''آپ دونوں صاحبان آپس کی نوک جھوک کو فراموش کر کے مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔''

جج کی ہدایت پر وکیل صفائی نے برا سا منہ بنایا تاہم میں نے ''اوکے یور آنر'' کہتے ہوئے اپنا روئے سخن کٹہرے میں کھڑی صفائی کی گواہ افسانہ کی جانب موڑ لیا۔''افسانہ صاحبہ! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا؟''

''آپ دونوں حضرات کی بحث و تکرار میں، میں آپ کا سوال یاد نہیں رکھ سکی۔'' افسانہ نے بے چارگی سے کہا۔

''میں سوال دہراتا ہوں۔'' میں نے معتدل لہجے میں کہا۔''میرے موکل قیصر محمود نے اپنے ''مختصر عشق'' کے دوران میں آپ سے کوئی چھیڑ چھاڑ تو نہیں کی تھی افسانہ صاحبہ؟''

''وہ مجھے دیکھ کر ناشائستہ حرکات تو کرتا رہتا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔''تاہم کوئی بڑا پھڈا کھڑا نہیں ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔''افسانہ صاحبہ! صفائی کے ایک معزز گواہ اور یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی کے ملازم سلیم کا بیان ہے کہ میرے موکل نے ایجنسی پر اپنی آمد و شد کے دوران میں کبھی آپ کو تنگ کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی کوئی نازیبا حرکت کی تھی؟''

''ایسے کام علی الاعلان نہیں کئے جاتے۔'' وہ تنک کر بولی۔''آپ کا موکل نگاہوں ہی نگاہوں میں مجھے قابل مذمت اشارے کرتا تھا۔ میں اس کی ان حرکتوں سے عاجز تھی۔ شمشو بھائی سے میں نے اس کا ذکر کیا تو وہ کہنے لگے، میں قیصر کو سمجھاؤں گا۔ مگر اس کا موقع ہی نہیں آیا۔ پانچ اپریل کو وقوعہ کے روز آپ کے موکل نے ایجنسی میں وہ ہنگامہ مچایا کہ بحالت مجبوری اسے پولیس کے حوالے کرنا پڑا تھا۔''

میں نے سلسلہ سوالات کو سمیٹتے ہوئے پوچھا۔''شمشو بھائی اپنے دستخط اردو میں کرتے ہیں یا انگریزی میں؟''

''اردو میں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔''شمشو بھائی نے میرے موکل کو جو رسید اور قبضہ لیٹر دیا تھا اس پر تو شمشو بھائی نے دستخط اردو کے بجائے انگریزی میں کئے تھے۔ یہ کیا معمہ ہے افسانہ صاحبہ؟''

''یہ معمہ نہیں بلکہ ایک چال تھی۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولی۔

''چال......کیسی چال، کس کی چال؟''

''آپ کے موکل قیصر محمود کی چال۔'' افسانہ نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔''آپ کے موکل نے جعلی رسید اور بوگس قبضہ لیٹر از خود تیار کیا تھا اور غلطی سے شمشو بھائی کے دستخط انگریزی میں کر بیٹھا۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔''اسٹامپ پیپر کا حصول بہت آسان ہے۔ کوئی بھی شخص اسے خرید کر اپنی مرضی کے مطابق لکھ سکتا ہے۔ مگر اسٹامپ پیپر کی اصل اہمیت اس وقت تسلیم کی جاتی ہے جب وہ قانونی تقاضے پورے کرتا ہو۔ اس پر نوٹری پبلک وغیرہ کی مہر کے علاوہ فریقین کے دستخط ہونا ضروری ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں دونوں پارٹیوں کی طرف سے کم از کم ایک ایک گواہ کا اندراج مع پتہ و دستخط بھی لازم ہے۔''

''اس قسم کی معلومات فراہم کرنے کا بہت بہت شکریہ افسانہ صاحبہ!'' میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔''اب میں اپنی جرح کے اختتام پر آپ سے چند ضروری سوالات پوچھنا چاہتا ہوں......ضروری اور نہایت ہی اہم۔''

وہ کٹہرے کی چوبی ریلنگ کو تھام کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور متوقع نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک نمایاں نظر آ رہی تھی۔ شاید یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ میں نے اپنی جرح کو ختم کرنے کے بارے میں ذکر کیا تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔''آپ میرے سوال کا جواب دینے کے لئے تیار ہیں نائلہ صاحبہ؟''

''میں ہمہ تن گوش ہوں۔'' وہ بے ساختہ بولی۔

''نائلہ صاحبہ! آپ اس اہم سوال کا جواب بہت سوچ سمجھ کر دیجئے گا۔'' میں نے بدستور سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔''پوچھیں، کیا پوچھنا ہے آپ کا؟''

''مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ پھر روئے سخن جج کی طرف موڑتے ہوئے اضافہ کیا۔''یور آنر! صفائی کی معزز گواہ پر میں اپنی جرح ختم کرتا ہوں۔''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی بیگ صاحب!'' جج نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔''آپ نے ابھی دو مرتبہ گواہ افسانہ کو ''نائلہ صاحبہ'' کہہ کر مخاطب کیا ہے۔ اس کا کیا مطلب ہوا؟''

میں نے جوشیلے لہجے میں جواب دیا۔''جناب عالی! آپ نے ملاحظہ فرمایا، میرے اس تخاطب پر صفائی کی گواہ نے کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں کیا......اس کا یہی مطلب ہوا!''

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

٭☆٭

گواہوں کے کٹہرے میں شمشو اسٹیٹ ایجنٹ موجود تھا۔

تھوڑی دیر پہلے وکیل صفائی نے مختصر سی جرح مکمل کر لی تھی۔ اب میری باری تھی۔ میں نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد اپنی جرح کا آغاز کیا۔ شروع میں، میں نے نہایت ہی سادہ اور ہلکے پھلکے سوال کئے۔ مقصد صرف اسے اپنے ڈھب پر لانا تھا۔ زیادہ تر سوالات افسانہ پر کی گئی جرح کا ہی عکس تھے تاہم جوں جوں جرح آگے بڑھتی گئی، شمشو پر میری گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی تھی۔

میں نے دوستانہ لہجے میں پہلا سوال کیا۔ ”شمس الدین صاحب! آپ کے نام کا مخفف یا بگاڑ تو شمسو ہونا چاہئے مگر لوگ آپ کو اور خود آپ بھی اپنے آپ کو شمشو کہتے ہیں۔ اس کی کوئی خاص وجہ تسمیہ ہے؟“

”کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔“ وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”بس ”شمشو“ رائج ہو گیا ہے۔“

”گویا ”شمشو“ آپ کا مروجہ نام ہے!“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور دوسرا سوال کیا۔ ”شمشو بھائی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ اپنے ملازمین کو اپنے بہن بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں؟“

”ہاں، یہ بالکل درست ہے۔“

میں نے کہا۔ ”سلیم احمد کو جس طرح آپ اپنا بھائی سمجھتے ہیں اسی طرح آپ مس افسانہ کو بھی اپنی چھوٹی بہن تصور کرتے ہیں؟“

”آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ پُرزور تصدیقی لہجے میں بولا۔

میں نے اچانک حملہ کیا۔ ”شمشو بھائی! آپ کی شادی ہو چکی ہے؟“

”جی ہاں۔“ وہ الجھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”آپ کے کتنے بچے ہیں؟“

”فی الحال میرے یہاں کوئی اولاد نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”آپ کی عمر اس وقت کیا ہو گی؟“

”لگ بھگ چالیس سال۔“

یہ وہی چالیس سالہ شخص تھا جو اپنے سے دس سال بڑے قیصر محمود کو اپنا برخوردار سمجھ رہا تھا اور اسے اپنی برادری میں لینے کے لئے چھوٹی بہن افسانہ سے شادی کا جُل دے رہا تھا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟“

”دو ڈھائی سال۔“ وہ تذبذب کا شکار نظر آنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے، ایجنسی کھولنے سے کچھ ہی عرصہ قبل آپ کی شادی ہوئی تھی کیونکہ آپ گزشتہ دو سال سے یونیورسل اسٹیٹ ایجنسی چلا رہے ہیں یا زیادہ سے زیادہ ڈھائی سال سے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔“ وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ”میں نے ایجنسی کھولنے سے چند ماہ پہلے شادی کی تھی۔“

میں نے پوچھا۔ ”آپ گارڈن ایسٹ میں کتنے عرصے سے رہ رہے ہیں؟“

”کم و بیش تین سال سے۔“

”اس سے پہلے کہاں رہائش تھی آپ کی؟“

”کھارا...... میٹھادر میں۔“ وہ لکنت زدہ لہجے میں بولا۔

”کھارادر یا میٹھادر؟“ میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ”تسلی بخش جواب دیں۔“

وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ”میٹھادر میں۔“

”میٹھادر میں آپ کا ذریعہ معاش کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہاں بھی اسٹیٹ ایجنسی ہی تھی۔“ اس نے بتایا۔

”کس نام سے؟“

”نیشنل اسٹیٹ ایجنسی۔“

”واہ بھئی واہ۔“ میں نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔ ”کوئی بھی چیز نیشنل سے پہلے انٹرنیشنل ہوتی ہے۔ اس کے بعد کہیں یونیورسل ہو پاتی ہے۔ مگر آپ کی ایجنسی تو براہِ راست یونیورسل ہو گئی۔ کیا کہنے۔“

وہ خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ میں نے کہا۔ ”شمشو صاحب! میٹھادر میں ایک اور شمشو نامی شخص ہوا کرتا تھا۔ اس کا شادی دفتر تھا۔ کیا آپ اس کو جانتے ہیں؟“

وہ بے ساختہ بولا۔ ”وہ شمشو تو کھارادر میں ہوتا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے آپ اسے جانتے ہیں؟“

”م...... میرا مطلب...... مطلب ہے......“ وہ گڑبڑا گیا۔ ”میرا یہ مطلب تھا کہ آپ والا شمشو کھارادر میں ہو گا۔ میں تو میٹھادر میں ہوتا تھا...... میں کھارادر والے شمشو کو نہیں جانتا...... اور...... نہ ہی اس کے شادی دفتر کو۔“

جج بڑی دلچسپی سے جرح کی سماعت کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اہم پوائنٹ اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر نوٹ کرتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے تیز نظر سے شمشو کو گھورا اور سوال کیا۔

”تو گویا آپ شادی دفتر والے شمشو، مقامی کھارادر کی واقفیت سے انکاری ہیں؟“

”میں نے کہا نا، میں کسی ایسے شمشو کو نہیں جانتا۔“ وہ اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”شمشو بھائی! آپ کی موجودہ بیوی کا کیا نام ہے؟“

”موجودہ...... کیا مطلب؟“ وہ اس طرح اچھلا جیسے کسی زہریلے کیڑے نے اسے ڈنک مار دیا ہو۔ ”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میری تو صرف ایک ہی بیوی ہے۔“

''چلیں، اسی ایک اکلوتی بیوی کا نام بتا دیں؟''

''اس کا نام...... افشاں ہے۔'' وہ بکھرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''جھوٹ بولتے ہوئے آپ کو شرم آنا چاہیے شمشو میاں!'' میں نے زہرخند لہجے میں کہا۔

''کیسا جھوٹ؟'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

اس موقع پر وکیل صفائی نے اپنے موکل کو سہارا دینا ضروری سمجھا، جلدی سے بولا۔ ''آبجیکشن یور آنر! میرے فاضل دوست راستے سے ہٹ رہے ہیں۔ زیرِ ساعت مقدمے سے میرے موکل کی بیوی کا کیا تعلق ہے؟''

جج نے وضاحت طلب نظر سے مجھے دیکھا، میں نے کہا۔ ''جناب عالی! ملزم شمشو بھائی کی بیوی اور موجودہ کیس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ خصوصاً ان کی موجودہ بیوی۔ اس لئے میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم کو جواب دینے کی تاکید کی جائے۔''

جج نے حیرت سے مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ موجودہ بیوی کا کیا چکر ہے بیگ صاحب؟''

''یہ چکر بھی میں ابھی بیان کروں گا۔'' میں نے مؤدب لہجے میں کہا۔ ''پہلے ملزم میرے سوال کا جواب دے۔''

جج نے شمشو بھائی کو جواب دینے کی ہدایت کی پھر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ جرح جاری رکھیں بیگ صاحب!''

میں نے کٹہرے میں کھڑے شمشو سے کہا۔ ''آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے سامنے بتایا ہے کہ آپ کی بیوی کا نام افشاں ہے۔ میں یہ بات ثابت کرسکتا ہوں کہ آپ نے صریحاً دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔ آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

''میں...... میں نے ......کوئی جھوٹ نہیں بولا۔'' وہ منمنایا۔

''تو اس کا مطلب ہے، آپ کی بیوی کا نام افشاں ہے؟''

''جج...... جی...... بالکل۔''

''شمشو میاں!'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔ ''افشاں آج سے تین سال پہلے آپ کی بیوی ہوا کرتی تھی۔ آپ نے تین سال قبل اسے طلاق دے دی تھی۔ ایک گھریلو، شریف، آپ کے دو بچوں کی ماں اور مطلقہ عورت کو بڑی ڈھٹائی سے اپنی بیوی گردانتے ہوئے آپ کو ذرا بھی ندامت محسوس نہیں ہورہی؟''

غیر ارادی طور پر وہ کٹہرے کے فرش کو گھورنے لگا۔ میں نے وکیل صفائی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! آپ نے ابھی کچھ دیر پہلے یہ اعتراض اٹھایا تھا کہ میں آپ کے موکل کی بیوی کا ذکر بیچ میں لاکر معزز عدالت کا وقت برباد کررہا ہوں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔'' میں ایک لمحے کو سانس لینے کے لئے رکا، پھر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مائی ڈیئر ڈیفنس

کونسلر! فار یور کائنڈ انفارمیشن، میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ کا موکل دروغ گو درجہ اول ہے۔ افشاں ماضی میں اس کی بیوی ہوا کرتی تھی جسے تین سال پہلے اس نے طلاق دے دی۔ طلاق کی وجہ ایک خوبرو اور نوجوان لڑکی نائلہ تھی جو آپ کے موکل کے شادی دفتر میں ملازمت کی غرض سے آئی تھی۔ شمشو صاحب نے اٹھارہ سالہ نائلہ کو اپنانے کی غرض سے سیدھی سادھی عورت افشاں کو طلاق دے دی اور خود کھارادر کو خیرباد کہہ کر گارڈن ایسٹ میں آبسا۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ نائلہ نامی وہی لڑکی اب افسانہ کا نام اختیار کرچکی ہے جو کہ قانونی اور معاشرتی لحاظ سے شمشو صاحب کی دوسری بیوی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دفتر کے لوگ افسانہ کو صرف ایک ملازمہ سمجھتے ہیں...... اور میرے موکل کو پھانسنے کے لئے ملزم شمشو بھائی نے افسانہ کو اپنی چھوٹی بہن ظاہر کیا۔''

میں نے بات ختم کی تو وکیل صفائی نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں سوال کیا۔ ''اس دلچسپ کہانی کو ثابت کرنے کے لئے بھی کچھ ہے آپ کے پاس؟''

میں نے کہا۔ ''شمشو صاحب کٹہرے میں موجود ہیں۔ ان سے پوچھا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ زبان نہ کھولنا چاہیں تو میں افشاں کو بطور گواہ معزز عدالت کے سامنے پیش کرسکتا ہوں۔''

وکیل صفائی معاندانہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہنا شروع کیا۔

''جناب عالی! معزز عدالت کے حکم پر میں مطلقہ افشاں بیگم کو کسی بھی وقت عدالت میں پیش کرسکتا ہوں اور کھارادر کے دو چار ایسے رہائشیوں کو بھی جو یہ گواہی دے سکیں کہ شمشو بھائی پہلے کھارادر میں شادی دفتر چلایا کرتے تھے۔ افسانہ کی حقیقت کو جاننے کے لئے اس پر کی گئی جرح کے اختتامی حصے کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جب اس نے خود کو نائلہ کے نام سے پکارے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے بیان میں اعتراف کرچکی ہیں کہ وہ شادی سے پہلے کھارادر میں رہتی تھیں بعدازاں انہوں نے اپنی شادی کے ذکر کو گول کردیا۔ شمشو اور افسانہ (میاں + بیوی) نے ملی بھگت سے میرے موکل کو فلیٹ دلوانے کا جھانسا دے کر اپنے جال میں پھانسا اور اس سے ایک تگڑی رقم اینٹھ لی۔ یہ سراسر ظلم اور زیادتی کے زمرے میں شمار ہوتا ہے جناب عالی!''

جج بڑی توجہ اور دلچسپی سے میرا بیان سن رہا تھا۔ میں نے بات ختم کی تو وکیل صفائی نے اپنی فیس حلال کرنے کے لئے کمزور لہجے میں مجھے کچھ یاد دلانے کی کوشش کی۔

''میرے فاضل دوست! آپ کے موکل قیصر محمود کا دعویٰ ہے کہ میرے موکل شمشو بھائی نے اسے جھانسا دے کر کچھ رقم ہتھیا لی ہے۔ وکیل استغاثہ ہونے کے ناتے آپ کو چاہئے کہ آپ دعوے کے حق میں اور اسے سچا ثابت کرنے کے لئے کوئی ٹھوس ثبوت مہیا کرتے۔ مگر لگتا ہے آپ گڑے مردے اکھاڑنے کے سوا کچھ کرنا نہیں چاہتے۔''

''تھینک یو فار دِس ریمائنڈر۔'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب میں اسی طرف

آتا ہوں۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ اس کیس کا کوئی بھی پہلو، کوئی بھی زاویہ تشنہ نہیں رہے گا۔'' پھر میں اکیوزڈ باکس میں کھڑے ملزم شمشو بھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''شمشو بھائی! کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے میرے موکل کو فلیٹ دلوانے کا جھانسا دے کر اس سے ایک موٹی رقم ٹھگ لی ہے؟''

''یہ قطعاً سچ نہیں بلکہ ایک بہت بڑا جھوٹ ہے۔''

''میرے موکل کے پاس رقم کی ادائیگی کی رسید موجود ہے۔''

''وہ رسید جعلی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا قیصر محمود کے پاس آپ کا دیا ہوا قبضہ لیٹر بھی جعلی ہے؟''

''جی ہاں، وہ اس کا خود تیار کردہ ہے۔''

''آپ کو اتوار کا دن بہت پسند کیوں ہے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ ''خصوصاً قبضہ دینے کے حوالے سے؟''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟'' اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ نے میرے موکل سے رقم وصول کرنے کے بعد اسے قبضے کے لئے پندرہ مارچ کی تاریخ دی تھی۔ پندرہ مارچ کو اتوار کا دن پڑتا ہے۔ اسی طرح جب آپ نے قیصر کو دوبارہ قبضے کی تاریخ دی تو وہ پانچ اپریل تھی یعنی پھر وہی اتوار کا دن۔ اس کی کوئی خاص تکنیکی وجہ ہے؟''

''دیکھیں جناب!'' وہ سنبھل کر کھڑا ہوا پھر برہمی سے بولا۔ ''میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ رقم کی وصولی اور قبضہ وغیرہ سے متعلق جتنی بھی باتیں ہیں وہ آپ کے موکل نے خود گھڑی ہے۔ حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر رقم کی وصولی کے بعد آپ نے باقاعدہ رسید دی تھی۔ اس کے بعد آپ نے قبضہ لیٹر جاری کیا۔ بعد ازاں اس قبضہ لیٹر کو منسوخ کر کے ایک نیا کنفرم قبضہ لیٹر جاری کیا۔ یہ سب کیا تھا؟''

''میں کہہ چکا ہوں کہ یہ تمام دستاویزات جعلی اور نقلی ہیں۔'' وہ کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ایک آزمودہ نفسیاتی حربہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس سے پہلے ایک ضمنی سوال ضروری تھا۔ میں نے شمشو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''شمشو صاحب! میرے موکل نے مجھے بتایا ہے کہ مبینہ فلیٹ کی مرمت وغیرہ کے ضمن میں آپ نے اس سے ایک اچھی خاصی رقم وصول کی تھی جس کی کوئی رسی بھی دینا آپ کو گوارا نہ ہوا۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میں ایسی کسی رقم کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

''آپ کے جاری کردہ کنفرم قبضہ لیٹر میں اس سوال کا سراغ ملتا ہے۔'' میں نے ٹٹولنے والی نظر سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''جہاں آپ نے دگنی رقم واپس کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟''

''میں بوگس قبضہ لیٹر، نقلی رسید اور فرضی رقم کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''میرے موکل کا کہنا ہے کہ اس نے مبینہ فلیٹ کی مرمت اور آرائش وزیبائش کے لئے آپ کو پچاس ہزار روپے ادا کئے تھے؟'' میں نے قطعی لہجے میں کہا۔

''وہ بکواس کرتا ہے۔'' وہ پھٹ پڑا۔ ''میں نے تو صرف اٹھائیس ہزار روپے......''

یکلخت اس کی زبان کو بریک لگ گئے اور وہ ہراساں نظر سے کبھی جج کو اور کبھی وکیل صفائی کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اس کے ادھورے جملے کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''......ہی لئے تھے۔ پچاس ہزار والی بات بالکل غلط ہے۔'' میں نے ایک لمحے کو رک کر شمشو کے چہرے کا جائزہ لیا اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''شمشو صاحب! آپ یہی کہنے جا رہے تھے نا؟''

''مم......مم...... میں......'' وہ لرزیدہ لہجے میں رک رک کر بولا۔ ''میں نے کوئی پیسہ نہیں لیا آپ کے موکل سے۔ نہ اٹھائیس ہزار...... نہ پچاس ہزار۔''

میں نے لوہا گرم کر دیا تھا اور حالات کو اپنی موافقت میں موڑنے کے لئے تواتر سے چوٹیں لگانا ضروری تھا۔ میں نے قدرے تیز اور سخت لہجے میں پوچھا۔

''شمشو بھائی! آپ کا اکاؤنٹ کس بینک میں ہے؟''

''حبیب بینک میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''کون سی برانچ؟''

اس نے برانچ بتادی اور خاموش نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''اکاؤنٹ نمبر بتائیں گے؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے قطعیت سے بولا۔ ''یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں آپ کو اپنا بینک اکاؤنٹ نمبر کیوں بتاؤں؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا، آپ یہی جواب دیں گے اسی لئے میں نے حفظ ماتقدم کے طور پر آپ کا بینک اکاؤنٹ نمبر معلوم کر لیا ہے۔''

وہ پھٹی پھٹی غصہ آمیز آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے حملہ جاری رکھا۔ ''شمشو بھائی! حبیب بینک کی برانچ...... میں آپ کا اکاؤنٹ نمبر ''ون ٹو سیون، نائن، فائیو۔ ایٹ'' ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

"آپ وکیل نہیں، بہت بڑے بدمعاش ہیں۔" وہ نفرت آمیز لہجے میں بولا۔

جج نے فوراً سخت الفاظ میں اسے تنبیہہ کی۔ "مسٹر شمشو! عدالت کے وقار کا خیال رکھو ورنہ نازیبا الفاظ کے استعمال پر تمہیں توہین عدالت کے الزام میں جیل بھی بھیجا جاسکتا ہے۔" پھر جج نے مجھے مخاطب کیا۔

"بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔"

میں نے اپنی توپوں کا رخ شمشو کی جانب موڑ دیا۔ "شمشو بھائی! اکیس فروری بروز ہفتہ آپ کے اکاؤنٹ نمبر "ون ٹو سیون نائن فائیو۔ ایٹ" میں اسی ہزار روپے کا ایک چیک جمع کروایا گیا تھا۔ مذکورہ کراس چیک کا نمبر "زیرو زیرو ون زیرو زیرو فور سیون" ہے جو نیشنل بینک کی برانچ...... کے ایک اکاؤنٹ نمبر "فائیو تھری ٹو زیرو۔ نائن" کے ہولڈر مسٹر قیصر محمود کا جاری کردہ تھا۔ متذکرہ کراس چیک پر اکاؤنٹ ہولڈر قیصر محمود یعنی میرے موکل کے دستخط بھی موجود تھے۔ آپ اس سلسلے میں معزز عدالت کو کچھ بتانا پسند کریں گے؟"

ایک لمحے کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شمشو کٹہرے میں نہیں بلکہ کسی آہنی پنجرے میں بند ایک خونخوار جانور ہو جو کسی بھی پل مجھ پر جست کر کے مجھے بھنبھوڑ ڈالنا چاہتا ہو۔ لیکن اس نے بہت ضبط کا مظاہرہ کیا۔ وہ جب بولا تو اس کا لہجہ خاصا جھلایا ہوا تھا۔ تاہم اس کی ڈھٹائی قابل دید تھی۔

"میرے اکاؤنٹ میں ایسا کوئی کراس چیک جمع نہیں کرایا گیا۔"

وکیل صفائی نے حق وکالت ادا کرتے ہوئے مجھ سے استفسار کیا۔ "میرے فاضل دوست! آپ نے میرے موکل کے اکاؤنٹ اور کراس چیک مالیتی اسی ہزار روپے کے حوالے سے جو دعویٰ کیا ہے اس وثوق کو ثابت کرنے کے لئے آپ کے پاس کوئی ثبوت موجود بھی ہے؟"

"بہت جاندار ثبوت ہے میرے فاضل دوست!" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی فائلوں کی جانب بڑھ گیا۔

میرے موکل قیصر محمود نے اس معاملے میں صرف ایک ہی عقل مندی کا ثبوت دیا تھا۔ یعنی اسی ہزار روپے کی ادائیگی بذریعہ کراس چیک...... وہی "ثبوت" اس نے مجھے "فراہم" بھی کر دیا تھا۔

میں نے اس سے حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں اپنے مخصوص ذرائع استعمال کر کے شمشو بھائی کے بینک اکاؤنٹ واقع حبیب بینک لمیٹڈ کا تازہ ترین اسٹیٹ منٹ حاصل کر لیا تھا اور اس وقت وہی میرے کام آرہا تھا جو اس مقدمے میں استغاثہ کے لئے ٹرمپ کارڈ کی حیثیت رکھتا تھا۔

میں نے اپنی فائل سے بینک اسٹیٹ منٹ کی تین کاپیاں نکال کر فاتحانہ نظر سے وکیل صفائی کی طرف دیکھا، پھر ایک کاپی کرسی انصاف پر براجمان محترم شخصیت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"جناب عالی! آپ اس ثبوت کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔"

دوسری کاپی میں نے وکیل صفائی کو دیتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی اپنے مطلوبہ ثبوت کا جائزہ

لے لیں۔ آپ کی تسلی کے لئے میرے خیال میں یہ کاغذ کا صفحہ کافی ثابت ہوگا۔"

اس کے بعد میں کٹہرے میں کھڑے بلکہ چوبی ریلنگ کا سہارا لئے پژمردہ شمشو بھائی کی جانب بڑھا اور تیسری کاپی اسے تھما دی۔ پھر میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "شمشو بھائی! اس اسٹیٹ منٹ کو دیکھ کر آپ کے فراڈ کے غبارے کی ساری ہوا، ہوا ہو جائے گی۔"

شمشو نے خالی خالی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے وہ اسٹیٹ منٹ تھاما پھر ایک سرسری سی نگاہ اس پر ڈالنے کے بعد وہ میری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کے چہرے پر خوف و ہراس کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اسی دوران میں اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا بینک اسٹیٹ منٹ چھوٹ گیا اور تھوڑی دیر فضا میں ڈولنے کے بعد زمین بوس ہو گیا۔ شمشو نے جھک کر اس "موذی کاغذ" کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ آنکھیں بند کر کے کٹہرے کی منڈیر پر سر ٹکا دیا۔

جج نے اس دوران میں اسٹیٹ منٹ کا باریک بینی سے جائزہ لے لیا تھا۔ اس نے وکیل صفائی کو مخاطب کیا۔ "وکیل صاحب! موجودہ صورت حال میں آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"میرے موکل شمشو بھائی نے مجھے کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔" وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ اسٹیٹ منٹ کی حقیقت اس پر آشکار ہو چکی تھی کیونکہ اب کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ وکیل صفائی نے ناپسندیدہ نظر سے شمشو کو دیکھا اور بے بسی سے بولا۔ "میرے موکل نے مجھ سے حقائق کو پوشیدہ رکھ کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "اسی لئے عقل مند، سمجھ دار اور تجربہ کار بزرگ فرما گئے ہیں کہ دائی سے پیٹ، ڈاکٹر سے مرض اور وکیل سے حقائق کو چھپانا نہیں چاہئے ورنہ اپنا ہی نقصان ہوتا ہے۔"

وکیل صفائی نے شرمندگی آمیز نظر سے مجھے دیکھا پھر نفرت سے شمشو بھائی کو گھورنے لگا جس نے آج بھری عدالت میں اس کی وکالت کی خوب مٹی پلید کی تھی۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے زوردار لہجے میں کہا۔ "جناب عالی! اب حقیقت روز روشن کی مانند عیاں ہو چکی ہے۔ اس کیس میں کوئی بات مبہم، کوئی گوشہ تشنہ، کوئی زاویہ نامکمل اور کوئی سوال اب سوال نہیں رہا بلکہ ہر بات واضح، ہر گوشہ سیراب، ہر زاویہ مکمل اور ہر چھوٹا بڑا سوال اپنا مدلل جواب حاصل کر چکا ہے۔ ملزم شمشو بھائی نے اپنی منکوحہ کو اپنی بہن ظاہر کر کے جس طرح میرے موکل کو بے وقوف بنایا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی۔ فلیٹ اور شادی کے جھانسے میں میرے موکل سے لگ بھگ ایک لاکھ آٹھ ہزار روپے تو بٹور ہی لئے گئے تھے۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ میرے موکل کے انتہائی نازک احساسات اور لطیف جذبات کو بھی مجروح کیا گیا ہے۔

یہ اتنا بڑا روحانی کرب ہے جس کا اندازہ وہی شخص لگا سکتا ہے جو کبھی اس قسم کی صورت حال سے

دوچار ہوا ہو...... اور اتنی بڑی سزا کے لئے میرے موکل کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ ایک انتہائی سادہ اور شریف انسان ہے۔ اسے جرمِ سادگی کی سزا دی گئی ہے۔"

میں نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر دھواں دھار بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! کسی انسان کے نازک جذبات اور احساسات سے کھیلنا ایک ناقابل معافی جرم ہے مگر ظاہر ہے، اس کا مداوا بھی کلی طور پر ممکن نہیں۔ تاہم اگر میرے موکل کی ڈوبی ہوئی رقم کو کنارہ مل جائے تو اسے ممکنہ تلافی کی صورت کہا جاسکتا ہے۔

جنابِ عالی! ملازم کے بینک اکاؤنٹ کا تازہ ترین اسٹیٹ منٹ معزز عدالت کی خدمت عالیہ میں پیش کیا جاچکا ہے جس کے مطابق اس وقت ملزم کے اکاؤنٹ میں سوا چھ لاکھ روپے موجود ہیں اس لئے لرنڈ کورٹ سے میں درخواست کروں گا کہ وہ میرے موکل کو اس کا جائز حق دلا کر انصاف کے تقاضے پورے کرے۔ دیٹس آل یور آنر!"

اتنا کہہ کر میں اپنی مخصوص سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔ وکیل صفائی کے پاس اپنے موکل کی حمایت میں کہنے کے لئے ایک لفظ بھی نہیں بچا تھا۔ ملزم شمشو کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کی مکمل خاموشی اس کے جرم پر مُہرِ تصدیق ثبت کر رہی تھی۔ بہ الفاظ دیگر میں اس مقدمے میں سرخرو ہو چکا تھا۔

جج تھوڑی دیر تک اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات کا جائزہ لیتا رہا۔ وہ حقیقت کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس وقت عدالت کا مخصوص دورانیہ ختم ہونے میں چند سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ جج نے دیوار گیر کلاک پر نظر ڈالی اور فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ آئندہ پیشی پر جج نے قیصر محمود کے حق میں فیصلہ سناتے ہوئے مدعا الیہ شمس الدین عرف شمشو کے خلاف مطلوبہ رقم کی ڈگری جاری کر دی تھی۔ قیصر اس موقع پر اتنا خوش تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ قیصر کی یہ خوشی میری کامیابی کی مرہون منت تھی اور میری کامیابی میں میری پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ قیصر جیسے سیدھے اور سادہ دل انسان کی پُرخلوص دعاؤں کا بھی بڑا حصہ ہے۔

***

برعکس

اکتوبر کا مہینہ اپنا پہلا نصف طے کر چکا تھا۔ ایک روز میں عدالت سے فارغ ہونے کے بعد اپنے دفتر کی طرف جا رہا تھا کہ ایک شناسا چہرے کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ اس شخص نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے میری جانب تکتے ہوئے ہوا میں ہاتھ لہرایا اور تیزی سے قدم اٹھانے لگا۔ میں لامحالہ رک گیا اور اس کے، اپنے نزدیک پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ مذکورہ شخص بہت عرصہ پہلے میرے ساتھ بطور اسسٹنٹ کام کر چکا تھا۔ اس نے میرے قریب آ کر سلام کیا پھر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "خدا کا شکر ہے سر! آپ نظر آ گئے۔ میں کافی دیر سے آپ کو مختلف عدالتوں میں تلاش کر رہا تھا۔"

ملازمت کے دوران میں وہ مجھے "سر" کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے یہی انداز اپنایا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا پھر سرسری لہجے میں پوچھا۔

"خیریت تو ہے بھئی، تم مجھے کیوں تلاش کرتے پھر رہے ہو؟"

وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ "سر! ڈاکٹر، وکیل اور پولیس والوں کی تلاش میں وہی لوگ نکلتے ہیں جن کے ساتھ خیریت نہیں ہوتی۔"

"عموماً ایسا ہوتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر پوچھا۔ "تمہاری خیریت کو کیا ہو گیا؟"

وہ پریشان صورت بنا کر بولا۔ "میں ذاتی طور پر بخیریت ہوں لیکن میرا چھوٹا بھائی ایک بہت بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ چونکہ میرا چھوٹا بھائی ہے اس لئے اس کی مصیبت براہِ راست میری مصیبت ہے۔"

"تمہارے چھوٹے بھائی کو کیا ہوا ہے؟"

"اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "کس جرم میں؟"

اس پر قتل کا الزام ہے۔" اس نے بتایا۔

"تمہارے بھائی نے کسے قتل کیا ہے؟" میں نے استفسار کیا۔

"اس نے قتل نہیں کیا، اس پر قتل کا الزام ہے۔"

"ہوں......" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور پوچھا۔ "قتل کون ہوا تھا؟"

"مقتولہ ایک لڑکی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ اس لڑکی کو تمہارے بھائی نے قتل نہیں کیا۔ ہے نا؟''

''بالکل سر! مجھے سو فیصد یقین ہے۔'' وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ''میرا بھائی بہت امن پسند اور صلح جو انسان ہے۔ وہ قتل جیسا خطرناک کام نہیں کر سکتا۔''

میں نے پوچھا۔ ''قتل کی یہ واردات کب اور کہاں پیش آئی ہے؟''

''یہ دو روز پہلے کی بات ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''سترہ اکتوبر کی رات یہ واقعہ پیش آیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو یہ تین دن پہلے کی بات ہوئی۔ آج بیس اکتوبر ہے۔''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بالکل، بالکل۔ سترہ تاریخ کو قتل کی واردات ہوئی، اٹھارہ اکتوبر کی دوپہر میں میرے بھائی کو گرفتار کر لیا گیا اور کل اُنیس اکتوبر کو پولیس نے اسے عدالت میں پیش کر کے سات یوم کا ریمانڈ حاصل کر لیا ہے۔ اب وہ ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

''اسے کہاں سے گرفتار کیا گیا؟'' میں نے استفسار کیا۔ ''اور ابھی تک تم نے یہ بھی نہیں بتایا کہ قتل کی واردات کہاں پیش آئی ہے؟''

میرے سابق اسسٹنٹ نے جواب دیا۔ ''میرے بھائی کو پولیس نے گھر سے گرفتار کیا ہے اور قتل والا واقعہ ایک مقامی سینما کے پروجیکشن روم میں پیش آیا ہے۔'' پھر اس نے سینما کا نام بتا دیا۔

''سینما کا پروجیکشن روم!'' میں نے حیرت آمیز انداز میں کہا۔ ''تمہارے بھائی کا کسی سینما یا اس کے پروجیکشن روم سے تعلق ہے؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''سر! یہ بڑا ہی نالائق واقع ہوا ہے۔ میری خواہش تھی کہ اسے ڈاکٹر بناؤں گا۔ میٹرک سائنس اس نے بڑی مشکل سے دو سال میں پاس کیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ کہنے لگا، بھائی یہ سائنس اور میڈیکل وغیرہ میرے بس کی نہیں۔ میں آرٹس پڑھوں گا۔ بار بار کے تقاضوں اور اصرار کے بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ میری خواہش کو پورا نہیں کر سکتا تو میں نے کوشش کر کے اس کی خواہش کے مطابق انٹر آرٹس میں اسے داخلہ دلوا دیا۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات کی صورت میں برآمد ہوا۔ تین سال کی کوشش کے بعد بھی جب وہ انٹر آرٹس کا امتحان پاس نہیں کر سکا تو اس نے ہاتھ کھڑے کرتے ہوئے اعلان کر دیا، میں سرے سے پڑھوں گا ہی نہیں۔''

یہاں تک پہنچنے کے بعد وہ سانس لینے کے لئے رکا۔ مجھے یاد تھا کہ جب وہ میرے پاس کام کرتا تھا عموماً اپنے چھوٹے بھائی کا ذکر کرتا رہتا تھا جسے وہ ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا۔ ان دنوں وہ شاید میٹرک میں جانے والا تھا۔

میرا سابق اسسٹنٹ سلسلہ بیان کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''پڑھائی کو خیرباد کہنے کے بعد

اسے آرٹ کا شوق ہوا اور وہ بھی سینما آرٹ۔ فلمیں دیکھنے کا وہ پہلے ہی شیدائی تھی۔ یہ للک اسے سینما آرٹ کی طرف لے گئی۔ وہ سینما کے بڑے بڑے بورڈز بنانے والے ایک مشہور آرٹسٹ کے پاس کام سیکھنے جانے لگا۔ مذکورہ آرٹسٹ سینما کے اندر ہی کام کرتا تھا۔ اس طرح میرے بھائی کو ایک ٹکٹ میں دو مزے ملنے لگے۔ وہ فلمی اداکاروں کی آدم قد تصاویر بنانا سیکھنے لگا اور مفت میں سینما کے اندر فلمیں بھی دیکھنے کو ملنے لگیں۔ اس کام میں اس نے لگ بھگ پانچ سال صرف کر دیئے۔ جب وہ سینما لائن کا یہ کام کافی حد تک سیکھ گیا تو اچانک اس نے پٹری بدل دی۔''

اس نے ایک لمحے کا توقف کیا پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''سینما میں آمد و رفت کے دوران میں اس کی دوستی پروجیکٹر آپریٹر سے ہو گئی اور اس نے میرے بھائی کو یہ پٹی پڑھائی کہ آرٹ وغیرہ میں کیا رکھا ہے۔ بہت کم پیسے ملتے ہیں اور ان میں سے بھی اچھی خاصی رقم استاد کی جیب میں چلی جاتی ہے۔ پروجیکٹر آپریٹر نے اسے مشورہ دیا کہ وہ فلم چلانے کا کام سیکھ لے۔ یہ بہت آسان کام ہے، وہ ایک دو ماہ میں اسے نہ صرف سکھا دے گا بلکہ کسی سینما میں اسے ملازمت بھی دلوا دے گا۔ پھر اس کے مزے آ جائیں گے۔ فلمیں چلائے بھی، دیکھے بھی اور دیکھے بھی بار بار۔ اس کے ساتھ ہی ہر ماہ ایک معقول تنخواہ بھی ملے گی۔

یہ آئیڈیا میرے بھائی کے ذہن میں بیٹھ گیا اور اس نے آرٹ چھوڑ کر پروجیکٹر چلانا سیکھنا شروع کر دیا۔ اس کے استاد آپریٹر نے اپنا وعدہ وفا کیا اور کام سکھانے کے بعد اسے ایک سینما میں کام دلا دیا۔ گزشتہ چار سال سے وہ یہی کام کر رہا تھا۔ اس دوران میں وہ دو سینما بدل چکا تھا۔''

ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''قتل کی واردات جس سینما کے پروجیکشن روم میں پیش آئی، ان دنوں میرا بھائی اسی سینما میں ملازم ہے۔''

''مقتولہ کے بارے میں کچھ بتاؤ؟'' میں نے پوری بات سننے کے بعد کہا۔

''وہ پی آئی بی کالونی کی رہنے والی ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''مقتولہ کا تمہارے بھائی سے کوئی تعلق نکلتا ہے؟''

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یس سر! کچھ کچھ تعلق نکلتا ہے۔ اسی لئے تو پولیس والے اس پر زیادہ شک کر رہے ہیں۔ بلکہ انہیں پورا یقین ہے قتل میرے بھائی نے ہی کیا ہے۔''

اس وقت تک میں اپنے دفتر تک پہنچ گیا تھا۔ میں اپنے سابق اسسٹنٹ کو اپنے ساتھ ہی چیمبر میں لے گیا۔ انتظارگاہ میں فی الحال کوئی کلائنٹ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اس سے تفصیلی بات کر لینا چاہتا تھا۔

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس سے پوچھا۔ ''تم مقتولہ اور اپنے چھوٹے بھائی کے درمیان کسی تعلق کا ذکر کر رہے تھے؟''

وہ میری میز کے سامنے رکھی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ چکا تھا۔ اس نے جواب دیا۔

''سر! ایک تعلق تو یہ ہے کہ مقتولہ پی آئی بی کالونی میں رہائش اختیار کرنے سے پہلے گرومندر پر رہتی تھی......''

''تم بھی گرومندر کے علاقے ہی میں رہتے ہونا؟'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی ہاں، ہم گرومندر کے علاقے میں رہتے ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ مقتولہ پہلے نہ صرف گرومندر میں رہتی تھی بلکہ وہ ہماری ہی گلی کی رہائشی تھی۔ وہ لوگ کرائے پر رہتے تھے۔ گرومندر والا گھر چھوڑ کر وہ پی آئی بی کالونی میں آگئے تھے۔ ہم ابھی تک وہیں گرومندر میں رہتے ہیں۔''

میں رف پیڈ اور قلم سنبھال چکا تھا اور اس کے بیان کے اہم نکات نوٹ کرتا جارہا تھا۔ وہ مزید بتانے لگا۔ ''سر! بات اگر صرف سابق محلے داری تک ہی رہتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ میرے بھائی کی بدقسمتی یہ ہے کہ مقتولہ جب ہماری گلی میں رہتی تھی تو وہ اسے پسند کر بیٹھا تھا۔ جب مجھے پتہ چلا تو اس کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے ماں کے مشورے سے میں نے اس کا رشتہ مقتول کے گھر بھیج دیا تھا۔ تاہم مقتولہ کے گھر والوں نے صاف انکار کردیا تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر اپنی کیونٹی سے باہر بیٹی کی شادی کرنے کو تیار نہیں تھے۔''

چند لمحات کے توقف کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔ ''سر! آپ کو معلوم ہے، ہمارے والد حیات نہیں ہیں۔ ہم دو بھائی ہیں یا پھر بوڑھی والدہ۔ جب رشتے سے انکار ہوا تو میرے بھائی کو دلی صدمہ پہنچا۔ کافی دنوں تک وہ بولایا بولایا سا پھرتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے آتے جاتے راستے میں مقتولہ سے بات چیت بھی کرنا چاہی مگر اس نے سختی سے میرے بھائی کو جھڑک دیا اور تنبیہہ کی کہ وہ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔

میرا بھائی مقتولہ کو اپنے دل و دماغ سے نہ نکال سکا اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کی کوششوں میں لگا رہا۔ ظاہر ہے مقتولہ نے اس کی حرکتوں کے بارے میں اپنے والدین کو بتایا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ لوگ گرومندر کا علاقہ چھوڑ کر چلے گئے تھے۔''

''مقتولہ نے گرومندر والا مکان کب چھوڑا تھا؟''

''لگ بھگ دو سال پہلے۔''

''کیا تمہیں یا تمہارے بھائی کو یہ بات معلوم تھی کہ مقتولہ ان دنوں پی آئی بی کالونی میں رہ رہی تھی؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نو سر! یہ بات تو اس واردات کے بعد سامنے آئی ہے۔''

''اس سلسلے میں تم نے اپنے بھائی سے پوچھا؟''

''جی پوچھا تھا۔'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''جو آپ سوچ رہے ہیں میرا بھی اس طرف دھیان گیا تھا اور اس حوالے سے میں نے بھائی کو خاصا کریدا ہے۔ وہ ایک ہی بات پر ڈٹا ہوا ہے

کہ وہ نہیں جانتا تھا، مقتولہ ان دنوں کہاں رہائش پذیر ہے۔ اس کا بیان ہے کہ وہ دو سال پہلے ہی مقتولہ کو بھول گیا تھا۔''

''اس کے بیان میں کتنی صداقت ہوسکتی ہے؟''

''وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے جو حالات اور پس منظر بیان کیا ہے اس کے پیش نظر تمہارے بھائی کی پوزیشن خاصی نازک ہو جاتی ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ جس لڑکی کو شدت سے چاہنے لگا تھا اور اس کے رشتے کے لئے چارہ جوئی بھی کی گئی تھی، اسے وہ ناکامیابی کے بعد بھلا بیٹھا ہے۔ اس نوعیت کے تعلق کو بھلانا ناممکن حد تک مشکل ہوتا ہے۔''

''آپ بجا فرمارہے ہیں سر۔'' وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں اپنے بھائی کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے، مقتولہ کو بھول جانے والی بات کے سلسلے میں اس نے غلط بیانی کی ہو۔ مگر اس بات کا مجھے پورا یقین ہے کہ مقتولہ کے قتل کے سلسلے میں میرا بھائی ملوث نہیں ہوسکتا۔ اتنا سنگین اقدام اس کے بس کی بات نہیں۔ وہ سراسر بے قصور ہے۔''

''یہ تو تم کہہ رہے ہونا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ایک بڑے بھائی کے اپنے چھوٹے بھائی کے بارے میں خیالات ہیں مگر عدالت کسی کے خیالات کی بنا پر ملزم کو بے گناہ نہیں مان لیتی۔ عدالت میں بے گناہی کو ثابت کرنے کے لئے بہت زور مارنا پڑتا ہے۔ یہ بات تو تم اچھی طرح جانتے ہو؟''

''اسی لئے تو میں آپ کے پاس آیا ہوں سر۔'' وہ عقیدت بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں آپ چوٹی کے وکیل ہیں۔ آپ کا تجربہ اور عملی اقدام میرے بھائی کو اس مصیبت سے نجات دلا سکتے ہیں۔''

میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''اس کے لئے مجھے سب سے پہلے تمہارے بھائی سے ایک بھرپور ملاقات کرنا ہوگی۔ جب تک اس کیس میں اس کی حیثیت واضح نہیں ہو جاتی، میں تمہیں کسی قسم کا کوئی یقین نہیں دلا سکتا۔ تم تو جانتے ہو میرے کام کرنے کا طریقہ کار کیا ہے۔''

اس نے متعلقہ تھانے کا نام بتایا اور کہا۔ ''میرا بھائی ریمانڈ پر اس تھانے کے حوالات میں بند ہے۔ آپ جب چاہیں، اس سے ملاقات کرسکتے ہیں۔''

ایک فوری خیال کے تحت میں نے پوچھا۔ ''کیا تم اس بارے میں کچھ بتا سکتے ہو کہ مقتولہ اس سینما پروجیکشن روم میں کس طرح پہنچی تھی؟''

اس نے معذوری ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب! یہ بتانا میرے لئے ممکن نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں بھائی سے بھی پوچھا تھا، اس کا کہنا یہ ہے کہ وہ وقوعہ کی رات حسب معمول فلم کا آخری شو ختم کرنے کے بعد پروجیکشن روم سے نکل آیا تھا۔ اس نے پروجیکشن روم میں تو کیا، سینما کے کسی

بھی حصے میں مقتولہ کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی تھی۔''

''کیا مقتولہ یہ بات جانتی تھی کہ تمہارا بھائی کس پیشے سے منسلک ہے؟''

''جی سر!'' اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''لیکن مجھے نہیں امید کہ اسے یہ معلوم ہو کہ میرا بھائی اس سینما میں کام کرتا تھا جس کے پروجیکشن روم میں وہ مقتولہ پائی گئی ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہیں یہ امید کیوں نہیں تھی؟''

''اس لئے جناب! کہ دو سال پہلے جب مقتولہ کے گھر والے گرومندر کے علاقے میں ہمارے گھر کے قریب رہتے تھے تو میرا بھائی کسی اور سینما میں فلم چلاتا تھا۔ جس سینما میں اس کی لاش پائی گئی ہے، یہاں میرے بھائی کی ملازمت کے بارے میں اسے کیسے پتہ چل سکتا ہے۔''

میں نے چند لمحات تک موجودہ حالات پر غور کیا اور کہا۔ ''پروجیکشن روم سے لاش کس نے دریافت کی تھی؟''

''صفائی کرنے والے خاکروب نے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''خاکروب اس روز حسب معمول صبح سینما کی صفائی کرنے آیا تو اس نے اپنا کام اوپر سے شروع کیا تھا۔ سب سے پہلے وہ پروجیکشن روم میں ہی پہنچا تھا۔ اس نے وہاں ایک لڑکی کو مردہ حالت میں پایا تو شور مچا دیا۔ اس وقت سینما کا سپروائزر وہیں موجود تھا۔ جب لاش والی اطلاع اس تک پہنچی تو اس نے فوراً منیجر صاحب کو فون کر دیا۔ سینما کا منیجر یہ سنسنی خیز خبر سنتے ہی موقع پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد ہی پولیس کو اطلاع دی گئی تھی۔ دوپہر کے بعد پولیس نے میرے بھائی کو گھر سے گرفتار کر لیا۔''

میں نے پوچھا۔ ''یہ کس طرح پتہ چلا کہ مقتولہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے؟''

''مقتولہ کے پاس اس کا پرس موجود تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''جس میں اس کا شناختی کارڈ وغیرہ بھی تھا۔ اسی کارڈ کے ذریعے پولیس مقتولہ کے والدین تک پہنچی تھی۔''

''مقتولہ کے والدین نے کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟''

''جب لڑکی کے والد کو پتہ چلا کہ اس کی بیٹی کی لاش سینما کے جس پروجیکشن روم میں پڑی پائی گئی ہے وہاں میرا بھائی آپریٹر کے طور پر کام کرتا ہے تو اس نے فوری طور پر یہ فیصلہ سنا دیا کہ مقتولہ کو میرے بھائی نے ہی قتل کیا ہو گا۔'' اس نے بیزاری سے بتایا۔ ''مقتولہ کے باپ نے پولیس والوں کو یہ کہانی بھی سنا دی تھی جس کے مطابق میرا بھائی مقتولہ سے شادی کا خواہاں تھا مگر دوسری طرف سے انکار ہو گیا تھا۔ پولیس والوں نے فوری طور پر یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ میرے بھائی نے اپنی ناکامی کا انتقام لینے کے لئے مقتولہ کو قتل کر دیا۔''

میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ''یہاں ایک بات قابل غور ہے۔''

وہ سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھنا یہ پڑے گا کہ مقتولہ سینما کے پروجیکشن روم تک پہنچی کیسے؟''

''ہاں، یہ جاننا بہت ضروری اور اہم ہے۔'' اس نے تائیدی انداز میں کہا۔

میں نے خیال آرائی کی۔ ''اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ مقتولہ اور ملزم میں رابطہ وغیرہ قائم ہو گیا تھا۔ مقتولہ، ملزم کے بلانے پر یا اس کے ساتھ پروجیکشن روم میں پہنچی ہو گی۔ میں نے سن رکھا ہے کہ سینما آپریٹر اکثر و بیشتر اپنے دوستوں کو پروجیکشن روم میں لے جا کر مفت میں فلم دکھاتے رہتے ہیں۔''

''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے سر!'' اس نے تصدیق کی۔ ''اکثر آپریٹر ایسا کرتے ہیں مگر میں یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہیں کہ میرا بھائی مقتولہ سے رابطے میں تھا۔ میں نے اس حوالے سے بھائی کو بہت کریدا ہے کیونکہ میرا ذہن بھی اس طرف گیا تھا مگر اس کا دعویٰ ہے کہ جب سے مقتولہ گرومندر سے گئی ہے، اس نے مقتولہ کی شکل دیکھی ہے اور نہ ہی اس سے کسی قسم کا کوئی رابطہ ہوا ہے۔ مجھے امید بلکہ یقین ہے کہ میرا بھائی مجھ سے غلط بیانی نہیں کر رہا۔''

''اگر تمہارے یقین اور تمہارے بھائی کے دعوے کو سچ مان لیا جائے تو پھر یہ معمہ حل کرنا بہت دشوار ہو جائے گا کہ مقتولہ سینما کے پروجیکشن روم میں کیسے پہنچی؟'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔

ملزم کا بڑا بھائی بھی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

چند لمحات کے سوچ بچار کے بعد میں نے پوچھا۔ ''وقوعہ کو پیش آئے تین دن گزر چکے ہیں۔ اب تک یقیناً مقتولہ کا پوسٹ مارٹم بھی ہو چکا ہو گا۔ تم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟''

''اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' اس نے بتایا۔

''تمہارے بھائی کو تو کچھ پتہ ہو گا؟'' میں نے استفسار کیا۔

''میں نہیں جانتا۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ باقی باتیں آپ میرے بھائی سے تھانے میں جا کر پوچھ لیں۔''

''ٹھیک ہے، میں دفتر سے اٹھنے کے بعد اس سے تھانے جا کر ملاقات کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم کل کسی وقت میرے دفتر میں آ جانا۔ دفتری اوقات تو تمہیں معلوم ہی ہیں۔ میں ملزم سے ملاقات کے بعد تم سے زیادہ بہتر طور پر بات کر سکوں گا۔''

''ٹھیک ہے سر!'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں باہر انتظار گاہ میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ میں بھی آپ کے ساتھ تھانے جانا چاہتا ہوں۔''

میں نے ایک لمحہ سوچا اور اسے اپنے انتظار کی اجازت دے دی۔ وہ دروازے کی جانب مڑنے سے قبل بولا۔

''سر! میں آپ کی فیس، آپ کی سیکرٹری کے پاس جمع کروا دوں؟''

''تم سے فیس بھی لے لیں گے یار۔'' میں نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''پہلے تمہارے بھائی

سے مل کر صورتحال کا جائزہ تو لے لوں۔ فیس کہیں بھاگی جا رہی ہے۔"

وہ بہ صد اصرار بولا۔ "سر! یہ کیس تو آپ کو لینا ہی ہے، مجھے پورا یقین ہے آپ میرے بھائی سے مل کر مطمئن ہو جائیں گے۔ وہ بیچارہ کسی سازش کے نتیجے میں اس مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ آپ کو اس کی بے گناہی کا یقین آ جائے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ "تم سیکرٹری کے پاس میری فیس جمع کروا دو۔"

اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ آج کل میں اس قسم کے مقدمات کی کتنی فیس لے رہا ہوں۔ نہ ہی میں نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔ اس کے بیان کردہ حالات سے ظاہر تھا کہ وہ با آسانی میری فیس ادا کر سکتا تھا۔ تاہم تعلقاتِ دیرینہ بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ پوری طرح میری فیس کا متحمل تھا لیکن میں نے انٹرکام پر اپنی سیکرٹری سے کہہ دیا کہ وہ اس سے فیس وصول کرتے ہوئے بیس فیصد رعایت کر دے۔ میں اس کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

انٹرکام پر ہی میری سیکرٹری نے بتایا کہ انتظار گاہ میں کافی رونق لگی ہوئی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے، تم نمبر وار کلائنٹس کو میرے پاس بھیجنا شروع کر دو۔"

اس کے بعد میں اپنی دفتری مصروفیات میں مگن ہو گیا۔

✱☆✱

جب ہم متعلقہ تھانے پہنچے تو رات کے نو بج رہے تھے۔

میں نے اپنی گاڑی تھانے کی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور ملزم کے بھائی کے ہمراہ تھانے کے اندر آ گیا۔ ایس ایچ او اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ ڈیوٹی افسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ میں نے اپنا تعارف کروانے کے بعد کہا۔

"میں اپنے موکل سے ایک مختصر سی ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ روکھے پھیکے انداز میں بولا۔ "ملزم ریمانڈ پر ہے۔ ہم تفتیش کر رہے ہیں۔ ہم آپ کو ملزم سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔"

"ایس ایچ او صاحب کہاں ہیں؟" میں نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

"وہ راؤنڈ پر ہیں۔" اس نے بتایا۔ "آپ چاہیں تو باہر بیٹھ کر ان کا انتظار کر سکتے ہیں۔ انچارج صاحب کی اجازت کے بغیر میں آپ کو ملزم سے نہیں ملوا سکتا۔"

میں نے فون کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ضروری ٹیلی فون کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ کس کو فون کرنا چاہتے ہیں؟" اس نے چونک کر میری جانب دیکھا۔

میں نے کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب کو۔"

"کک...... کیوں؟" وہ اٹکتے ہوئے بولا۔

"بس ہے کوئی ضروری بات۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

وہ میرے انداز کی معنی خیزی کو بڑی وضاحت سے سمجھ گیا۔ اس نے ایک کانسٹیبل کو کمرے میں بلا کر تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب کو ملزم کے پاس لے جاؤ۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "وکیل صاحب! آپ کو جو بھی پوچھنا ہے، دس منٹ میں ملزم سے پوچھ لیں۔"

"کیوں، دس منٹ میں کیا قیامت آنے والی ہے؟" میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ تیزی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں، جی ہاں۔ آپ یونہی سمجھیں کہ قیامت آنے والی ہے۔ ہمارے انچارج صاحب کسی قیامت سے کم نہیں ہیں۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ میں نے آپ کو ملزم سے ملاقات کی اجازت......"

"بس بس، جعلی عکس ڈالنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تھانہ انچارج صاحب گیارہ بارہ سے پہلے آئیں گے نہیں اور ابھی سوا نو بجے ہیں۔ بالفرض محال وہ کسی ہنگامی صورت میں واپس آ بھی گئے تو میں خود ان سے بات کر لوں گا۔ تمہیں کسی مصیبت میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔"

اس نے کانسٹیبل کو ہمیں لے جانے کا اشارہ کر دیا۔ کانسٹیبل معاملہ فہم اور موقع شناس نہیں تھا، پوچھ بیٹھا۔ "سر! آن کو کون سے ملزم کے پاس لے جاؤں۔ حوالات میں تو تین چار بندے ہم نے بند کر رکھے ہیں؟"

سب انسپکٹر میری وجہ سے پہلے ہی بہت تپا ہوا تھا، گرج کر بولا۔ "وہ جو تمہارا باپ نہیں ہے، تین سو دو والا؟ اس کے پاس لے جاؤ۔ اس نے سینما کے اندر ایک لڑکی کو قتل کیا ہے۔"

کانسٹیبل نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اچھا اچھا، وہ بندہ جو فلم چلاتا ہے سینما میں۔" پھر وہ ہماری جانب مڑتے ہوئے بولا۔ "آئیں جی میرے ساتھ۔"

"آئیں جی نہیں۔" سب انسپکٹر نے اسے جھڑک کر کہا۔ "تم صرف وکیل صاحب کو ساتھ لے جاؤ۔" پھر اس نے ملزم کے بھائی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم باہر برآمدے میں جا کر بیٹھو۔ ہم نے اسی مقصد کے لئے وہیں لمبی لمبی بینچیں ڈال رکھی ہیں۔"

میں ملزم کے بھائی کو نظر انداز کرتے ہوئے کانسٹیبل کے ساتھ حوالات کی جانب بڑھ گیا۔ وہ سیدھا مجھے ملزم کے پاس لے گیا۔ ملزم ایک دراز قامت دبلا پتلا شخص تھا۔ اس نے مناسب سی مونچھیں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس کی گندمی رنگت میں تانبے کی سی تیزی تھی۔ وہ ایک خاموش طبع شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی نے ڈیرا جما رکھا تھا۔

وہ جس قسم کے حالات سے گزر رہا تھا اس میں انسان کچھ اسی قسم کا ہو جاتا ہے۔ میں نے اپنے ساتھ آنے والے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟''

اس نے ایک قابل شرم اماؤنٹ بتایا اور خجالت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''تمہارے گھر میں گوشت کتنے دن پکتا ہے؟''

''مہینے میں ایک آدھ بار۔'' اس نے ہچکچاتے ہوئے بتایا۔

''اور مٹھائی گھر لے جائے ہوئے تمہیں کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

''کئی ماہ گزر گئے ہیں وکیل صاحب۔'' وہ حسرت انگیز انداز میں گویا ہوا۔

میں نے کہا۔ ''آج تم اپنے ساتھ گھر جاتے ہوئے موسمی پھل اور مٹھائی بھی لے جاؤ گے اور کل تمہارے گھر میں مرغی پکے گی۔ کیا سمجھے؟''

''کچھ بھی نہیں سمجھا وکیل صاحب!'' وہ ہونقوں کی طرح مجھے تکنے لگا۔

میں نے اپنے پرس سے پچاس روپے کا ایک کرارا سا نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہارا انعام ہے، رکھ لو۔''

''کس بات کا انعام جناب؟'' اس کی حیرت دوچند ہو گئی۔ ''میں نے تو آپ کے لئے کوئی بھی کارنامہ انجام نہیں دیا۔''

میں نے کہا۔ ''کارنامہ تم اب انجام دو گے۔''

وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے سمجھانے والے انداز میں اسے دیکھا۔ ''میں ملزم سے تنہائی میں دو باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ تنہائی مجھے تمہارے طفیل میسر ہو گی۔ یہی تمہارا کارنامہ ہو گا۔''

وہ پچاس روپے کے کڑک نوٹ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے متامل انداز میں بولا۔ ''اگر انسپکٹر صاحب کو پتہ چل گیا تو وہ میری کھال......''

''کچھ نہیں ہو گا۔'' میں نے اسے جملہ مکمل نہیں کرنے دیا اور خود کہا۔ ''تمہارے ایس آئی صاحب کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔ نہ تم بتانا اور نہ ہی میں کوئی ذکر کروں گا۔ اللہ اللہ، خیر سلا!''

اس نے رضامندانہ انداز میں سر ہلایا اور نوٹ کو میری انگلیوں سے اچک کر فوراً اپنی ڈھیلی ڈھالی پتلون کی جیب میں ٹھونس لیا۔

میں نے آئندہ بیس پچیس منٹ میں کانسٹیبل کی مہیا کردہ ''تنہائی'' میں ملزم سے بھرپور ملاقات کر لی۔ اس طویل سوال و جواب میں، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ملزم نے مقتول کو قتل نہیں کیا تھا۔ ملزم نے بیشتر وہی باتیں مجھے بتائی تھیں جن کا ذکر اس کا بڑا بھائی پہلے ہی مجھ سے کر چکا تھا تاہم کچھ معاملات تحقیق طلب تھے جن کے لئے مجھے ملزم کے بھائی کا تعاون درکار تھا۔ اگر وہ میرے اشاروں پر بھاگ دوڑ کر کے میری مطلوبہ معلومات مجھے فراہم کر دیتا تو اس مقدمے کا پانسہ میں

ملزم کے حق میں پلٹ سکتا تھا۔

میں جب ملزم سے ملاقات کے بعد ایس ایچ او کے کمرے کے پاس سے گزر رہا تھا تو مجھے معلوم ہوا کہ انچارج صاحب تشریف لا چکے ہیں۔ میں نے سرِ راہ اس سے ملاقات کرنے میں کوئی حرج نہ جانا اور ''السلام علیکم'' کہتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''آیئے آیئے وکیل صاحب!'' وہ میرے سلام کا جواب دینے کے بعد طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ملزم یعنی اپنے موکل سے ملاقات کے بعد آپ کس نتیجے پر پہنچے ہیں؟''

''وہ سراسر بے گناہ ہے۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے آپ معاملات کی سنگینی سے پوری طرح آگاہ نہیں ہیں۔'' وہ معنی خیز انداز اختیار کرتے ہوئے بولا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس سنگینی سے آپ ہی مجھے روشناس کروا دیں۔''

وہ بولا۔ ''ملزم پر قتل جیسا سنگین اور خطرناک الزام ہے۔ اس نے ایک دیرینہ محبوبہ کو قتل کیا۔ پہلے دھوکے سے اسے فلم دکھانے کا جھانسا دے کر وہ سینما لے گیا پھر وہاں پروجیکشن روم میں اس کا گلا دبا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔''

''واہ، بڑی دلچسپ اور سنسنی خیز کہانی ہے۔'' میں نے اپنے چہرے پر مصنوعی سنجیدگی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ کا حکم ہو تو فوراً اس کہانی پر یقین کر لوں؟''

''اگر آپ مذاق کے موڈ میں ہیں تو میں بھی اب کوئی سنجیدہ بات نہیں کروں گا۔'' وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''جناب! یہ ظلم نہ کریں۔ میں آپ کی ناراضگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں تو آپ سے بات چیت کی خاطر اس کمرے میں آیا ہوں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ اب کوئی سنجیدہ بات نہیں کریں گے۔''

وہ منہ پھلائے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

میں نے اپنے لہجے کو دوستانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ایس ایچ او صاحب! میرا موکل ملزم ہے یا وکیل استغاثہ عدالت میں اسے مجرم ثابت کر دیتا ہے، اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہو گا۔ آپ خواہ مخواہ ہی ناراض ہو رہے ہیں۔''

وہ چڑچڑے انداز میں بولا۔ ''آپ باتیں ہی ایسی کر رہے ہیں وکیل صاحب!''

میں نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا اور مسکراتے ہوئے کہا ''چلیں، اب میں اس قسم کی کوئی بات منہ سے نہیں نکالوں گا۔ آپ یہ بتائیں، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کیا بتاتی ہے؟''

''اس کا ذکر ہم اپنے چالان میں کر دیں گے۔'' وہ بدستور ناراض لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ کو بہت جلدی ہو تو عدالت سے رجوع کریں۔''

میں سمجھ گیا، وہ سیدھے منہ بات نہیں کرے گا۔ میں نے ایک دوسرے انداز سے گھسنے کی کوشش کی اور پوچھا۔

''آپ ملزم پر دفعہ کون سی لگا رہے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''دفعہ تین سو دو...... یعنی قتل عمد۔ اس کے علاوہ بھی ایک خطرناک دفعہ اس پر لگائی جائے گی۔ یہ مقدمہ لڑتے ہوئے آپ کو دانتوں پسینہ آ جائے گا وکیل صاحب!''

''تین سو دو میں تو میں اسے چھڑا لوں گا۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''وہ کون سی دفعہ ہے جس سے دانتوں پسینے آ جائیں گے؟''

''جو کچھ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے، وہ دفعہ اسی کے پیش نظر لگائی جائے گی۔'' اس نے سنسناتی ہوئی آواز میں کہا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے لئے مجھے عدالت سے رجوع کرنا ہوگا۔ ہے نا؟''

''چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گے وکیل صاحب!'' وہ میری چوٹ پر بگڑنے کی بجائے سیدھے راستے پر آ گیا۔ ''میں آپ کو پوسٹ مارٹم کی سب سے اہم خبر کے بارے میں بتا دیتا ہوں۔''

میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ انکشاف انگیز لہجے میں بولا۔ ''مقتولہ کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل مجرمانہ حملے کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ اب آپ خود سمجھ لیں کہ آپ کا موکل کس پوزیشن میں ہے؟ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔''

'میرے موکل کی پوزیشن کو میرے سوا اور کوئی نہیں جان سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بھی آپ درست فرما رہے ہیں کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو چیلنج کرنا مشکل ہوتا ہے مگر میں یہ ضرور ثابت کر دوں گا کہ اس تمام کارروائی میں میرا موکل کسی بھی طور ملوث نہیں۔ مقتولہ کے ساتھ زیادتی کے بعد اسے قتل ضرور کیا گیا ہوگا لیکن یہ کام میرے موکل کا نہیں ہو سکتا۔''

وہ عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''آپ کس بنا پر ثابت کریں گے کہ آپ کے موکل نے مقتولہ پر مجرمانہ حملہ کیا ہے اور نہ ہی اسے فنا کے گھاٹ اتارا ہے؟''

''آپ کے ان سوالوں کا جواب میں عدالت میں دوں گا۔'' میں نے کہا پھر پوچھا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں مقتولہ کی موت کا کیا وقت درج ہے؟''

''اب میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''آپ سے جو بھی مکالمت ہوگی وہ عدالت کے کمرے ہی میں ہوگی۔''

میں اٹھ کر کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے تھانیدار صاحب! خدا حافظ۔''

میں ایس ایچ او کے کمرے سے باہر آیا تو چوبی بینچ پر بیٹھا ملزم کا بڑا بھائی اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چلتے ہوئے تھانے سے باہر آنے لگے تو اس نے پوچھا۔

''وکیل صاحب! میرے بھائی نے آپ کو کوئی مفید اور کارآمد بات بھی بتائی؟''

''ہاں، بہت سی۔'' میں نے گاڑی کے قریب پہنچ کر کہا۔

''اور تھانیدار سے کیا گفتگو ہوئی؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے اس کے لئے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول دیا اور کہا۔ ''بس اتنا پتہ چلا ہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کو زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد موت کے سپرد کیا گیا تھا۔ خیر، میں خود اس رپورٹ کا مطالعہ کروں گا۔''

وہ گاڑی کے اندر بیٹھنے کے بعد بولا۔ ''وکیل صاحب! معاملہ تو الجھتا ہی جا رہا ہے۔''

''وہ کیسے بھئی؟'' میں نے اس کے خیالات جاننا چاہے۔

وہ سراسیمہ لہجے میں گویا ہوا۔ ''میرا بھائی تو پہلے ہی قتل کے شبے میں پولیس کی تحویل میں ریمانڈ پر ہے۔ اب یہ نیا چکر مجرمانہ حملے کا چل نکلا ہے۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ میرا بھائی نہ تو قاتل ہے اور نہ ہی بدکردار۔''

وہ خاصا جذباتی ہونے لگا۔ میں نے گاڑی کو اسٹارٹ کر کے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جب تمہارے بھائی نے قتل نہیں کیا اور نہ ہی اس نے مقتولہ کو مجرمانہ حملہ کا نشانہ بنایا ہے تو پھر اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے جبکہ تم مجھے وکیل بھی کر چکے ہو۔''

''وکیل صاحب! آپ میرے بے گناہ بھائی کو اس وبال سے نکال لیں گے نا؟'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے سنجیدہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، میں تمہارے بھائی کو بچانے کے لئے اپنا سارا علم اور تجربہ داؤ پر لگا دوں گا لیکن اس مہم میں تمہیں مجھ سے بہت تعاون کرنا ہوگا۔''

''آپ حکم کریں وکیل صاحب۔'' وہ مضطربانہ انداز میں دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں میری ہدایت کے مطابق چند اہم نوعیت کی معلومات حاصل کرنا ہوں گی جس کے لئے تمہیں اچھی خاصی دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی۔''

''میں اپنے بھائی کی سلامتی کے لئے آپ کا ہر حکم ماننے کو تیار ہوں۔'' وہ سراپا نیاز دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے مقتولہ، اس کے والدین، سینما کے اہم افراد اور مقتولہ کی روزمرہ معروفیات کے بارے میں چند باتیں معلوم کرنے کے لئے اسے بتایا اور کہا۔ ''تم جلد از جلد میری مطلوبہ معلومات جمع کر لاؤ تا کہ عدالتی مقابلے کی تیاری کی جا سکے۔''

''آپ بے فکر ہو جائیں وکیل صاحب!'' وہ پُراطمینان انداز میں بولا۔ ''میں چند روز میں یہ تحقیق مکمل کر لوں گا۔''

میں نے گرو مندر کی بڑی مسجد کے سامنے اسے اتار دیا۔ وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہوا تو

میں نے اپنی گاڑی کو گھر جانے والی سڑک پر ڈال کر اس کی رفتار بڑھا دی۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔

عام طور پر میں دس بجے تک گھر پہنچ جایا کرتا تھا تاہم کبھی کبھار کسی ٹریفک کے سبب تاخیر بھی ہو جایا کرتی تھی جیسا کہ آج ہوا تھا۔ دیر سویر پیشہ ورانہ زندگی کا حصہ ہے۔ اس سے فرار ممکن نہیں۔

※☆※

پولیس نے ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ اس طویل رپورٹ میں پولیس نے جو موقف اختیار کیا تھا، میں اس کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

پولیس کے بیان کے مطابق ملزم ایک طویل عرصے سے مقتولہ کی تاک میں تھا۔ جب سے مقتولہ کے گھر والوں نے ملزم کے رشتے سے انکار کیا تھا، وہ اپنے دل میں ان کے لئے بہت عناد رکھتا تھا اور خاص طور پر جب مقتولہ نے اس سے واضح طور پر کہہ دیا کہ وہ اس کے راستے میں نہ آئے، اس دن کے بعد سے ملزم نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ایک نہ ایک دن مقتولہ کو ضرور سبق سکھائے گا اور بالآخر وقوعہ کے روز ملزم نے کسی طرح مقتولہ کو اپنے چنگل میں پھنسا کر سینما کے پروجیکشن روم تک آنے پر آمادہ کر لیا پھر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانے کے بعد موت کے گھاٹ اتار دیا۔

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ کا سہارا لے کر چالان کی رپورٹ آپ تک پہنچائی ہے۔ ورنہ اس مفہوم کو واضح کرنے کے لئے پولیس نے کئی صفحات پر مشتمل ایک دفتر تیار کیا تھا۔

جب جج اپنی کرسی پر براجمان ہو چکا تو عدالتی کارروائی کا آغاز ہوا۔ جج نے فرد جرم پڑھ کر ملزم یعنی میرے موکل کو سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے انکار کرتے ہوئے احتجاجی لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے کسی انسان کی جان لی ہے اور نہ ہی کسی لڑکی کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا ہے۔ مجھے کسی گہری سازش کے تحت اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔''

عدالت میں ملزم کو از خود بولنے کی اجازت نہیں ہوتی الا یہ کہ اسے جج کی اجازت حاصل نہ ہو جائے۔ میرے موکل نے اس حوالے سے خاصی بڑی جرأت کا مظاہرہ کر ڈالا تھا۔

جج نے ناگواری سے ملزم کو دیکھا اور میری طرف گردن موڑتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں وکیل صاحب؟''

میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے کاغذات جج کے سامنے رکھنے کے بعد ضمانت کے حق میں دلائل دینا شروع کئے مگر مجھے آدھے گھنٹے کی کوشش کے باوجود بھی کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل ہوتی ہے۔ میرا موکل مقتولہ کے حوالے سے خطرناک قسم کا پس منظر رکھتا تھا۔ خاص طور پر اس کے رشتے سے انکار کو استغاثہ نے ایک ایشو کے طور پر پیش کرنے سے قبل خاصا بڑھا چڑھا لیا تھا۔

جج نے اس مقدمے کی باقاعدہ کارروائی کے لئے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو ملزم کے بڑے بھائی نے مجھ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کیا محسوس کرتے ہیں۔ ضمانت میں ناکامی کے بعد اس کیس پر ہماری گرفت کیسی ہے؟''

''ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

''یعنی آپ پوری طرح مطمئن ہیں؟''

''تم تو میرے مزاج اور کام کرنے کے انداز کو اچھی طرح جانتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک عرصے تک میرے ساتھ کام کر چکے ہو۔ تمہارے خیال میں کیا میں مطمئن نظر نہیں آ رہا ہوں؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''وکیل صاحب! دراصل آپ بہت گہرے آدمی ہیں۔ آپ کی کیفیت اور ظاہرہ حالت کو دیکھ کر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ آپ اپنے دلی جذبات اور احساسات کو چھپانے پر قادر ہیں۔''

''اب میں اتنا بھی گہرا نہیں ہوں بھائی۔'' میں نے چلتے چلتے رک کر کہا۔ وہ بھی میرے ساتھ ہی رک چکا تھا۔ میں نے واضح الفاظ میں کہا۔ ''تم فکر نہ کرو۔ کیس پر میری گرفت بہت مضبوط ہے۔ تمہارے بھائی کی ضمانت نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ انشاء اللہ باعزت بری ہو جائے گا۔ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو، قتل کے کیس میں ملوث افراد کی ضمانت آسانی سے نہیں ہوتی۔''

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا اور پھر بولا۔ ''مجھے اس بات سے تسلی ہے کہ آپ مطمئن ہیں۔''

میں نے اپنی گاڑی کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے استفسار کیا۔ ''ان کاموں کا کیا ہوا جو میں نے تمہارے سپرد کئے تھے؟''

''آدھے سے زیادہ کام ہو چکے ہیں۔'' وہ فخریہ انداز میں بولا۔ ''عدالت کی باقاعدہ کارروائی شروع ہونے سے پہلے پہلے باقی بھی ہو جائیں گے۔''

میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''ویری گڈ، ویری گڈ۔ جو کام تم سرانجام دے چکے ہو ان کی تفصیل کیا ہے؟''

وہ مجھے اپنی کارکردگی کی رپورٹ دینے لگا۔

تھوڑی دیر بعد ہم اپنی منزل کی جانب روانہ ہو چکے تھے۔

※☆※

استغاثہ کی جانب سے کم و بیش نصف درجن گواہوں کی فہرست دائر کی گئی تھی۔ اس موقع پر میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اس رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت رات بارہ سے دو بجے کے درمیان ہوئی تھی اور اسے باقاعدہ گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔

تھانیدار کی بات بھی بالکل ٹھیک تھی۔ مقتولہ کو زندگی کی قید سے رہائی دلانے سے قبل مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ استغاثہ نے یہ جرم بھی نہایت صفائی کے ساتھ میرے موکل کے کھاتے میں ڈال دیا تھا۔

آئندہ پیشی پر گواہوں کے بیان کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے سب سے پہلے اس کیس کے تفتیشی افسر کا بیان ہوا۔ اس نے استغاثہ کی حمایت میں ایک لمبا چوڑا بیان ریکارڈ کروایا۔ وکیل استغاثہ نے دو چار رسمی سوالات کے بعد اپنی جرح ختم کر دی۔ اس کے بعد میری باری آئی۔

میں اس کٹہرے کے نزدیک آ گیا جس میں تفتیشی افسر کھڑا تھا۔ وہ پستہ قامت کا مالک ایک سب انسپکٹر تھا۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور تفتیشی افسر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''میں آپ کو تفتیشی افسر کہوں یا انکوائری افسر یا آئی او کہوں؟''

''آپ مجھے ان میں سے کسی بھی حوالے سے پکار سکتے ہیں۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔ ''ویسے آپ چاہیں تو مجھے سب انسپکٹر بھی کہہ سکتے ہیں اور میرا نام پکارنے کی بھی آپ کے لئے کوئی ممانعت نہیں۔'' اپنی بات ختم کر کے اس نے اپنا نام بھی بتایا۔

میں نے کہا۔ ''میں آپ کو آئی او (انکوائری افسر) کہہ کر ہی پکاروں گا۔ یہ مختصر سا طرزِ تخاطب ہے۔ اس سے معزز عدالت کا قیمتی وقت بھی ضائع نہیں ہوگا۔''

آخری جملہ میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے ادا کیا تھا۔ وہ میرے اس پہلے ہی حملے سے پہلو بدل کر رہ گیا تھا۔ میں اس کی غصہ بھری نظر کو نظر انداز کرتے ہوئے انکوائری افسر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''آئی او صاحب!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کو یہ اطلاع کس وقت ملی کہ مقامی سینما میں کوئی قتل کی واردات ہو گئی ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''ہمارے تھانے کی گھڑی میں اس وقت ٹھیک گیارہ بجے تھے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے تھانے کی گھڑی پاکستان کے معیاری وقت سے کتنے گھنٹے آگے یا پیچھے ہے؟''

''وہ پاکستان کے معیاری وقت کے عین مطابق ہے۔''

''حیرت ہے!'' میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''آپ موقع واردات پر کتنے بجے پہنچے تھے؟''

اس نے بتایا۔ ''ہمیں اس سینما تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگا تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ ہم جائے وقوعہ پر بارہ بجے دوپہر تک پہنچے ہوں گے۔''

''اتنی تاخیر سے!'' میں نے کہا۔ ''جبکہ مذکورہ مقامی سینما آپ کے تھانے سے صرف پندرہ

بیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔ کیا آپ نے یہ فاصلہ پیدل چلتے ہوئے طے کیا تھا؟''

وہ بوکھلا کر مجھے دیکھنے لگا پھر متحمل لہجے میں بولا۔ ''آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہم تھانے میں اس حالت میں نہیں بیٹھے تھے کہ ابھی سینما سے کوئی فون آنے والا ہے اور ہمیں فوراً وہاں پہنچنا ہوگا۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے اضافہ کیا۔ ''تھانے سے نکلنے سے قبل کچھ نہ کچھ تیاری تو کرنا ہی ہوتی ہے نا۔ ویسے میں بتا دوں کہ میں پیدل نہیں بلکہ پولیس کی گاڑی میں جائے واردات پر پہنچا تھا۔''

میں نے اس کے جواب کے پہلے حصے کو نشانہ بناتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے یہ عجیب بات کر دی ہے آئی او صاحب! میں نے تو سنا تھا آپ لوگ تھانے میں چوبیس گھنٹے آن ڈیوٹی رہتے ہیں یعنی ریڈ الرٹ رہتے ہیں؟''

اس نے میرے اس طنزیہ سوال کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اگلے سوال کے لئے منتظر نگاہ سے میری جانب دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی خواہش پوری کرتے ہوئے پوچھا۔

''آئی او صاحب! آپ کو اس واردات کی اطلاع کس نے دی تھی؟''

''سینما کے منیجر نے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ نے موقع واردات پر پہنچ کر کیا دیکھا تھا؟''

وہ بولا۔ ''جب میں دو کانسٹیبلوں کے ساتھ مذکورہ سینما پہنچا تو ہمیں سیدھا اوپر پروجیکشن روم میں لے جایا گیا تھا۔ وہاں میں نے مقتولہ کی لاش دیکھی تھی۔

میں نے کہا۔ ''سینما کے پروجیکشن روم میں آپریٹر عموماً کھڑے ہو کر یا کسی اسٹول وغیرہ پر بیٹھ کر پروجیکٹر کو آپریٹ کرتا ہے یعنی فلم چلاتا ہے۔ کیا پروجیکشن روم میں اتنی جگہ تھی کہ استغاثہ کے مطابق مقتولہ پر وہاں مجرمانہ حملہ کیا گیا ہو؟''

''جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جب انسان کی نیت خراب ہو جائے تو پھر اسے منہ کالا کرنے کے لئے زیادہ جگہ کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ شیطان اپنے پیروکاروں کو نئی سے نئی راہ سجھا دیتا ہے۔''

''واہ واہ، سبحان اللہ۔'' میں نے طنزیہ انداز میں اسے سراہا اور کہا۔ ''لگتا ہے آپ کو غیب کا علم آتا ہے۔''

''میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔'' وہ حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''آئی او صاحب! اگر آپ غیب داں نہیں تو پھر آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میرے موکل کی نیت خراب ہو چکی تھی اور...... یہ کہ وہ شیطان کا پیروکار ہے؟''

''یہ جاننے کے لئے کسی پراسرار علم کی ضرورت نہیں وکیل صاحب۔'' انکوائری افسر نے مدبرانہ انداز میں کہا۔ ''وقوعہ سے ملنے والی لاش اور پوسٹ مارٹم سے سب کچھ ظاہر ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ صرف یہ بتاتی ہے کہ مقتولہ کو قتل کرنے سے پہلے مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ اس قسم کے قبیح افعال میرے موکل سے سرزد ہوئے ہیں۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں۔'' وہ چڑ کر بولا۔ ''مقتولہ کی لاش پروجیکشن روم سے دریافت ہوئی ہے اور وہاں ملزم کے سوا اور کوئی آتا جاتا نہیں۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آپ کی اطلاع کے لئے عرض کرتا چلوں کہ پروجیکشن روم میں صرف میرے موکل کی ہی آمد و رفت نہیں، وہاں اور لوگ بھی آتے جاتے ہیں۔ ایک مثال تو خاکروب ہی کی ہے جس نے مقتولہ کی لاش کو سب سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ روزانہ صفائی کی غرض سے پروجیکشن روم میں جاتا ہے۔'' ایک لمحے کو میں سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ کوئی فارمولا نہیں کہ اگر مقتولہ کی لاش پروجیکشن روم سے ملی ہے تو اسے قتل بھی پروجیکٹر آپریٹر ہی نے کیا ہوگا۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں تصدیق کی زحمت کی تھی؟''

''کس قسم کی تصدیق؟'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''ایسے موقع پر فنگر پرنٹس اٹھائے جاتے ہیں۔''

''ہم نے پروجیکشن روم کے مختلف حصوں سے فنگر پرنٹس اٹھائے تھے۔'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''وہاں متعدد مقامات پر ملزم کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔''

میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں مقتولہ کی گردن پر پائے جانے والے فنگر پرنٹس کی بات کر رہا ہوں۔ چالان کی رپورٹ میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔''

وہ خجل سا ہوتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے مقتولہ کی گردن کو چیک نہیں کیا۔''

''حالانکہ سب سے زیادہ اسی چیز کو چیک کرنے کی ضرورت تھی۔''

''ہم نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''لاش ملزم کے مقام کار سے دریافت ہوئی تھی۔ اس کے سوا اور کون قاتل ہوسکتا ہے جبکہ اس کا ماضی بتاتا ہے کہ وہ مقتولہ سے گہری رنجش بھی رکھتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر کسی شخص کی لاش آپ کے تھانے کی حدود کے اندر پائی جائے یعنی تھانے کی عمارت کے کسی حصے سے دریافت ہو تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس شخص کو ایس ایچ او صاحب نے قتل کیا ہے؟''

میرے اس چبھتے ہوئے سوال پر انکوائری افسر بغلیں جھانکنے لگا۔ میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے جج سے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کی اس بہت بڑی خامی کو میں عدالت کے ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ مقتولہ کی گردن پر سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات کو اٹھانے کی زحمت نہیں کی گئی ہے، اسے عام الفاظ میں پولیس کی کوتاہی یا سہل پسندی بھی کہا جاسکتا ہے۔'' ایک لمحے کو

رک کر میں نے وکیل استغاثہ کو دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں واضح کیا گیا ہے کہ ''گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔'' اس صورت میں مقتولہ کی گردن سے قاتل کی انگلیوں کے نشانات اٹھانا بہت ضروری تھا۔ مگر استغاثہ میں ایسا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی انکوائری افسر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے کو تیار ہیں۔''

میں نے دیکھا کہ میرے توجہ دلانے پر جج نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وکیل صاحب! آپ جرح جاری رکھیں۔''

میں انکوائری افسر کی جانب متوجہ ہوگیا۔ ''آئی او صاحب! آپ نے ملزم کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا تھا؟''

''ہم نے اسے اس کے گھر سے گرفتار کیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اگر ہمیں وہاں پہنچنے میں ذرا دیر ہوجاتی تو وہ گھر سے نکل چکا ہوتا۔ یہ گرفتاری لگ بھگ ڈیڑھ بجے دوپہر کو ہوئی تھی۔''

میں نے زاویہ سوالات کو ذرا تبدیل کرتے ہوئے کہا۔ ''آئی او صاحب! ملزم کو گرفتار کرنے کے بعد آپ نے اس کا طبی معائنہ کیا یا کروایا تھا؟''

وہ طبی معائنے سے کوئی دوسرا ہی مطلب نکال بیٹھا، طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ہم نے ملزم کو جب گرفتار کیا اس وقت مجرمانہ حملے اور قتل کی واردات کو بارہ گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔ اس دوران میں ملزم ایک بھرپور نیند لینے کے بعد نہا دھو کر تر و تازہ ہو چکا تھا اور ویسے بھی......'' اس نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا پھر میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کر دیا۔ ''اس قسم کے معائنے وعائنے مغرب والوں کے چونچلے ہیں۔ ہمارے یہاں ایسی نخرے بازی کی گنجائش کم ہی نکلتی ہے۔''

''ہمارے ہاں تو جو بھی بندہ آسانی سے ہتھے چڑھ جائے اسے پھانسی کے پھندے پر ٹانگ دیا جاتا ہے۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''آپ یہی کہنا چاہتے ہیں نا آئی او صاحب؟''

''اب میرا یہ مطلب بھی نہیں تھا۔'' وہ بگڑے ہوئے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''مغرب میں جو کچھ ہوتا ہے اسے چونچلے یا نخرے بازی کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہر شے کی اپنی اہمیت ہے۔ بہرحال، ملزم کے طبی معائنے سے میری مراد اس کا جسمانی معائنہ تھا۔ کیا آپ نے گرفتاری کے وقت ملزم کے ہاتھ پاؤں اور چہرے گردن وغیرہ کو چیک کیا تھا؟''

اس نے عجیب سی نظر میں مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

''آپ ''ہاں'' یا ''نہ'' میں جواب دیں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر میں وضاحت کرتا ہوں۔''

اس نے جواباً ''ہاں'' میں گردن ہلا دی۔

''اس کے چہرے، گردن یا ہاتھوں وغیرہ پر کسی چوٹ یا زخم کا نشان تھا؟''

وہ الجھن آمیز نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''نہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''جب سینما کے پروجیکشن روم میں آپ نے مقتولہ کی لاش کو دیکھا تو کیا اس کے ہاتھ کے ناخنوں پر نیل پالش موجود تھی؟''

اس نے مزید تعجب سے مجھے دیکھا۔ میرے سوال نے اس کی حیرت دوچند کردی تھی تاہم کوئی حجت کرنے کی بجائے اس نے جواب دیا۔

''ہاں، اس کے دونوں ہاتھوں کے یہ لمبے لمبے ناخن، نیل پالش سے سجے ہوئے تھے۔'' آئی او نے الفاظ ''یہ لمبے لمبے ناخن'' کی ادائیگی کے ساتھ ہی اپنے بائیں ہاتھ کی انگشت شہادت کو دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشت شہادت سے پکڑ کر کھینچنے کی اداکاری بھی کی تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب آپ وقوعہ پر پہنچے یعنی آپ نے جب سینما کے پروجیکشن روم میں قدم رکھا تو مقتولہ کی ظاہری حالت کیسی تھی؟''

''بس ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔'' اس نے مخمصے کی سی کیفیت میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''مقتولہ کے جسم پر لباس موجود تھا؟''

''ج..... جی موجود تھا۔''

''اور یہ ایک مجرمانہ حملے اور قتل کا کیس ہے؟''

''جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے جرح ختم کرنے کا اعلان کردیا۔

میرے اس اعلان پر جج نے عدالت کے کمرے کی دیوار پر آویزاں گھڑیال کو دیکھا۔ عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ اس قلیل مدت میں استغاثہ کے دوسرے گواہ کی شہادت نہیں ہوسکتی تھی اس لئے جج نے اگلی تاریخ دے کر عدالت برخاست کردی۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں مقامی سینما کا منیجر بہ نفس نفیس کھڑا تھا۔ مذکورہ منیجر کی عمر پچپن کے قریب ہوگی۔ اس کی کنپٹیوں کے بال سفید ہوچکے تھے۔ وہ بھاری جسم کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔ وہ ٹو پیس سوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے میچنگ ٹائی بھی لگا رکھی تھی۔

منیجر نے اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروا دیا تو وکیل استغاثہ سوالات کے لئے آگے بڑھا۔ وہ گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ کر منیجر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا آپ روزانہ سینما جاتے ہیں؟''

''بالکل جناب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں سینما کا منیجر ہوں۔ میرا ڈیوٹی پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔''

''کیا وقوعہ کے روز بھی آپ سینما گئے تھے؟''

''ایک سو ایک فیصد گیا تھا۔'' منیجر نے جواب دیا۔

اب تک وکیل استغاثہ نے ایک بھی ڈھنگ کا سوال نہیں پوچھا تھا۔

وکیل استغاثہ نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سینما اسٹاف میں کل کتنے افراد کام کرتے ہیں؟''

''پانچ چھ تو بکنگ کلرک ہیں۔ یعنی ٹکٹ جاری کرنے والے۔'' منیجر نے بتایا۔ ''ان میں ایک وہ کلرک بھی شامل ہے جس کی ڈیوٹی صرف ایڈوانس ٹکٹ کی بکنگ ہے۔ ان کے علاوہ سینما کا سپروائزر ہے۔ نچلے درجے کی ٹکٹ ونڈو پر قطاریں بنوانے والے دو تین افراد ہیں۔ پھر پانچ گیٹ کیپرز ہیں۔ پروجیکٹر آپریٹر ہے۔ صفائی کرنے والا سوپر ہے وغیرہ وغیرہ۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے اس نے اضافہ کیا۔ ''سینما کا چوکیدار بھی ہمارے اسٹاف میں شامل ہے اور الیکٹریشن بھی۔''

سینما منیجر کے مفصل جواب کے بعد وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''ملزم آپ کے پاس کب سے کام کررہا ہے؟''

''میرے خیال میں اسے ہمارے سینما میں فلم چلاتے ہوئے کم وبیش ایک سال ہوگیا ہے۔'' منیجر نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا یہ سچ ہے کہ پروجیکٹر آپریٹر عموماً اپنے جاننے والوں کو پروجیکشن روم میں بٹھا کر مفت میں فلم دکھا دیتے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے تیز لہجے میں سوال کیا۔

منیجر نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ حقیقت ہے۔ لیکن آپریٹر کو اس کی اجازت ہوتی نہیں۔ سینما کے اصولوں کے مطابق یہ ایک جرم شمار ہوگا۔ تاہم یہ سچ ہے کہ چوری چھپے سینما اسٹاف کے کچھ افراد اپنے تعلق والوں کو مفت میں فلم دکھانے کا بندوبست کرلیتے ہیں۔ ایسے افراد میں گیٹ کیپرز سرفہرست ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''ملزم ایک سال سے آپ کے سینما میں پروجیکٹر آپریٹر کے طور پر کام کررہا ہے۔ یقیناً یہ بھی ''مفت فلم بینی'' اسکیم سے فائدہ اٹھاتا ہوگا؟''

''اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔'' وہ پُریقین لہجے میں بولا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''مقتول والے واقعے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملزم کے توسط سے مفت میں فلم بینی کا شوق پورا کرنے والوں میں خواتین وحضرات سبھی شامل تھے؟''

یہ ایک عجیب ٹیڑھا اور ذومعنی سوال تھا۔ منیجر نے اس کا جواب بڑا ڈپلومیٹک دیا۔ اس نے کہا۔

''جی ہاں، صاف ظاہر ہے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''منیجر صاحب! ملزم کے کردار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں سمجھا نہیں، آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مقتولہ کو پیش آنے والے سانحے سے پہلے بھی ملزم اس نوعیت کے کسی معاملے میں بھی ملوث پایا گیا ہے؟''

منیجر نے جواب دیا۔ ''میرے علم میں تو یہ پہلا واقعہ ہے۔ اگر ملزم نے اس سے قبل اس قسم کی کوئی حرکت کی ہو تو میں نہیں جانتا۔''

''کیا آپ مقتولہ کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

منیجر نے جواب دیا۔ ''صرف اتنا کہ وہ پی آئی بی کالونی کی رہنے والی تھی اور کسی زمانے میں ملزم کی طرف سے اس کے لئے شادی کا پیغام بھیجا گیا تھا جو مقتولہ کے گھر والوں نے مسترد کر دیا تھا۔ اس پر ملزم کافی عرصے تک پیچ و تاب کھاتا رہا تھا۔

مزید دو چار اسی قسم کے سوالات پوچھنے کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح ختم کر دی۔ پوری جرح کے دوران میں کوئی بھی ایسی بات سامنے نہیں آئی تھی جسے اہم کہا جاتا۔ وہ صرف ظاہر کر سکا تھا کہ کسی زمانے میں مقتولہ کے گھر والوں نے ملزم کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ شاید وکیل استغاثہ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ملزم نے ماضی کی اس ناکامیابی کا انتقام لینے کے لئے مقتولہ کو سینما میں بلا کر یا لا کر پہلے اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھایا اور ازاں بعد گلا گھونٹ کر اسے موت کی وادی میں دھکیل دیا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لئے گواہوں کے کٹہرے کے پاس آیا اور منیجر کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کتنے عرصے سے مذکورہ سینما میں منیجری کر رہے ہیں؟''

''تقریباً دس سال سے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اس سینما کا مالک کون ہے؟''

اس نے جواباً سینما کے مالک کا نام بتا دیا۔ میں نے سوال کیا۔ ''کیا آپ کے سینما اونر بھی سینما آتے جاتے ہیں؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''ان کی رہائش آج کل بیرون ملک ہے۔ وہ سال میں ایک آدھ چکر لگاتے ہیں۔''

''وہ کس ملک میں رہائش پذیر ہیں؟''

''انگلینڈ میں۔''

''ان کی غیر موجودگی میں سینما کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا پھر وضاحت بھی کر دی۔ ''میرا مطلب ہے، مالک کی حیثیت سے۔''

وہ میری بات کے مفہوم تک پہنچتے ہوئے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں سمجھ گیا آپ کیا پوچھنا چاہتے ہو۔ دراصل بات یہ ہے کہ سینما کے مالک اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں رہائش پذیر ہیں۔ اس سینما کے انتظام و انصرام اور دیکھ بھال کی ساری ذمے داری انہوں نے مجھ پر ڈال رکھی ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ ان کی غیر موجودگی میں، میں اس سینما کا مالک ہوں۔''

''پھر تو انہوں نے آپ کو کوئی ''پاور'' وغیرہ بھی دے رکھی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ اصل مالک کی غیر موجودگی میں آپ کو بعض قانونی معاملات سے بھی واسطہ پڑتا ہو گا۔''

وہ تائیدی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اس قسم کے معاملات سے سامنا ہوتا رہتا ہے اور ضرورت کے پیش نظر انہوں نے مجھے ''پاور آف اٹارنی'' دے رکھا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''وکیل استغاثہ سے آپ کے سوال جواب سے یہ تو پتہ چل گیا کہ آپ بلا ناغہ سینما جاتے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے سینما آنے جانے کے اوقات کیا ہیں؟''

''پہلے شو سے آخری شو تک۔'' اس نے جواب دیا۔

''اگر وقت بتا دیں تو زیادہ آسانی ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''پہلا شو عموماً ساڑھے تین بجے شروع ہوتا ہے اور آخری شو بارہ سے کچھ پہلے ختم ہوتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے آپ سہ پہر تین بجے سے رات بارہ بجے تک سینما میں موجود ہوتے ہیں؟'' میں نے تصدیقی انداز میں کہا۔

''نہیں جناب! ایسی بات نہیں۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''میں عموماً چار بجے سینما پہنچتا ہوں اور رات کے آخری شو چلنے کے بعد یعنی لگ بھگ دس بجے میں اپنے دفتر سے اٹھ جاتا ہوں۔ کبھی کبھار کوئی اہم معاملہ ہو تو دس بجے کے بعد بھی رک جاتا ہوں۔''

''وقوعہ کے روز آپ کتنے بجے سینما پہنچے تھے؟''

''چار بج کر دس منٹ پر۔''

''اس کا مطلب ہے جب آپ سینما پہنچے تو فلم کا شو چل چکا تھا یعنی ملزم پروجیکشن روم میں اپنی ڈیوٹی پر تھا۔'' میں نے کہا پھر سینما منیجر سے پوچھا۔ ''مذکورہ روز آپ سینما سے کتنے بجے رخصت ہوئے تھے؟''

''ٹھیک دس بجے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''یعنی جب آپ رخصت ہوئے تو اس وقت بھی ملزم اپنی ذمے داری نبھا رہا تھا۔ کیونکہ میرے خیال میں آخری شو ساڑھے نو بجے تک شروع ہو جاتا ہو گا؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تصدیق کی۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کی غیر موجودگی میں سینما کے انتظامی امور کون دیکھتا ہے؟''

''اس کام کے لئے میں نے ایک سپروائزر رکھا ہوا ہے۔'' منیجر نے بتایا۔ ''جب میں سینما میں موجود نہیں ہوتا تو مختلف امور کی دیکھ بھال وہی کرتا ہے۔''

''سپروائزر کی ڈیوٹی کے اوقات کیا ہیں؟''

''اس کی ڈیوٹی دوپہر سے آدھی رات تک ہے۔'' منیجر نے جواب دیا۔ ''عموماً وہ گیارہ بارہ بجے دوپہر آتا ہے اور رات کو آخری شو ختم ہونے کے بعد گھر چلا جاتا ہے۔''

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''منیجر صاحب! استغاثہ کا موقف ہے کہ ملزم نے وقوعہ کے روز مقتولہ کو اپنی زیادتی کا نشانہ بنانے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ آپ چونکہ استغاثہ کے گواہ ہیں اس لئے میں آپ سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ آیا یہ بات آپ کے علم میں تھی کہ اس روز ملزم کسی لڑکی کو فلم دکھانے پروجیکشن روم میں لے گیا تھا؟''

''ایسی کوئی بات میرے علم میں نہیں تھی۔'' اس نے صاف انکار کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ملزم کے بارے میں یہ بات عام ہے کہ وہ اپنے یاروں، دوستوں اور تعلق داروں کو مفت فلم دکھانے پروجیکشن روم میں لے جاتا تھا؟''

''یہ ایک حقیقت ہے، اس سے کوئی بھی سینما آپریٹر مبرا نہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں اس بات کی وضاحت وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں کر چکا ہوں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''مجھے یاد ہے۔'' پھر پوچھا۔ ''منیجر صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ جن لوگوں کو ملزم مفت فلم دکھاتا تھا ان میں خواتین وحضرات دونوں شامل ہیں۔ آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ یہ بات آپ نے محض اندازے کی بنا پر کہی ہے یا اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں، آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟'' وہ الجھ کر بولا۔

''میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں محترم منیجر صاحب!'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے کبھی کسی لڑکی یا عورت کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے ہوئے یا پروجیکشن روم میں فلم بینی کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''

وہ جلدی سے بولا۔ ''نہیں وکیل صاحب! میں اپنی آنکھوں سے لڑکی یا عورت تو کجا، کسی مرد کو بھی ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ویسے بھی یہ کام کوئی دکھا کر کرنے کے تھوڑی ہوتے ہیں۔ چوری چکاری کے کام تو ہمیشہ چھپا کر ہی کئے جاتے ہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ اس معاملے کے عینی شاہد نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے وکیل استغاثہ کے جواب دیتے ہوئے محض قیاس آرائی سے کام لیا تھا۔''

''ہاں، حقیقت تو یہی ہے۔'' منیجر نے سمجھداری کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''منیجر صاحب! آپ نے تھوڑی دیر پہلے معزز عدالت کے روبرو وکیل استغاثہ کو بتایا ہے کہ ملزم اپنا رشتہ مسترد کئے جانے پر کافی عرصہ سے پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ آپ یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ملزم گزشتہ ایک سال سے آپ کے سینما میں

پروجیکٹر آپریٹر کے طور پر کام کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ملزم کا رشتہ مسترد کئے جانے والے واقعے کو ڈھائی تین سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ آپ کو ملزم کے ماضی کا یہ ''راز'' کس طرح معلوم ہوا؟ آپ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ملزم کو کم وبیش تین سال سے جانتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں، آپ غلط کہہ رہے ہیں اور اس کی وجہ بھی ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

''آپ وضاحت کریں۔'' میں نے کہا۔

وہ سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''دراصل میں گزشتہ ایک سال ہی سے ملزم کو جانتا ہوں۔ اس کے ماضی کے بارے میں، میں نے جو کچھ کہا وہ میری تازہ ترین معلومات ہیں۔ اس میں میرے تجربے اور مشاہدے کو دخل نہیں۔''

''یہ تازہ ترین معلومات آپ کو کس نے فراہم کی ہیں؟''

''یہ سب کچھ مجھے پولیس کی زبانی معلوم ہوا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ورنہ میں نہ تو یہ جانتا تھا کہ کسی زمانے میں ملزم نے شادی کرنے کا ارادہ باندھا تھا اور نہ ہی مجھے یہ معلوم تھا کہ آج کل مقتولہ پی آئی بی کالونی میں رہ رہی تھی۔ اب آپ میری بات کو اچھی طرح سمجھ گئے ہوں گے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بالکل سمجھ گیا منیجر صاحب۔''

وکیل استغاثہ اس دوران میں خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہا تھا اور اس کے رویے پر مجھے حیرت تھی۔ میرے خیال کے مطابق اس کو اب تک کئی مرتبہ مداخلت کرنا چاہئے تھی۔ میں نے وکیل مخالف کی ''نیند'' کو خراب کرنا مناسب نہ سمجھا اور گواہوں کے کٹہرے میں کھڑے سینما منیجر کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''وقوعہ کے روز آپ رات دس بجے سینما سے رخصت ہو گئے تھے اس لئے ظاہر ہے آپ نہیں جانتے بعد میں وہاں کیا پیش آیا ہوگا۔ آپ کو سب سے پہلے کب معلوم ہوا کہ آپ کے سینما کے پروجیکشن روم میں ایک لرزہ خیز واردات ہو چکی ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''مجھے دوسرے روز یعنی اٹھارہ اکتوبر کو میرے گھر فون کر کے یہ اطلاع دی گئی تھی۔''

''آپ کی رہائش کراچی کے کس علاقے میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نارتھ ناظم آباد میں۔''

''آپ کو اس واقعے کی اطلاع کتنے بجے دی گئی تھی؟''

''تقریباً سوا دس بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''اطلاع دینے والا کون تھا؟''

''سپروائزر۔''

"مگر تھوڑی دیر پہلے آپ بتا چکے ہیں کہ سینما کے سپروائزر کی ڈیوٹی دوپہر گیارہ بارہ بجے سے آدھی رات تک ہوتی ہے۔ کیا اس نے آپ کو سینما کی بجائے کسی اور جگہ سے فون کیا تھا؟ ظاہر ہے، وہ اس وقت ڈیوٹی پر تو نہیں ہوگا۔"

منیجر جواب دینے سے پہلے تذبذب کا شکار نظر آیا پھر ٹال کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے یقین ہے، سپروائزر نے وہ اطلاع سینما ہی سے مجھے دی تھی۔ وہ وقت سے پہلے ڈیوٹی پر کیوں موجود تھا، اس بارے میں تو میں نے سوچا نہیں۔ البتہ جب میں بھاگم دوڑ سینما پہنچا تو سپروائزر میرے کمرے میں موجود تھا۔"

"آپ کتنے بجے سینما پہنچ گئے تھے؟"

"کم وبیش پونے گیارہ بجے ہوں گے اس وقت۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے سپروائزر نے یہ اطلاع دیتے ہوئے کون سے الفاظ استعمال کئے تھے۔ ذرا سوچ کر بتائیں۔ یہ آپ کی یادداشت کا امتحان بھی ہے۔"

وہ چونکا نظر سے مجھے دیکھنے لگا، پھر محتاط انداز میں بولا۔ "جہاں تک میرا حافظہ کام کر رہا ہے سپروائزر نے کہا تھا...... سر! آپ جلدی سے سینما آجائیں۔ پروجیکٹر آپریٹر نے ایک لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔"

میں نے فاتحانہ نگاہ سے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا اور منیجر سے کہا۔ "اور آپ یہ اطلاع سنتے ہی جلدی سے سینما پہنچ گئے؟"

"ظاہر ہے، میں اور کیا کرتا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔

"سینما پہنچ کر آپ نے کیا دیکھا؟"

"میں سپروائزر کے ساتھ پروجیکشن روم میں پہنچا۔" منیجر نے جواب دیا۔ "اسی دوران میں وہ مجھے بتا چکا تھا کہ قتل سے پہلے لڑکی کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ میں نے وقوعہ کا سرسری جائزہ لیا، وہاں ایک لڑکی ابتر حالت میں پڑی تھی۔ میں فوراً اپنے دفتر آیا اور پولیس کو فون کر دیا۔"

"آپ نے پولیس کو کتنے بجے فون کیا تھا؟"

"سوا گیارہ بجے یا ہوسکتا ہے اس وقت گیارہ بجے ہوں۔" وہ متذبذب انداز میں بولا۔ "میں نے گھڑی میں وقت نہیں دیکھا تھا۔"

"منیجر صاحب!" تھوڑی دیر تک خاموش رہنے کے بعد میں نے پوچھا۔ "گزشتہ پیشی پر اس مقدمے کے تفتیشی افسر نے بتایا تھا کہ جب وہ وقوعہ پر پہنچا تو مقتولہ کی ظاہری حالت ٹھیک ٹھاک تھی اور آپ بتا رہے ہیں کہ وہاں ایک لڑکی یعنی مقتولہ ابتر حالت میں پڑی تھی۔ کیا آپ نے مقتولہ کی ابتر حالت کو درست کر کے ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا؟"

وکیل استغاثہ نے پہلی مرتبہ اپنی موجودگی کا یقین دلایا۔ "جناب عالی! مجھے اس سوال پر

اعتراض ہے۔ وکیل صفائی فضول قسم کے سوالات کر کے معزز عدالت کا وقت برباد کر رہے ہیں۔"

"اس میں فضول والی کون سی بات ہے؟" میں نے وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر گواہ کو جواب دینے میں کوئی اعتراض ہے تو وہ بتائے۔"

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "انکوائری افسر صاحب نے آپ کو جو کچھ بتایا ہے اس کا ذمے دار گواہ نہیں ہے۔ وہ تو وہی بیان کرے گا جو اس نے دیکھا۔"

"بجا فرمایا آپ نے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر گواہ سے پوچھا۔ "آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں منیجر صاحب؟"

وہ ہماری باہمی تکرار سے خاصا الجھ گیا تھا، جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ "آپ کس سلسلے میں بات کر رہے ہیں وکیل صاحب؟"

جج کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "وکیل صفائی یہ پوچھ رہے ہیں کہ آپ نے مقتولہ کی لاش کے ساتھ کوئی چھیڑ چھاڑ تو نہیں کی تھی؟"

"بالکل نہیں۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "میں نے تو مقتولہ کی لاش کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔"

میں نے گواہ کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "پھر مقتولہ کی ابتر حالت سے آپ کی کیا مراد تھی؟ انکوائری افسر کے مطابق تو مقتولہ اپنے پورے لباس میں بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں جائے وقوعہ پر مردہ پڑی تھی؟"

"ابتر حالت سے میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ وہ پروجیکشن روم کے فرش پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔" منیجر صاحب نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ "ملزم کو آپ نے بذاتِ خود ملازمت پر رکھا تھا یا وہ کسی سفارش پر آپ کے پاس پہنچا تھا؟"

"وہ میرے پاس سپروائزر کے توسط سے پہنچا تھا!"

اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

☆

وٹنس باکس (گواہوں والا کٹہرا) میں سینما کا خاکروب گواہی کے لئے موجود تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے سب سے پہلے مقتولہ کی لاش کو دیکھا تھا۔ استغاثہ کے اس گواہ کی عمر کم وبیش پینتالیس سال ہوگی۔ وہ ایک صحت مند سیاہ رو شخص تھا۔ اس نے ارزاں کپڑے کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے عدالت کے روبرو اپنا بیان ریکارڈ کروایا، پھر وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے پاس آگیا۔ اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا تم اس شخص کو جانتے ہو؟" اس کے ساتھ ہی اس نے اکیوزڈ باکس (ملزم کا کٹہ

کھڑے موکل کی جانب اشارہ بھی کر دیا۔

گواہ نے ملزم پر ایک نگاہ ڈالی اور اثبات میں جواب دیا۔ ''ہاں، جانتا ہوں۔''

''تم اسے کتنے عرصے سے جانتے ہو؟''

''تقریباً ایک سال سے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''ملزم سینما میں کس قسم کے فرائض انجام دیتا تھا؟''

''ہر قسم کے جناب۔'' سوئیپر نے جواب دیا۔

''ہر قسم...... سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میرا مطلب ہے، جائز اور ناجائز ہر طرح کے کام۔'' سوئیپر (خاکروب) نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔

گواہ کے انداز سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ استغاثہ نے اسے رٹو طوطے کی طرح اس کا سبق اچھی طرح یاد کروا رکھا تھا۔

وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔ ''ملزم کے جائز اور ناجائز کام کی وضاحت کرو؟''

''آبجیکشن یور آنر!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

جج اور وکیل استغاثہ نے ایک ساتھ چونک کر مجھے دیکھا۔ وکیل استغاثہ کے لئے یہ کسی اچنبھے سے کم نہیں تھا کہ میں نے اس کی جرح کے دوران میں اعتراض کر دیا تھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''وکیل استغاثہ کے کینچلی بدلنے پر۔''

''کینچلی بدلنے پر؟'' جج نے حیرت سے میرے الفاظ دہرائے۔

وکیل استغاثہ اشتعال بھرے لہجے میں بولا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی اپنے معروف ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں۔''

''یہ مجھ پر الزام ہے جناب عالی!'' میں نے جج کی طرف معصومیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

وکیل استغاثہ چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ''جناب عالی! ڈیفنس کونسلر (وکیل صفائی) کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے لئے شہرت رکھتے ہیں۔ انہیں اس کام سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

''میں نے کون سا شوشہ چھوڑا ہے؟'' میں نے براہ راست وکیل استغاثہ کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ برہمی سے بولا۔ ''کینچلی والا۔''

''میں نے تو ایک حقیقت بیان کی ہے۔''

جج نے ہماری باہمی تکرار ختم کرنے کی خاطر مجھ سے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے کینچلی بدلنے پر اعتراض کیا ہے۔ اب ذرا اس کینچلی کی وضاحت بھی کر دیں؟''

''او کے سر!'' میں نے سر جھکا کر جج کو تعظیم دی اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! وکیل استغاثہ نے جرح کے آغاز میں گواہ سے سوال کیا تھا کہ...... ملزم سینما میں کس قسم کے فرائض انجام دیتا تھا؟ گواہ نے جواباً بتایا...... جائز اور ناجائز ہر طرح کے کام۔ اب وکیل استغاثہ گواہ سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ملزم کے جائز اور ناجائز کام کی وضاحت کرے۔''

میں نے رک کر وکیل استغاثہ کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ جھنجلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''تو پھر؟''

''تو پھر...... یہ مائی ڈیئر...... کہ فرض اور کام میں بہت فرق ہوتا ہے۔ آپ گواہ سے گفتگو کرتے ہوئے پٹری سے اتر چکے ہیں۔ ملزم کے فرائض سے یہی مراد لی جائے گی کہ اس کے ذمے سینما کی طرف سے کیا کام لگایا گیا ہے...... اور اس کے کام سے یہ سمجھا جائے گا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ سینما کی طرف سے ملزم کو سونپا گیا مخصوص کام ہی اس کا فرض کہلانے کا مستحق ہوگا میرے فاضل دوست!''

وہ نفرت آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ تو بہت گہرائی میں جا رہے ہیں۔''

میں نے اس کی بات کے ردعمل کے طور پر فوراً اپنے قدموں کو دیکھا اور سادگی سے کہا۔ ''میں تو کمرے کے فرش پر کھڑا ہوں۔''

وکیل استغاثہ تپ گیا اور جھنجلا کر بولا۔ ''میری یہ مراد نہیں تھی۔''

''پھر آپ کی کیا مراد تھی؟'' میں نے اسے غصہ دلانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے کہا۔

وہ خجل سا ہو کر بولا۔ ''میں...... یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آپ بال کی کھال اتارنے والا کام کر رہے ہیں۔ اس سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ آپ جوتوں سمیت زمین کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''حقائق کو معزز عدالت کے ریکارڈ پر لانے کے لئے اگر کھال کے بال بھی اتارنے پڑے تو میں اس کوشش سے باز نہیں آؤں گا۔ آپ 'بال کی کھال' کی بات کر رہے ہیں۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے وکیل استغاثہ سے پوچھا 'بائی دی وے، جوتوں سمیت آنکھوں میں گھسنے کا محاورہ تو سنا تھا۔ یہ جوتوں سمیت زمین کی گہرائی میں اترنا کس ذیل میں استعمال ہوتا ہے۔ کیا یہ آپ کی اپنی اختراع ہے؟''

جج سمجھ گیا کہ میں وکیل مخالف کے چٹکیاں لے رہا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں اس تفریحی کام کو مزید آگے بڑھاتا، جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ حضرات ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کی کوشش کریں۔''

''کم ٹو دی پوائنٹ۔'' میں نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے ''فرض''

اور ''کام'' میں سے کس کا چناؤ کیا ہے؟''

''دونوں سے ایک ہی مراد ہے۔'' وہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کی مراد یہاں نہیں برآئے گی۔ دونوں الفاظ کا مفہوم جدا جدا ہے۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔'' وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''میں استغاثہ کے گواہ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ملزم سینما میں کون سے جائز اور ناجائز کام میں ملوث تھا، خواہ وہ کام اس کے فرائض کا حصہ ہو یا نہ ہو۔''

میں نے وکیل استغاثہ کو ذہنی انتشار میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے گزشتہ پانچ چھ منٹ میں جو بحث و تکرار کی تھی اس کا زیر سماعت کیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس قسم کے حربے وکیل مخالف کو بوکھلاہٹ میں ڈالنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں اور میں اپنی کوشش میں صد فیصد کامیاب رہا تھا۔

جج نے کٹہرے میں کھڑے سینما کے سوپیر کو حکم دیا۔ ''وکیل استغاثہ کو بتاؤ کہ ملزم سینما میں کون سے جائز اور ناجائز کام کرتا تھا؟''

گواہ نے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب! وہ جائز کام تو یہ کرتا تھا کہ سینما میں فلم چلاتا تھا اور ناجائز کام اس کا یہ تھا کہ وہ منیجر صاحب کی اجازت کے بغیر جاننے والوں کو مفت میں فلم دکھایا کرتا تھا۔''

مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا کہ وکیل استغاثہ نے گواہ کی دھار کس طور لگائی تھی۔ گواہ کے جواب کے بعد وکیل استغاثہ کا جوش و خروش لوٹ آیا۔ اس نے تیز آواز میں پوچھا۔

''مفت میں فلم بینی کا لطف اٹھانے والوں میں کون لوگ شامل تھے؟''

''سبھی.....'' گواہ سادگی سے بولا۔ ''مرد بھی، عورتیں بھی۔''

''اور ظاہر ہے، یہ تمام افراد ملزم کے جاننے والے ہوں گے؟'' وکیل استغاثہ نے سوالیہ انداز میں خیال آرائی کی۔ ''ورنہ کون کسی کو مفت میں فلم دکھاتا ہے۔''

گواہ نے شدت سے اثبات میں گردن ہلا کر اس کی تصدیق کر دی۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''وقوعہ کے روز تم نے مقتولہ کو ملزم کے ساتھ دیکھا تھا؟''

وکیل استغاثہ کا یہ سوال اس بات کا کھلا اعلان تھا کہ گواہ کو عدالت تک لانے سے پہلے اچھی طرح سمجھایا گیا تھا کہ اس سے کیا کیا سوال پوچھا جائے گا اور اس نے کون سے سوال کا کیا جواب دینا ہے۔ میری توقع کے عین مطابق گواہ نے بتایا۔

''جی، میں نے اس روز مقتولہ اور ملزم کو ایک ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔''

''کیا تم جانتے تھے کہ مقتولہ اور ملزم میں کس نوعیت کا تعلق ہو سکتا ہے؟''

''جی نہیں، میں ان کے باہمی تعلقات سے لاعلم تھا۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''کیا تم نے اس سے پہلے بھی مقتولہ کو ملزم کے ساتھ سینما میں کبھی دیکھا تھا؟''

اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''مقتولہ کو اس دن میں نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ البتہ اور کئی مرتبہ میں نے دوسری لڑکیوں اور عورتوں کو ملزم کے ساتھ سینما میں آتے جاتے دیکھا ہے۔ جنہیں یہ مفت میں فلم دکھانے لاتا تھا۔''

وکیل استغاثہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''ملزم تمہاری نظر میں کس قسم کا آدمی ہے؟''

''نہایت ہی فضول۔'' گواہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

''فضول سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''وہ انتہائی مغرور، جھگڑالو اور غصہ ور شخص ہے۔'' گواہ نے بتایا۔ ''میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے اس کے منہ نہ لگوں۔ فسادی لوگوں سے میں دور ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔''

مزید دو چار اِدھر اُدھر کے سوالات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔

اپنی باری پر میں سینما کے سوپیر اور استغاثہ کے گواہ کے نزدیک آ گیا۔ گواہ نے وکیل استغاثہ کے سوالوں کے جواب میں متعدد جھوٹ بولے تھے۔ میں اس کی خبر گیری کے لئے دلی طور پر تیار تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''تم اس سینما میں کتنے عرصے سے کام کر رہے ہو؟''

اس نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔ ''پانچ سال سے۔''

''تمہاری رہائش کس علاقے میں ہے؟''

''اعظم بستی میں۔''

''تم روزانہ کتنے بجے صفائی کرنے سینما آتے ہو؟''

اس نے بتایا۔ ''لگ بھگ صبح نو بجے۔''

''اور سینما کی صفائی سے کب تک فارغ ہو جاتے ہو؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ بولا۔ ''پہلا شو شروع ہونے سے پہلے اپنا کام ختم کر لیتا ہوں۔''

میں نے اس سے پوچھا۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم تقریباً چھ بجے تک سینما کی صفائی میں مصروف رہتے ہو۔ کیا میٹنی شو سے پہلے صفائی مکمل نہیں ہو جاتی؟''

''مجھے اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے تیز آواز میں جج سے فریاد کی۔ ''گواہ وکیل صفائی کے سوال کے جواب میں بتا چکا ہے کہ وہ پہلے شو سے پہلے اپنا کام مکمل کر لیتا ہے۔ پہلا شو عموماً ساڑھے تین بجے شروع ہوتا ہے لیکن وکیل مخالف سادہ لوح گواہ کو میٹنی اور چھ بجے کے چکر میں ڈال کر الجھن میں مبتلا کر رہے ہیں۔''

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں نے تو ایک سیدھا سادہ سوال سیدھے سادے انداز میں پوچھا ہے۔ اس میں الجھاؤ والی کون سی بات ہے؟''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔

وہ بولا۔ ''جناب عالی! گواہ نے بڑے واضح انداز میں بتایا ہے کہ وہ اپنا صفائی کا کام پہلا شو شروع ہونے سے قبل ختم کر لیتا ہے۔ اس کا یہی مطلب ہوا کہ وہ سہ پہر تین بجے تک اپنا کام نمٹا لیتا ہے۔ وکیل صفائی خواہ مخواہ گواہ کو ہراساں کرنے کے لئے چھ بجے کا ذکر کر رہے ہیں۔''

میں نے وکیل استغاثہ سے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! سینما کا پہلا شو چھ، ساڑھے چھ بجے چلتا ہے۔ اسی طرح دوسرا شو عموماً نو، ساڑھے نو بجے شروع ہوتا ہے۔ تین، ساڑھے تین بجے والا شو ''میٹنی شو'' کہلاتا ہے......اور دن میں گیارہ، بارہ بجے جو شو چلایا جاتا ہے اسے مارننگ شو یا اسپیشل شو کہتے ہیں۔ یہ سینما انڈسٹری کی مخصوص تکنیکی زبان ہے۔ اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو سینما کے منیجر سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔''

سینما منیجر اس وقت عدالت میں موجود نہیں تھا تاہم میرے ریمارکس پر حاضرین میں سے ایک شخص نے ہاتھ اٹھا دیا۔ جج نے اس شخص کو کھڑا کر کے ہاتھ اٹھانے کا مقصد دریافت کیا۔

وہ بولا۔ ''میں گزشتہ بیس پچیس سال سے سینما لائن سے وابستہ ہوں۔ اگر عدالت کی اجازت ہو تو میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

جج نے اسے فوراً گواہوں کے کٹہرے میں بلا لیا اور حلف لینے کے بعد کہا۔ ''ہاں کہو، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''وکیل صفائی نے سینما شوز کے بارے میں جو تفصیل بتائی ہے وہ بالکل درست ہے۔ یہ بین الاقوامی طور پر پوری دنیا میں رائج ہے۔ تاہم ہمارے ملک میں عموماً پہلا، دوسرا اور تیسرا شو علی الترتیب تین، چھ اور نو بجے والے شوز کو ہی کہا جاتا ہے۔ اسی لئے وکیل استغاثہ الجھ رہے ہیں۔ ان کی معلومات ایک وکیل ہونے کے ناتے گواہ سے زیادہ ہونا چاہئے تھیں، اس بات پر مجھے حیرت ہے کہ اس سلسلے میں وکیل استغاثہ اور گواہِ استغاثہ ایک ہی پلیٹ فارم پر کھڑے نظر آ رہے ہیں۔''

ایک غیر متعلقہ شخص کے آتش گیر تبصرے پر وکیل استغاثہ بری طرح بھڑک اٹھا۔

اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھ جاتی، جج نے ''بیچ بچاؤ'' کرتے ہوئے گواہ سے پوچھ لیا کہ وہ لگ بھگ کتنے بجے اپنا کام ختم کر کے گھر چلا جاتا تھا۔ گواہ نے بتایا کہ وہ کم و بیش دو بجے سہ پہر تک اپنا کام نمٹا لیتا تھا۔

میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''تم نے وکیل استغاثہ کے سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم منیجر کی اجازت کے بغیر اپنے جاننے والوں کو پروجیکشن روم میں لے جا کر مفت فلم دکھایا کرتا تھا۔ کیا سینما اسٹاف کے دیگر افراد یہ کام منیجر صاحب سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد

کیا کرتے ہیں؟''

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے کیا پتہ جی۔''

''اگر تمہیں یہ معلوم نہیں تو پھر ملزم کے بارے میں کیسے پتہ چلا کہ وہ بغیر اجازت کے یہ کام کرتا تھا؟'' میں نے اسے تیز نظر سے گھورا۔

وہ گڑبڑا گیا اور امداد طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ چہرے پر کوفت سجائے اپنے ''زخموں'' کو چاٹ رہا تھا تاہم اس نے اپنے گواہ کی مدد کرنا ضروری سمجھی اور کہا۔

''گواہ نے وہی بتایا ہے جو اسے معلوم تھا۔ اب ''اجازت نامے'' والی بات کے بارے میں وہ کیا جان سکتا ہے۔ یہ بات تو سبھی جانتے ہیں کہ گیٹ کیپرز اور پروجیکٹر آپریٹر اپنے آدمیوں کو مفت فلم دکھاتے ہی رہتے ہیں۔''

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! چلیں، آپ ہی کی بات کو درست مان لیتے ہیں۔'' پھر میں دوبارہ گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔

''تم نے بتایا ہے کہ جو لوگ ملزم کے توسط سے مفت فلم بینی کا لطف اٹھانے سینما آتے تھے ان میں مرد و زن دونوں شامل تھے؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بتایا ہے۔'' وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''اور تمہارا دعویٰ ہے کہ یہ تمام مرد و زن ملزم کے جاننے والے ہوتے تھے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

''کیا تم نے کبھی ایسے کسی مرد یا عورت سے بات کی تھی؟''

''جی نہیں، میں ایسے چکروں میں نہیں پڑتا۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ ''میں صرف اپنے کام سے کام رکھنے والا بندہ ہوں۔''

میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''وہ کام جو صبح نو بجے سے شروع ہو کر سہ پہر ڈھائی بجے ختم ہو جاتا ہے۔ کیوں؟''

''جی بالکل۔'' وہ میرے سوال کی گہرائی میں اترے بغیر بولا۔

میں نے کہا۔ ''جبکہ سینما کے شوز سہ پہر تین، ساڑھے تین سے شروع ہو کر رات بارہ بجے تک چلتے ہیں۔ ظاہر ہے، ملزم کی ڈیوٹی بھی انہی اوقات کے دوران میں ہوتی ہے۔ وہ اگر اپنے کسی یار دوست یا جاننے والے کو مفت فلم دکھانا چاہے تو انہی نو گھنٹوں کے عرصے کے دوران میں دکھا سکتا ہے جبکہ یہ عرصہ شروع ہونے سے پہلے ہی تم اپنے گھر جا چکے ہوتے ہو۔''

میرے معنی خیز اور طنزیہ انداز نے جج کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گواہ نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس سے کوئی سنگین غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ وہ اضطرابی انداز میں اپنے وکیل استغاثہ کو تکنے لگا۔

وکیل استغاثہ نے بات بناتے ہوئے کہا۔ ''سینما اسٹاف کا چوری چھپے اپنے جاننے والوں کو

مفت میں فلم دکھانا ایک عام سی بات ہے اور سینما کے سبھی افراد اس سے واقف ہوتے ہیں۔ اگر ملزم، گواہ کی غیر موجودگی میں اس فعل کا مرتکب ہوتا رہا ہے اور گواہ اس کے اس فعل سے آگاہ ہے تو اس میں حیرت یا اعتراض والی کون سی بات ہے؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں میرے فاضل دوست۔'' میں نے تائیدی انداز میں کہا۔ پھر گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں اعتراف کیا ہے کہ وقوعہ کے روز تم نے مقتولہ کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بتایا ہے۔''

''تم نے سمجھ لیا کہ ملزم، مقتولہ کو مفت فلم دکھانے پروجیکشن روم میں لے گیا تھا؟'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

وہ جہالت آمیز انداز میں بولا۔ ''صاف ظاہر ہے، میں تو یہی سمجھا تھا لیکن......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''لیکن کیا؟''

''لیکن جناب! مجھے کیا معلوم تھا وہ مقتول کو قتل کرنے کے ارادے سے پروجیکشن روم میں لے گیا تھا؟'' اس نے ایک مصنوعی جھرجھری لیتے ہوئے بتایا۔ ''اور قتل سے پہلے ملزم نے مقتولہ کو بے آبرو بھی کر ڈالا۔ کتنا ظالم اور سنگ دل ہے یہ شخص۔'' آخری جملہ ادا کرتے ہوئے اس نے میرے موکل کی جانب اشارہ کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''تم نے وقوعہ کے روز کتنے بجے ملزم کے ساتھ مقتولہ کو پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا؟''

''سوا نو بجے رات کو۔'' اس نے کھٹ سے جواب دیا۔

''تم اس وقت سینما میں کیا کر رہے تھے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم تو سہ پہر دو ڈھائی بجے کام سے فارغ ہو کر گھر چلے جاتے ہو؟''

اس نے بتایا۔ ''آپ ٹھیک کہتے ہیں، میں اس روز واقعی دو بجے گھر چلا گیا تھا مگر رات میں دوبارہ مجھے سینما آنا پڑا۔''

''کیوں، ایسی کیا ایمرجنسی ہو گئی تھی؟''

''مجھے کچھ رقم کی ضرورت تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے سپروائزر سے دن میں سو روپے مانگے تو اس نے کہا، ابھی تو میرے پاس نہیں ہیں۔ تم رات کو کسی وقت آ کر لے جانا۔ میں منیجر صاحب سے لے لوں گا۔ میں وہی سو روپے لینے سینما آیا تھا۔''

''تم نے سپروائزر سے وہ رقم لے لی تھی؟''

''جی ہاں۔''

''تم وقوعہ کے روز کتنے بجے دوبارہ رات میں سینما پہنچے تھے؟''

''تقریباً رات نو بجے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تمہاری واپسی کب ہوئی تھی؟''

''ساڑھے نو بجے۔'' اس نے حتمی لہجے میں بتایا۔

''اور تم نے سوا نو بجے مقتولہ کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا؟'' میں نے تصدیقی انداز میں استفسار کیا۔

اس نے اثبات میں سر ہلا کر تصدیق کر دی۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''اگلے روز تم حسب معمول ڈیوٹی پر آئے تھے۔ یعنی صبح نو بجے؟''

''جی ہاں، میں اپنے مقررہ وقت پر سینما پہنچا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے اچھی طرح یاد ہے، اس دن اٹھارہ تاریخ تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تم وہ شخص ہو جس نے سب سے پہلے لاش دیکھی تھی۔ میرا مطلب ہے، مقتولہ کی لاش۔ اس لئے اب میں تم سے جو سوال پوچھوں ان کا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔''

وہ محتاط نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اس احتیاط میں تشویش نما گھبراہٹ بھی شامل تھی۔ میں نے حاضرین پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے سوال کیا۔

''تم اٹھارہ اکتوبر کی صبح نو بجے اپنے معمول کے مطابق صفائی کرنے سینما پہنچے اور ٹھیک دس بجے تم نے پروجیکشن روم سے مقتولہ کی لاش دریافت کر لی۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''جی ہاں، ایسا ہی ہوا تھا۔''

اس نے جواب تو دے دیا تاہم اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس سوال میں ایسی کون سی بات ہے جس کے لئے میں نے اسے سوچ سمجھ کر جواب دینے کی ہدایت کی ہے۔

میں نے پوچھا۔ ''اٹھارہ اکتوبر کو سینما پہنچنے کے بعد نو سے دس بجے تک تم کیا کرتے رہے تھے؟''

''صفائی...... جو میرا کام ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہوں۔'' میں نے گہری سانس چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تم کسی ترتیب سے صفائی کرتے ہو ...... یا پھر منہ اٹھا کر جہاں سے دل چاہے، شروع ہو جاتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''سینما کی صفائی کوئی معمولی کام نہیں ہے جناب! یہ کسی بہت بڑے بحری جہاز کی صفائی سے بھی کہیں مشکل ہے۔ اگر کام ترتیب سے نہ کیا جائے تو پورے دن میں بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ میں تو صرف پانچ گھنٹے صفائی کرتا ہوں۔''

''تمہاری اس تقریر کا مطلب یہ ہوا کہ تم ایک مخصوص ترتیب سے کام کرتے ہو؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہی میرے سوال کا جواب بھی تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''ذرا اپنی ترتیب کی وضاحت کرو۔ تم کہاں سے کام کا آغاز کرتے ہو اور کہاں پہنچ کر تمہارا کام ختم ہو جاتا ہے؟''

اس نے بتایا۔ ''میں سب سے پہلے سینما کا ہال صاف کرتا ہوں۔ سب سے زیادہ کچرا چونکہ سینما ہال کے اندر سے نکلتا ہے اس لئے میں یہ مشکل کام پہلے کر لیتا ہوں۔ اس کے بعد باکس وغیرہ کا نمبر آتا ہے۔ پھر پروجیکشن روم اور گیلری والی منزل کی بالکونیاں وغیرہ۔ پھر میں زینوں کی صفائی کرتے ہوئے نچلی منزل پر آ جاتا ہوں۔ یہاں سب سے پہلے ٹکٹ گھر کی صفائی کی جاتی ہے۔ پھر برآمدے وغیرہ کی صفائی کا نمبر آتا ہے۔ اس کے بعد دفاتر کے کمرے اور سب سے آخر میں سینما کا صحن۔ میں روزانہ اسی ترتیب سے سینما کی صفائی کرتا ہوں۔''

اس کا تفصیلی جواب ختم ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''سینما ہال کی صفائی میں کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟''

''ڈیڑھ سے دو گھنٹے لگ جاتے ہیں جناب۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم بتا چکے ہو کہ وقوعہ کے روز تم صبح نو بجے سینما پہنچے تھے۔ اگر ہال کی صفائی میں کم از کم ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ساڑھے دس بجے تک سینما ہال کی صفائی سے فارغ ہوئے ہو گے۔ اس کے بعد تم گیلری اور باکس وغیرہ کی صفائی کرتے ہو۔ اس میں بھی ایک گھنٹہ تو لگتا ہی ہو گا یعنی ساڑھے دس سے وقت پہنچ گیا ساڑھے گیارہ پر۔ اس کے بعد تمہارے بیان کے مطابق نمبر آتا ہے پروجیکشن روم کی صفائی کا۔ گویا تم لگ بھگ ساڑھے گیارہ بجے پروجیکشن روم میں صفائی کی غرض سے داخل ہوئے اور وہاں تم نے مقتولہ کی لاش دیکھی؟''

ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے وکیل استغاثہ اور جج کو باری باری دیکھا اور گواہ خاکروب پر جرح جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم ایک محتاط اندازے کے مطابق اٹھارہ اکتوبر کو کم و بیش ساڑھے گیارہ بجے پروجیکشن روم میں داخل ہوئے تھے پھر تم نے دس بجے مقتولہ کی لاش کس طرح دریافت کر لی تھی؟ کیا لاش تم نے پہلے دریافت کی اور صفائی بعد میں شروع کی تھی؟ تم تھوڑی دیر پہلے میرے ایک سوال کے جواب میں اعتراف کر چکے ہو کہ ٹھیک دس بجے تم نے پروجیکشن روم میں مقتولہ کی لاش دیکھی تھی؟''

وہ چند لمحوں کے لئے گھبراہٹ میں مبتلا ہوا تاہم جلد ہی سنبھل گیا اور بولا۔ ''یہ بالکل درست ہے کہ میں اس دن دس بجے پروجیکشن روم میں صفائی کرنے گیا تھا۔''

''پھر تم ہال، گیلری اور باکس کی صفائی میں صرف ہونے والے وقت کو کس کھاتے میں فٹ کرو گے؟'' میں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ بات دراصل یہ ہے جناب! کہ میں نے اس روز اپنی مخصوص ترتیب سے صفائی نہیں کی تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''اگر میں پہلے سینما ہال، پھر گیلری اور باکس وغیرہ کی صفائی کرنے کے بعد پروجیکشن روم کا رخ کرتا تو یقیناً ساڑھے گیارہ بج جاتے۔ اس دن میں نے پہلے گیلری کی صفائی کی اور پھر باکس وغیرہ کا کچرا نکالنے کے بعد پروجیکشن روم کی طرف چلا گیا تھا۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''مخصوص ترتیب اور معمول میں اس تبدیلی کی وجہ؟''

اس نے جواب دیا۔ ''سپروائزر صاحب نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پہلے گیلری اور پروجیکشن روم کی صفائی کر لوں۔ بعد میں سینما ہال کا رخ کروں۔''

''سپروائزر نے تم سے یہ بات کب کہی تھی؟''

''اسی دن جناب۔''

''یعنی اٹھارہ اکتوبر کی صبح؟''

''جی......'' اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بتایا۔

''اس کا مطلب ہے، جب اٹھارہ اکتوبر کی صبح نو بجے تم سینما پہنچے تو سپروائزر وہاں موجود تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کریدنے والے انداز میں استفسار کیا۔ ''تم نے سپروائزر سے اس کی تبدیلی کی وجہ نہیں پوچھی؟''

وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''جناب! میں تو ایک معمولی سا نوکر ہوں اور سپروائزر صاحب، صاحب لوگ ہیں۔ میں ان سے اس قسم کے سوال جواب کیسے کر سکتا ہوں؟ انہوں نے حکم دیا، میں نے فوراً اس پر عمل شروع کر دیا۔''

''تم نے جب پروجیکشن روم میں مقتول کی لاش دیکھی تو کیا، کیا؟'' اس نے جرح کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

اس نے بتایا۔ ''میں لاش دیکھ کر بہت گھبرا گیا تھا۔ میں فوراً سپروائزر صاحب کے پاس پہنچا جو دفتر میں بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ وہاں پروجیکشن روم میں ایک لڑکی کی لاش پڑی ہے۔ سپروائزر صاحب میرے ساتھ پروجیکشن روم میں پہنچے اور لاش کو دیکھنے کے بعد نیچے دفتر میں آ کر انہوں نے منیجر صاحب کو فون کر دیا۔''

''پھر منیجر صاحب سینما پہنچے اور لاش دیکھنے کے بعد انہوں نے پولیس کو فون کر دیا؟'' میں نے

تصدیقی انداز میں پوچھا۔ ''پولیس موقع پر پہنچی، ازاں بعد انہوں نے ملزم کو دوپہر کے وقت اس کے گھر سے گرفتار کرلیا۔ یہی سب ہوا تھا نا؟''

اس نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی۔

میں نے سوال کیا۔ ''جب تک سینما کا نیجر سینما نہیں پہنچا تھا، تمہارے اور سپروائزر کے درمیان کیا باتیں ہوئی تھیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔ ''ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے تھے۔''

''کہاں بیٹھے رہے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''سینما کے دفتر میں۔''

''سینما میں اس وقت تم دونوں کے علاوہ اور کون تھا؟''

''سینما کا چوکیدار۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ چوبیس گھنٹے کا ملازم ہے اور سینما ہی میں رہتا ہے۔''

میں نے استفسار کیا۔ ''کیا چوکیدار صورتحال کی سنگینی سے واقف ہو چکا تھا؟''

''میرا خیال ہے، اسے لاش والی بات کا پتہ نہیں ہے۔''

''تم نے لاش کو دیکھتے ہی پہچان لیا ہوگا؟'' میں نے اچانک سوال کیا۔

''نہیں جناب!'' وہ شدت سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں بھلا مقتولہ کو کس طرح پہچان سکتا ہوں؟''

''تم مقتولہ اور اس کی لاش کو اس طرح پہچان سکتے تھے کہ گزشتہ رات نو بجے تم نے مقتولہ کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھا تھا یا نہیں دیکھا تھا؟''

''و......و......وہ......'' وہ لکنت زدہ انداز میں بولا۔ ''وہ بات دراصل یہ ہے کہ...... میں آپ کو بتاتا ہوں...... آپ یقین کریں...... اس میں میرا قصور نہیں میں تو...... آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ مم...... میں......''

گھبراہٹ آمیز انداز میں اس نے چند شکستہ جملے ادا کئے اور خاموش ہو کر سہمی ہوئی نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ میں نے اسے چھوٹ دینا مناسب نہ سمجھا اور سلگتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

''تم نے جھوٹ گواہی دینے کے لئے کتنی رقم وصول کی ہے؟''

وہ جواب دینے کی بجائے وکیل استغاثہ کو امداد طلب نظر سے دیکھنے لگا۔

اس سے پہلے کہ وکیل استغاثہ اس کی مدد کو پہنچتا، جج نے گواہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''تم واضح الفاظ میں بتاؤ کہ مقتولہ کی لاش کو دیکھ کر تمہیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ یہ اسی لڑکی کی لاش ہے جسے گزشتہ رات تم نے ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا؟''

''سر جی! میں لڑکی کی لاش دیکھ کر بہت خوفزدہ ہوگیا تھا۔'' گواہ نے بہانے بازی سے کام لیتے ہوئے بتایا۔ ''اس وقت میرا ذہن اس طرف نہیں گیا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے جسے میں نے پچھلی رات ملزم کے ساتھ دیکھا تھا۔''

میں نے جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچاتے ہوئے سوال کیا۔ ''لیکن بعد میں تمہارے ذہن نے پوری طرح کام کرنا شروع کردیا تو تمہیں یاد آگیا کہ مقتولہ وہی لڑکی تھی جو گزشتہ رات تمہیں ملزم کے ساتھ دکھائی دی تھی۔ یہی بات ہے نا؟''

''جی بالکل...... بالکل......'' وہ میرے جھانسے میں آگیا۔

میں نے پوچھا۔ ''جب سپروائزر نے نیجر کو فون کیا تو اسے کیا بتایا تھا؟''

''سپروائزر صاحب نے نیجر صاحب کو فون کر کے کہا تھا۔ ''سر! آپ جلدی سینما آجائیں۔ پروجیکٹر آپریٹر نے ایک لڑکی کو قتل کردیا ہے۔'' اس نے جواباً بتایا۔

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''نیجر صاحب کا بیان بھی یہی ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔ ''تمہارے جواب سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہاری یادداشت بہت مضبوط ہے۔ میں تمہاری یادداشت یا حافظے کو ایک آزمائش سے گزارنا چاہتا ہوں۔ ذرا سوچ سمجھ کر جواب دینا۔''

وہ اضطراری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''آج صبح تم نے ناشتے میں کیا کھایا ہے؟''

''چائے پراٹھا۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''کل رات تم نے کیا کھانا کھایا تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''دال چاول۔''

''دال کون سی تھی؟''

''مونگ مسور مکس۔''

''سترہ اکتوبر کی رات سوا نو بجے تم نے ایک لڑکی کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تو لڑکی نے کون سا لباس پہن رکھا تھا؟'' میں نے اچانک سوالات کا زاویہ تبدیل کرتے ہوئے کٹیلے انداز میں پوچھا۔

وہ گڑبڑا گیا اور گھبراہٹ میں بولا۔ ''لڑکی نے پھول دار کاٹن کا شلوار قمیض پہن رکھا تھا۔''

جواب دینے کے بعد وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''پروجیکشن روم میں جب تم نے مقتولہ کی لاش دیکھی تو اس کے بدن پر کس قسم کا لباس موجود تھا؟''

وہ اپنے جھوٹ کو نبھاتے ہوئے بولا۔ ''ظاہر ہے، وہی پھول دار شلوار قمیض۔''

میں نے انکوائری افسر کی طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''آئی او صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟ موقع واردات کا تفصیلی نقشہ تو آپ ہی نے تیار کیا تھا اور استغاثہ کی رپورٹ بھی آپ سے پوشیدہ نہیں؟''

کسی بھی مقدمے کے تفتیشی افسر کو ہر پیشی پر عدالت میں موجود رہنا پڑتا ہے۔ آئی او نے جج کی اجازت حاصل کرنے کے بعد میرے سوال کے جواب میں بتایا۔

''جائے وقوعہ پر مقتولہ مہندی رنگ کے ریشمی پارٹی ڈریس میں پائی گئی تھی۔ استغاثہ کی رپورٹ میں بھی یہی درج ہے۔''

''اس کا مطلب ہے گواہ سراسر دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے؟'' میں نے ڈانٹ آمیز انداز میں کہا۔

وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''یہ تو آپ گواہ ہی سے پوچھیں۔''

میں گواہ اور آئی او کو نظر انداز کرتے ہوئے وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا اور طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ اس سلسلے میں کوئی اظہار خیال فرمائیں گے؟''

''میں آپ کے ہر سوال کا جواب دلائل کے مرحلے پر دوں گا۔'' وہ جان چھڑانے والے انداز میں بولا۔ ''ابھی استغاثہ کے گواہ باقی ہیں۔ پہلے آپ ان سے نمٹ لیں۔''

میں نے کندھے اچکا کر جج کی جانب دیکھا اور نہایت ہی مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''جناب عالی! مجھے گواہ سے کچھ اور نہیں پوچھنا۔''

جج زیر لب خفیف سا مسکرا کر اپنے سامنے پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ لکھنے لگا۔ وہ میری ''محنت'' کا ثبوت اپنے ریکارڈ پر محفوظ کر رہا تھا۔ میرے لئے یہ خاصی تسلی بخش صورت حال تھی۔ استغاثہ کی کمزوریاں اور خامیاں سامنے لا کر میں نے اپنی پوزیشن مضبوط کر لی تھی۔

آئندہ پیشی کی تاریخ دے کر جج نے عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

سینما کا سپروائزر اور استغاثہ کا گواہ کٹہرے میں کھڑا وکیل استغاثہ کے ہلکے پھلکے سوالوں کا جواب دے رہا تھا۔ اس سے پہلے اس نے حلف اٹھا کر اپنا بیان ریکارڈ کروا دیا تھا۔ اس کا بیان پولیس کو دیئے گئے بیان سے گہری مماثلت رکھتا تھا۔ وکیل استغاثہ جرح مکمل کرنے کے بعد اپنی مخصوص سیٹ پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں اپنی باری پر گواہ والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ سپروائزر سے نہایت ہی اہم اور منفرد قسم کے سوال کروں گا۔ منفرد سے میری مراد یہ ہے کہ وہ عام قسم کے روایتی سوال نہیں ہوں گے۔ اب تک استغاثہ کی جانب سے جو گواہ بھگتائے گئے تھے ان پر جرح سے بہت سی اہم باتیں سامنے آئی تھیں۔ میں اپنی جرح کو انہی نکات تک محدود رکھ کر نتیجہ خیز بنانا چاہتا تھا۔

سپروائزر کی عمر چالیس کے قریب ہو گی۔ وہ پستہ قامت والا ایک فربہ شخص تھا۔ رنگت میں وہ سانولے اور سیاہ کے درمیان تھا۔ اس کی بائیں آنکھ میں بھینگا پن نمایاں تھا۔ اپنی شکل وصورت سے وہ ایک سخت گیر اور اکھڑ مزاج شخص نظر آتا تھا۔

میں نے جرح کا آغاز کرتے ہوئے سپروائزر سے سوال کیا۔ ''آپ کو اس سینما میں سپروائزری کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوا ہے؟''

اس نے متحمل لہجے میں جواب دیا۔ ''تقریباً آٹھ سال۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کے ڈیوٹی اوقات کیا ہیں؟''

''میرے ڈیوٹی اوقات مقرر نہیں ہیں۔'' وہ بے اعتنائی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کے سینما منیجر نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ آپ عموماً دوپہر گیارہ بارہ بجے سے لے کر رات بارہ بجے تک سینما میں موجود رہتے ہیں اور غالباً یہی آپ کے ڈیوٹی اوقات بھی ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

''ہاں، آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تصدیق کی۔

''اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے، یہی آپ کے ڈیوٹی اوقات ہیں؟''

''آپ کہہ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اٹھارہ اکتوبر کی صبح نو بجے آپ سینما کے دفتر میں موجود تھے۔ اس کی کوئی خاص وجہ؟''

''میں سینما سپروائزر ہوں، کسی بھی وقت سینما میں آ جا سکتا ہوں۔'' وہ پُرغرور انداز میں بولا۔

''آپ کو میرے صبح نو بجے سینما میں پائے جانے پر کیا اعتراض ہے؟''

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بخدا مجھے آپ کی آمد پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو قبل از وقت آپ کے سینما پہنچنے کا سبب معلوم کرنا چاہتا تھا۔''

''میں کسی ضروری کام ہی سے سینما آیا ہوں گا۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''اب مجھے وہ کام تو یاد نہیں۔ ہو سکتا ہے، الیکٹرک کا کوئی مسئلہ ہو یا کسی اور قسم کی ٹربل شوٹنگ ہو سکتی ہے۔ آپ کو کیا پتہ، سپروائزر رہنا کتنا بڑا دردسر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

پتہ نہیں وہ میری بات کو تعریف سمجھا یا تنقید، خاموشی سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اپنی جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کے سینما سویپر نے معزز عدالت کو بتایا ہے کہ وقوعہ کے روز آپ نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ خلاف معمول پہلے گیلری، پروجیکشن روم اور باکس وغیرہ کی صفائی کرے جبکہ وہ عموماً سینما ہال کا کام پہلے نمٹاتا تھا۔ ان احکامات کی وجہ تو آپ ضرور بتائیں گے؟''

اس نے ایک لمحے کو معاندانہ نظر سے مجھے دیکھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وکیل

صاحب! میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں سینما کا سپروائزر یعنی فورمین ہوں۔ میں اپنے عملے کے کسی بھی فرد کو کسی بھی نوعیت کے احکام دے سکتا ہوں۔"

"میں آپ کے اختیارات کو چیلنج نہیں کر رہا سپروائزر صاحب!" میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔"میں تو صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ خلافِ معمول آپ کے احکام کی کوئی تو وجہ ہوگی؟"

"ہاں ہے۔" اس نے غصیلی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی اور مزید بتانے لگا۔"میں سویپر کی ہڈحرامی اور کام چوری سے بہت نالاں تھا۔ وہ آتے ہی سینما کے ہال میں گھس جاتا اور دو ڈھائی گھنٹے وہاں برباد کر دیتا۔ اس طرح باقی وقت میں وہ جلدی جلدی کام نمٹانے کی کوشش کرتا چنانچہ گیلری اور باکس وغیرہ کی صفائی تسلی بخش نہیں ہو پاتی تھی۔" وہ چند لمحے سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"سچی بات یہ ہے جناب! کہ ہمیں گیلری اور باکس وغیرہ کے تماشائیوں کا سب سے زیادہ خیال رکھنا چاہئے کیونکہ ان درجوں کے ٹکٹ خاصے مہنگے ہوتے ہیں۔ اسی خیال کے پیش نظر میں نے خاکروب کو پہلے گیلری اور باکس وغیرہ کی صفائی کے لئے کہا تھا اور تاکید کی تھی کہ آئندہ بھی وہ اسی ترتیب سے صفائی کا کام کیا کرے۔ بس اتنی سی بات ہے، اب تو آپ کی تسلی ہوگئی ہوگی وکیل صاحب؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہ سمجھا اور گواہ خاکروب کے بیان کا سرسری جائزہ لینے لگا۔ ابھی سپروائزر نے "تاکید" کے حوالے سے جو بات کی تھی اس کا ذکر سویپر کے بیان میں کہیں بھی موجود نہیں تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ سپروائزر گھپلے بازی سے کام لے رہا تھا۔

میں نے کہا۔"کیا واقعی آپ نے خاکروب کو تاکید کی تھی کہ آئندہ ہمیشہ وہ گیلری، باکس اور پروجیکشن روم سے صفائی شروع کیا کرے؟"

"تو کیا میں آپ سے جھوٹ بول رہا ہوں؟" وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔"گواہ خاکروب نے اس کا تذکرہ نہیں کیا۔"

"وہ بھول گیا ہوگا۔" سپروائزر نے بے نیازی سے کہا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔"سپروائزر صاحب! کیا یہ درست ہے کہ سترہ اکتوبر کی رات نو بجے استغاثہ کا گواہ اور سینما کا خاکروب آپ کے پاس کچھ رقم لینے آیا تھا؟"

"جی ہاں، یہ درست ہے۔" اس نے ہاں میں گردن ہلائی۔"میں نے اسے سو روپے ادھار دیئے تھے۔"

میں نے پوچھا۔"کیا یہ سچ ہے کہ ملزم کو آپ کی سفارش پر سینما میں ملازمت دی گئی تھی؟"

اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بتایا۔"ہاں، یہ حقیقت ہے۔ میں نے ہی اپنے منیجر صاحب سے اس کی سفارش کی تھی۔ ان دنوں وہ بے روزگار تھا اور ملازمت کی تلاش میں بیٹھا تھا۔

میں نے اس پر ترس کھا کر اسے اپنے سینما میں فلم چلانے کا کام دلوا دیا تھا۔"

"ترس کھا کر کام دلوانے والی بات تو آپ اس طرح کہہ رہے ہیں جیسے ان دنوں ملزم کی حالت بڑی قابل رحم ہو؟" میں نے کہا۔"میرا خیال ہے، ملزم کے ساتھ کبھی بھی ایسا مسئلہ نہیں رہا کہ وہ قابل رحم ہو جائے۔ اس کے بھائی کا چلتا ہوا جنرل اسٹور ہے اور یہ سب لوگ ایک ساتھ ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔"

وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔"شاید آپ کو معلوم نہیں کہ ملزم کی اپنے گھر والوں سے کبھی بنی نہیں اور اس بات کا بھی آپ کو احساس نہیں کہ بے روزگاری بذات خود کتنا بڑا عذاب ہے۔"

"یہ تو آپ بالکل درست فرما رہے ہیں۔" میں نے تائیدی انداز میں کہا۔"مجھے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ بے روزگاری ایک عذاب ہی نہیں بلکہ رفتہ رفتہ ایک لعنت کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔" ایک لمحے کا توقف کر کے میں نے اضافہ کیا۔"سپروائزر صاحب! آپ کی باتوں سے لگتا ہے کہ آپ ملزم کو ذاتی حیثیت سے بھی جانتے ہیں اور اس کے گھر والوں کے بارے میں بھی آپ کو اچھی خاصی معلومات ہیں؟"

اس نے اثبات میں میرے سوال کا جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔"آپ کی رہائش کہاں ہے؟"

"سولجر بازار میں۔" اس نے بتایا۔"ملزم کے بڑے بھائی کے جنرل اسٹور کے نزدیک۔"

میں نے سوال کیا۔"پھر تو آپ ملزم اور مقتولہ کے ماضی سے بھی واقف ہوں گے۔ مقتولہ پہلے گرومندر کے علاقے میں رہتی تھی۔"

"جی۔" اس نے پُراعتماد انداز میں گردن ہلائی۔"آپ ان کے ماضی کی طرف جس حوالے سے اشارہ کر رہے ہیں اس قصے سے اچھی طرح آگاہ ہوں اور میرا ذاتی خیال ہے، مقتولہ کو پیش آنے والا واقعہ بلکہ یوں کہیں سانحہ اسی "قصے" کا شاخسانہ ہے۔"

"آپ یہ بات اتنے وثوق سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے مداخلت کی۔"گواہ نے اپنا ذاتی خیال ظاہر کیا ہے جبکہ فاضل وکیل اسے چکر دینے کے لئے "وثوق" کا لفظ استعمال کر رہے ہیں۔"

جج نے مجھے ہدایت کی کہ میں اپنے سوال میں سے "وثوق" کا لفظ خارج کر کے وہاں "خیال" کا لفظ استعمال کروں۔

میں نے جج کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنا سوال دہرایا اور مزید کہا۔"کیا آپ اپنے خیال کو ثابت کرنے کے لئے کوئی ٹھوس ثبوت مہیا کر سکتے ہیں؟"

"اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ سینما کے پروجیکشن روم میں مقتولہ کی لاش پائی گئی ہے۔" سپروائزر نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔"میں نے سترہ اکتوبر کی رات مقتولہ کو ملزم کے ساتھ سینما میں دیکھا تھا۔ وہ دونوں پروجیکشن روم کی طرف جا رہے تھے۔"

''آپ سینما کے سپروائزر ہیں۔'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''سینما کے اندر ہونے والی ہر قسم کی نقل وحرکت پر نظر رکھنا آپ کے فرائض میں شامل ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ مقتولہ اور ملزم کے ماضی سے بھی آگاہ تھے۔ جب آپ نے ان دونوں کو ایک ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا تو آپ پر یہ فرض عائد ہوتا تھا کہ مقتولہ کی سینما میں آمد اور ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف سفر کی حقیقت جاننے کی کوشش کریں۔ کیا آپ نے اس سلسلے میں کوئی عملی یا خیالی قدم اٹھایا تھا؟''

وہ قطعیت سے بولا۔ ''بالکل نہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ اس لئے کہ میں ملزم کو زیادہ منہ نہیں لگاتا تھا۔'' سپروائزر نے ناپسندیدہ نظر سے میرے موکل کو گھورتے ہوئے بتایا۔ ''یہ نہایت ہی احسان فراموش شخص ہے۔ میری وجہ سے اسے سینما میں ملازمت ملی تھی مگر یہ سب سے یہی کہتا تھا کہ اسے اس کی اعلیٰ صلاحیت کی بنا پر سینما میں رکھا گیا تھا۔ اس کمبخت نے کبھی مجھے وہ عزت نہیں دی جو اس کا فرض بنتا تھا۔ ویسے بھی یہ بہت مغرور، جھگڑالو اور غصہ ور شخص ہے۔''

خاکروب نے میرے موکل کو نہایت فضول قسم کا انسان گردانتے ہوئے کچھ اسی نوعیت کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ میں نے کٹہرے میں کھڑے سپروائزر سے سوال کیا۔ ''مجھے پتہ چلا ہے کہ میرا موکل اور اس مقدمے کا ملزم لگ بھگ ایک سال سے اس سینما میں کام کر رہا تھا۔ آپ نے اور آپ سے پہلے آپ کے سوپیر نے اس کے جھگڑالو، غصہ ور اور مغرور ہونے کا ذکر کیا ہے۔ آپ معزز عدالت کے روبرو ملزم کے کوئی بھی تین جھگڑوں کی مثالیں پیش کریں۔ نہایت ہی غصہ ور اور جھگڑالو شخص ایک سال میں اس قسم کی دو تین کیا، تین سو پینسٹھ مثالیں قائم کر سکتا ہے۔''

وہ میرے اس تیکھے سوال پر گڑبڑا گیا اور بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ ''مم...... مجھے اس وقت تو کوئی مثال یاد نہیں آ رہی۔''

''گویا آپ میرے موکل کے خلاف اس کے جھگڑالو ہونے کو ثابت کرنے سے قاصر ہیں؟''

وہ کوئی جواب دینے کی بجائے متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

میں نے جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ سترہ اکتوبر کی رات آپ نے مقتولہ کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ اب ذرا یہ بھی بتا دیں کہ اس وقت مقتولہ نے کس رنگ کا لباس پہن رکھا تھا؟''

''وہی جو قتل کے بعد اس کے جسم پر پایا گیا تھا۔'' وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔

میں نے سختی سے کہا۔ ''میں نے لباس کا رنگ پوچھا ہے۔''

مجھے رنگ یاد نہیں آ رہا۔''

''اور ملزم نے اس روز کس قسم کا لباس پہن رکھا تھا؟''

''اس نے نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''سپروائزر صاحب! لگتا ہے آپ کے ہوش کوچ کر گئے ہیں۔ میں نے ملزم کے لباس کا رنگ نہیں پوچھا، اس کی قسم کے بارے میں سوال کیا تھا۔ اس کے برخلاف مقتولہ کے لباس کا رنگ پوچھا تھا۔ آپ میرے ہر سوال کا الٹا جواب دے رہے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' وہ سنبھل کر بولا۔ ''دراصل میں نے اس روز مقتولہ اور ملزم کے لباس اور ان کے رنگوں کو غور سے نہیں دیکھا تھا اس لئے بھی اب مجھے یاد نہیں۔''

میں نے مزاح کے رنگ میں کہا۔ ''غور سے نہیں دیکھا تھا یا آپ کی بائیں آنکھ نے غور کرنے میں کوئی مزاحمت پیش کر دی تھی؟''

وہ خفیف سا ہو کر جج کی طرف دیکھنے لگا مگر یوں نظر آتا تھا جیسے وہ وکیل استغاثہ کو دیکھ رہا ہو۔ میں پہلے ذکر کر چکا ہوں کہ سپروائزر کی بائیں آنکھ میں بھینگا پن موجود تھا۔

میں نے اگلا سوال کیا۔ ''سپروائزر صاحب! خاکروب نے جب آپ کو آ کر بتایا کہ پروجیکشن روم میں لڑکی کی لاش پڑی ہے تو آپ اس کے ساتھ پروجیکشن روم میں گئے تھے۔ کیا آپ لاش کو دیکھتے ہی مقتولہ کو پہچان گئے تھے؟''

''جی، میں نے پہلی نظر میں مقتولہ کو پہچان لیا تھا۔'' اس نے جلدی سے کہا۔ ''اس کے جسم پر وہ مہندی رنگ کا لباس تھا جو میں گزشتہ رات دیکھ چکا تھا اور......''

وہ بولتے بولتے ایک جھٹکے سے رک گیا اور سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ کوئی غلطی کر چکا ہے تاہم میں اس موقع پر اس کی غلطی کو نظرانداز کرنے والا نہیں تھا۔ میں نے ''آپ'' سے ''تم'' پر آتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''تھوڑی دیر پہلے تم بتا چکے ہو کہ تمہیں مقتولہ اور ملزم کے لباس اور ان کے رنگ یاد نہیں کیونکہ تم نے انہیں غور سے نہیں دیکھا تھا اور اب تم کہہ رہے ہو کہ پروجیکشن روم میں مقتولہ کے جسم پر وہی مہندی رنگ کا لباس موجود تھا جو تم گزشتہ رات دیکھ چکے تھے۔ یہ کیا کھیلے بازی ہے مسٹر سپروائزر؟ تمہاری سپرویژن تو انتہائی ناقص بلکہ مبنی بر بددیانتی ثابت ہو رہی ہے۔''

اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ بس ''میں...... میں...... میں۔'' کر کے رہ گیا۔

میں نے اسی وقت ایک اور خطرناک سوال کر ڈالا۔ ''مسٹر سپروائزر! پروجیکشن روم سے واپس آ کر تم نے اپنے منیجر صاحب کو اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے یہ الفاظ استعمال کئے تھے...... آپ جلدی سے سینما آ جائیں۔ پروجیکٹر آپریٹر نے ایک لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔ تمہارے ان جملوں کی تصدیق منیجر اور خاکروب دونوں نے کی ہے۔'' میں نے ذرا توقف کر کے اس کے چہرے کے

تاثرات کا جائزہ لیا اور کہا۔ ''جب تم منیجر کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جارہے تھے تو تم نے اسے بتایا تھا کہ قتل سے پہلے لڑکی کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے۔ معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا، لڑکی قتل ہو چکی ہے؟ وہ بے ہوش بھی تو ہو سکتی تھی۔''

''م...... میں نے اس کی حالت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ زندہ نہیں ہوگی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''وہ مجھے بالکل مُردہ دکھائی دے رہی تھی۔''

میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کیا تم کوئی ڈاکٹر ہو؟''

''نن...... نہیں......'' وہ ہچکچاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے اس کی مدد کرتے ہوئے لقمہ دیا۔ ''کسی بھی شخص کی ابتر اور دگرگوں حالت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ زندہ نہیں ہوگا اس کے لئے کسی کا ڈاکٹر ہونا ضروری نہیں۔''

میں نے وکیل استغاثہ کی وضاحت کو نظر انداز کرتے ہوئے گواہ سے پوچھا۔ ''اور تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ قتل سے پہلے لڑکی کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا؟''

پھر میں نے وکیل استغاثہ کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ہی سرد لہجے میں کہا۔ ''اس کے لئے تو ڈاکٹر ہی نہیں بلکہ گواہ کا میڈیکولیگل ہونا بھی بہت ضروری ہے۔''

ایک مرتبہ پھر میں گواہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''مسٹر سپروائزر! کیا تم نے ایک نظر دیکھتے ہی یہ جان لیا تھا کہ مقتولہ کو قتل کیا جا چکا ہے اور اسے موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے زیادتی کا نشانہ بھی بنایا گیا ہے؟'' پھر میں نے طنز سے بھرپور لہجے میں اضافہ کیا۔ ''بھئی تمہاری یہ بائیں آنکھ تو کمال کی شے ہے، بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہے اور ہاں...... تمہاری طرف میرے دو سوال ڈیو ہیں جن کے جوابات جاننے کے لئے معزز عدالت انتظار کر رہی ہے۔''

وہ بری طرح میرے گھیرے میں آ چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا جواب دے۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ بھی اس کی دادرسی کے لئے آگے نہیں بڑھا۔ جج بڑی دلچسپی سے صورتحال کا جائزہ لیتے ہوئے حقائق کے نزدیک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے گواہ پر اپنے حملے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''تم جواب کیوں نہیں دے رہے ہو مسٹر سپروائزر؟''

وہ اپنے دعوؤں کو ''اندازے'' کا لبادہ پہناتے ہوئے آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ لیکن صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جھوٹ پکڑے جانے پر جان چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جج حقیقت حال کے بہت ہی قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے گواہ کو مخاطب کر کے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''مسٹر سپروائزر! تم نے اپنے منیجر کو فون پر اطلاع دیتے ہوئے بتایا تھا کہ پروجیکٹر آپریٹر نے ایک لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔ تم نے کس بات سے یہ اندازہ لگایا تھا کہ مقتولہ کو ملزم ہی نے قتل کیا تھا؟

کیا پروجیکشن روم میں ایسے شواہد موجود تھے جو میرے موکل کو مجرم ثابت کرتے ہوں؟ تم نے کس بنا پر یہ اندازہ قائم کیا کہ قتل اور مجرمانہ حملے کی واردات میں میرا موکل ملوث ہے اور یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے؟ تم نے منیجر کو اتنے وثوق سے یہ باتیں بتائی تھیں جیسے تم ان واقعات کے عینی شاہد ہو!'' ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''اتنے اعتماد کے ساتھ تو ایسی باتیں وہی شخص کر سکتا ہے جس کی آنکھوں کے سامنے یہ حالات پیش آئے ہوں یا اس کے پاس ان واقعات کے ٹھوس ثبوت موجود ہوں۔ مسٹر سپروائزر! کیا مجرمانہ حملے اور قتل کی یہ واردات تمہاری ڈیڑھ آنکھ کے سامنے پیش آئی تھی یا پھر تمہارے پاس میرے موکل کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہے؟ اگر واقعی ایسا کوئی ثبوت وجود رکھتا ہے تو اسے عدالت کے سامنے پیش کرو۔''

میرے تابڑتوڑ حملوں نے اس کی سٹی گم کر دی۔ وہ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے شکست خوردہ لہجے میں گھگیایا۔ ''پپ...... پانی......!''

پھر وہ کٹہرے کی ریلنگ کو تھام کر بری طرح ہانپنے لگا۔

جج کی اجازت سے انکوائری افسر نے استغاثہ کے معزز گواہ کے لئے ایک گلاس پانی منگوایا مگر وہ پانی پینے کے بعد کوئی واضح جواب نہیں دے سکا۔ وہ بار بار یہی الفاظ دہرا رہا تھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ یوں ہوا ہوگا...... میرے خیال میں یوں ہو سکتا ہے...... میں نے سوچا کہ اس طرح ہو سکتا ہے......''

جج سمجھ گیا، گواہ بہانے بازی سے کام لے رہا تھا۔ اس نے ڈانٹ آمیز لہجے میں گواہ سے کہا۔ ''مسٹر! عدالت کسی شخص کی سوچ، اس کے خیالات اور اندازوں کو کچھ نہیں مانتی۔ یہاں تو اپنی بات کو ثابت کرنے کے لئے ٹھوس ثبوت فراہم کرنا پڑتے ہیں۔ اگر تم نے اپنے دعوؤں کی سچائی ثابت کرنے کے لئے ثبوت مہیا نہیں کیا تو اسے تمہاری دروغ گوئی تصور کیا جائے گا بلکہ یہ عدالت سمجھے گی کہ تم نے بدنیتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ملزم پر مجرمانہ حملے اور قتل کا الزام لگانے کی کوشش کی ہے۔''

جج کی سخت باتوں نے اس کے غبارے کی رہی سہی ہوا خارج کر دی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کٹہرے میں بیٹھ گیا اور لرزیدہ انداز میں بولا۔ ''مجھے چکر آ رہے ہیں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں اب کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

اس کی ''آہ و بکا'' کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا مخصوص اعلان کر دی۔ ''دی کورٹ از اڈجارنڈ۔''

***

آئندہ پیشی پر استغاثہ کا آخری گواہ مقتولہ کا باپ گواہی کے لئے عدالت میں حاضر ہوا۔ مقتولہ کے باپ کی گواہی اصولی طور پر شروع میں ہونی چاہئے تھی تاہم استغاثہ کی یہ کوتاہی میرے لئے سود مند بن گئی اور اس گواہ پر جرح کے دوران میں کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں کہ مجھے دلائل کے مرحلے

میں کافی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔

گواہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بیان کا زیادہ تر حصہ میرے موکل کی مخالفت میں تھا یعنی مختصر الفاظ میں یوں سمجھ لیں کہ گواہ کے نزدیک ملزم ہاتھ دھو کر اس کی بیٹی کے پیچھے پڑ گیا تھا۔ پھر جب وہ مقتولہ کے حصول میں ناکامیاب رہا تو اس نے دھوکے سے مقتولہ کو سینما میں لا کر پہلے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور ازاں بعد گلا گھونٹ کر اسے موت کے حوالے کر دیا۔

وکیل استغاثہ نے اپنی جرح کے دوران میں اس امر کو اجاگر کرنے کی بھرپور کوشش کی کہ رشتے سے انکار کے بعد ملزم اپنی ناکامیابی پر بری طرح تلملا رہا تھا اور مقتولہ سے انتقام لینے کے لئے تاک لگائے بیٹھا تھا۔ بالآخر اسے موقع مل گیا اور وہ اپنے مذموم عزائم کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوگیا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لئے گواہ کے کٹہرے کے نزدیک آ گیا اور نہایت ہی مختصر اور جامع سوالات سے جرح کا آغاز کیا۔ میں نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''آپ نے ملزم کے رشتے والے مطالبے کو رد کیا تھا۔ آپ کے بقول ملزم نے پھر آپ کی بیٹی کا پیچھا نہ چھوڑا اور گاہے بگاہے اس کو تنگ کرتا رہا چنانچہ مجبوراً آپ گرومندر کے علاقے کو چھوڑ کر پی آئی بی کالونی آ گئے۔ آپ مجھے بتائیں کہ آیا ملزم آپ کے نئے محلے میں بھی آپ کی بیٹی کو تنگ کرنے آیا کرتا تھا؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کو گرومندر چھوڑے لگ بھگ ڈھائی تین سال ہوگئے ہیں۔ مقتولہ کی موت سے پہلے آپ نے کبھی محسوس کیا کہ ملزم کا اس سے رابطہ رہا ہے؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''نہ ہم نے ایسا کچھ محسوس کیا اور نہ ایسی کوئی بات تھی۔ میری بیٹی تو ملزم کی شکل دیکھنے کی روادار نہیں تھی، رابطے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''محترم! استغاثہ کے دو گواہوں (خاکروب+سپروائزر) نے آپ کی مقتول بیٹی کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اگر ان میں کوئی ربط ضبط نہیں تھا تو پھر آپ کی بیٹی سینما میں ملزم کے ساتھ کیسے موجود تھی؟ آپ کے بقول وہ تو ملزم کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''مم...... میرا خیال ہے، ملزم نے کسی طرح اسے ورغلا لیا ہوگا۔ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس نے میری بیٹی کو دھوکے سے سینما بلایا ہوگا۔''

''یہ سب ''ہوگا'' وغیرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ایسی قیاسی باتوں کو عدالت نہیں مانتی۔ آپ صرف اس بات کی وضاحت کریں کہ جب مقتولہ، ملزم کو پسند نہیں کرتی تھی، اس سے ملنا جلنا تو درکنار وہ ملزم کی صورت دیکھنا گوارا نہیں کرتی تھی تو پھر وہ فلم دیکھنے ملزم

کے پروجیکشن روم میں کس طرح پہنچ گئی؟''

''مجھے نہیں معلوم۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

''آپ کو یہ تو معلوم ہوگا۔'' میں نے جرح کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''سترہ اکتوبر کی رات نو بجے کے بعد آپ کی بیٹی کہاں تھی؟''

اس نے جواب دیا۔ ''سترہ اکتوبر کو اس کی ایک سہیلی کی مہندی تھی۔ وہ اس مہندی میں شرکت کے لئے لیاقت آباد گئی تھی۔ اس کا چھوٹا بھائی یعنی میرا بیٹا اسے لیاقت آباد چھوڑنے گیا تھا۔''

مقتولہ کے جسم پر مہندی رنگ کا ریشمی پارٹی ڈریس پایا گیا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ اب سامنے آئی تھی۔ میں نے گواہ سے پوچھا۔ ''آپ کا بیٹا مقتولہ کو کتنے بجے لیاقت آباد اس کی سہیلی کے گھر چھوڑ کر آیا تھا؟''

''نو بجے کے قریب۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ کا بیٹا، بہن کو یعنی مقتولہ کو لینے بھی گیا ہوگا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے استفسار کیا۔ ''کتنے بجے وہ بہن کو لینے گیا تھا؟''

''ساڑھے گیارہ بجے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''پھر کیا ہوا تھا؟''

اس نے بتایا۔ ''میری بیٹی کی سہیلی نے بتایا کہ وہ تو دس بجے واپس چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی سہیلی کو بتایا تھا کہ گھر میں کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے اس لئے بھائی اسے لینے آیا ہے۔ وہ فوراً گھر جانا چاہتی ہے۔''

''لیکن ظاہر ہے، ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔'' میں نے گواہ کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''نہ تو آپ کے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہوئی تھی اور نہ ہی آپ نے مقتولہ کو بلانے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تصدیق کی۔ ''ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔''

''پھر مقتولہ نے اس قسم کی غلط بیانی کیوں کی اپنی سہیلی کے ساتھ؟''

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' وہ بے بسی اور بے چارگی کی تصویر نظر آنے لگا۔

میں نے پوچھا۔ ''مقتولہ گھر میں ایمرجنسی کا بہانہ کر کے کس کے ساتھ گئی تھی؟''

''ظاہر ہے ملزم کے ساتھ گئی ہوگی۔'' گواہ کمزور لہجے میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''مگر ملزم کی تو وہ شکل دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس کے ساتھ کیسے جا سکتی ہے؟''

وہ شکست خوردہ انداز میں بولا۔ ''لڑکیاں بہت بے وقوف ہوتی ہیں۔ ممکن ہے، ملزم نے اپنی کسی چال کے ذریعے میری بیٹی کو اپنے جال میں پھانس لیا ہو۔ غلطی تو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔

آپ اس امکان کو منفی تو نہیں کر سکتے نا!''

''ہاں جی، ہونے کو سب کچھ ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ملزم نے کسی طرح مقتولہ کو بہلا پھسلا لیا ہوگا اور وہ اس کے ساتھ فلم دیکھنے پروجیکشن روم میں پہنچ گئی ہو گی۔ ہے نا؟''

''ہاں، میں تو یہی سمجھتا ہوں۔'' گواہ نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''محترم! مقتولہ کی سہیلی نے (آپ کے بقول) یہ بتایا تھا کہ مقتولہ گھر میں کسی ایمرجنسی کا بہانہ کر کے دس بجے رات اس کے گھر سے رخصت ہوگئی تھی۔ یہ وہ وقت ہے جب ملزم پروجیکشن روم میں فلم کا آخری شو چلا رہا تھا جبکہ نو، سوا نو بجے خاکروب اور سپروائزر نے مقتولہ کو ملزم کے ساتھ دیکھا تھا۔ وقت کا یہ تضاد کیا معنی رکھتا ہے؟''

''میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا جناب!'' وہ پیشانی مسلتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''یا تو مقتولہ دس بجے سے پہلے اپنی سہیلی کے گھر سے بہانہ کر کے نکل آئی تھی اور فلم دیکھنے سینما پہنچ گئی تھی یا پھر دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ جب لڑکی کو ملزم کے ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا، وہ مقتولہ نہیں کوئی اور لڑکی تھی۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں وکیل صاحب!'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ اس سلسلے میں اگر کچھ نہیں کہہ سکتے تو ایک ہستی ایسی بھی ہے جو اس ذیل میں بہت کچھ کہہ سکتی ہے۔''

جج نے چونک کر مجھے دیکھا اور پوچھا۔ ''وکیل صاحب! وہ ہستی کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مقتولہ کی سہیلی۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، وہ ان معاملات پر خاصی روشنی ڈال سکتی ہے۔''

''جناب عالی! اس موقع پر میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ وکیل استغاثہ کو اس بات کے لئے پابند کیا جائے کہ وہ مقتولہ کی سہیلی کو گواہی کے لئے جلد از جلد عدالت میں پیش کرے۔'' میں نے پُرجوش انداز میں کہا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''مہندی والے واقعے کو کئی ماہ گزر چکے ہیں جناب۔ اب تو وہ لڑکی بیاہ کر شہر سے باہر جا چکی۔ اسے عدالت میں پیش کرنا بہت مشکل ہوگا۔''

''یہ ایک قتل اور آبروریزی کا کیس ہے جناب عالی!'' میں نے زوردار انداز میں کہا۔ ''اور میرے موکل کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ مذکورہ لڑکی بیاہ کر دوسرے شہر گئی ہے، دوسرے ملک نہیں۔ اسے گواہی کے لئے عدالت میں لانا چنداں مشکل نہیں۔ اگر یہ کام استغاثہ کے بس میں نہ ہو تو ہم کوشش کر لیتے ہیں؟''

میں نے دانستہ یہ آخری جملے کہے تھے۔ اس سے میرا دوہرا مقصد تھا۔ ایک تو میں وکیل استغاثہ کو نیچا دکھانا چاہتا تھا، دوسرے میں نے مقتولہ کے باپ کے بیان سے بھانپ لیا تھا کہ مقتولہ کی سہیلی کچھ ایسے انکشافات کر سکتی تھی جو ہمارے لئے بے حد مفید ثابت ہوتے۔ میں اس لڑکی کو صفائی کے گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کر سکتا تھا۔

میری خطرناک تجویز نما پیشکش کی تہ میں وکیل استغاثہ نے بھی جھانک لیا تھا اور وہ معترض انداز میں بولا۔ ''جناب عالی! وہ لڑکی شادی کے بعد اب کسی اور شخص کی بیوی بن چکی ہے۔ ممکن ہے اس کا شوہر اسے پولیس کچہری کے چکر میں پڑنے کی اجازت نہ دے۔''

''یہ ممکن نہیں۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''وہ لڑکی مقتولہ کی گہری سہیلی ہے۔ مقتولہ کی موت کا اسے بھی گہرا صدمہ پہنچا ہوگا۔ وہ ضرور یہ چاہے گی کہ مقتولہ کو قتل اور بے آبرو کرنے والا کمینہ شخص قرار واقعی سزا پائے۔ اس لئے وہ بلائے جانے پر یقیناً عدالت میں آئے گی۔ اگر اس کے شوہر نے کوئی اعتراض کیا بھی تو وہ اسے سمجھا لے گی۔''

میری جارحیت کو دیکھتے ہوئے وکیل استغاثہ نے ہتھیار پھینک دیئے اور مضبوط لہجے میں جج سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! میں مذکورہ لڑکی کو عدالت میں پیش کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔''

جج نے مقتولہ کے باپ سے استفسار کیا کہ مذکورہ لڑکی بیاہ کر کس شہر گئی ہے؟'' اس نے حیدر آباد کا نام لیا۔ جج نے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد استغاثہ کی جانب سے مقتولہ کی اس سہیلی کو عدالت میں پیش کر دیا گیا۔ وقوعہ کے روز جس کی مہندی میں شریک ہونے مقتولہ اپنے بھائی کے ساتھ گھر سے نکلی تھی۔ پہلے تو وہ اسی بیان پر ڈٹی رہی کہ مقتولہ گھر میں کسی ایمرجنسی کا حوالہ دے کر دس بجے اس کے گھر سے نکل گئی تھی۔ لیکن جب میں نے اسے حالات کی سنگینی اور حقائق کی تفصیل سے آگاہ کیا تو وہ سچ بولنے پر تیار ہوگئی۔ اس نے جو انکشاف کیا وہ بہت اہمیت کا حامل تھا۔

مقتولہ کی سہیلی کے مطابق ان دنوں مقتولہ کا کسی امیر زادے سے عشق چل رہا تھا۔ مقتولہ کے اس راز سے صرف اس کی وہ سہیلی ہی واقف تھی۔ گواہ نے بتایا کہ وقوعہ کے روز مقتولہ رات نو بجے اس کے پاس آئی تھی اور دس بجے وہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی کہ وہ اپنے محبوب کے ساتھ کچھ وقت گزارے گی اور چھوٹے بھائی کے آنے سے پہلے واپس آجائے گی۔ گھر میں ایمرجنسی والا قصہ اس نے خود گھڑ لیا تھا تاکہ مقتولہ کی گمشدگی کے سلسلے میں وہ کسی قسم کی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔

وکیل استغاثہ مختلف قسم کے سوالات کر چکا تو میں نے مقتولہ کی سہیلی سے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں، مقتولہ کا آپ کے بیان کردہ امیر زادے سے عشق وغیرہ کب سے چل رہا تھا؟''

''مجھے مقتولہ نے یہ بات چند ماہ پہلے بتائی تھی۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ

سکتی کہ ان کے درمیان معاملات کب سے چل رہے تھے۔''

''آپ اس امیرزادے کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟''

اس نے بتایا۔''صرف یہی کہ وہ ایک سینما کے مالک کا بیٹا ہے اور اس کے پاس بہت ہی قیمتی کار بھی ہے۔''

گواہ کے اس انکشاف نے جج، وکلا، ملزم اور حاضرین سمیت سب کو چونکنے پر مجبور کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ جب بھنبھناہٹ تیزی سے بڑھنے لگی تو جج نے سب کو خاموش ہونے کا حکم دینے کے بعد میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''آپ جرح جاری رکھیں وکیل صاحب!''

میں نے مقتولہ کی سہیلی سے پوچھا۔''آپ نے کبھی اس امیرزادے کو دیکھا ہے جس کے عشق میں آپ کی سہیلی گرفتار تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اس کی رہائش کے بارے میں کچھ جانتی ہیں؟''

''مقتولہ نے مجھے بتایا تھا کہ وہ نارتھ ناظم آباد میں رہتا ہے۔''

میں نے پوچھا۔''کیا آپ سینما کا نام جانتی ہیں جو اس شخص کے باپ کی ملکیت ہے؟''

گواہ نے معذوری کا اظہار کر دیا۔

میں نے سوال کیا۔''اس قیمتی گاڑی کا نام تو آپ کو ضرور معلوم ہوگا جو اس امیرزادے کے تصرف میں تھی؟''

''مقتولہ نے جوش جذبات میں مجھے اپنے عاشق کی قیمتی کار کا نام بھی بتایا تھا۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔''میری سہیلی کے عاشق کے پاس شیورلٹ گاڑی تھی جو کہ شہر میں گنے چنے افراد کے پاس ہوگی۔''

اچانک سینما کا منیجر اٹھ کھڑا ہوا پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس کے انداز میں بے پناہ اضطراب پایا جاتا تھا۔ میں نے جج کی جانب روئے سخن کرتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

''جناب عالی! اس وقت سینما کے مالک کم منیجر عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔ میں معزز عدالت کی اجازت سے ان سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔''

جج نے اجازت مرحمت فرمانے سے پہلے مجھ سے پوچھا۔''آپ نے مقتولہ کی سہیلی پر جرح مکمل کر لی ہے یا ابھی کوئی اور سوال بھی پوچھنا ہے؟''

''میں گواہ پر اپنی جرح مکمل کر چکا ہوں یور آنر!''

''پھر ٹھیک ہے۔'' جج نے کہا۔''آپ سینما منیجر سے سوال پوچھ سکتے ہیں۔''

مقتولہ کی سہیلی جج کے حکم پر کٹہرے سے باہر آ گئی اور حاضرین عدالت کے درمیان اپنے شوہر

کے ساتھ بیٹھ گئی۔ گواہ حیدرآباد سے اپنے شوہر کے ساتھ گواہی دینے کراچی کی عدالت میں پہنچی تھی۔

جج کے اشارے پر سینما منیجر گواہوں والے کٹہرے میں آ گیا۔ وہ کسی گہری الجھن میں گرفتار تھا۔

میں نے منیجر کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔''آپ کے استعمال میں کون سی گاڑی ہے؟''

''ٹویوٹا کرولا۔'' اس نے الجھن زدہ انداز میں بتایا۔''لیکن......''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے فوراً پوچھا۔''لیکن کیا منیجر صاحب؟''

''میرے بیٹے کے پاس شیورلیٹ ہے۔'' اس نے متذبذب انداز میں بتایا۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا یور آنر!'' میں نے فاتحانہ انداز میں کہا اور اپنی مخصوص نشست کی جانب قدم بڑھا دیئے۔

جج نے دلائل کے لئے تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆

اس روز عدالت کے کمرے میں خاصا رش تھا۔ اب یہ کیس فائنل مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس لئے بھی متعلقین کی دلچسپی بہت بڑھ گئی تھی۔ پہلے وکیل استغاثہ نے استغاثہ کے حق میں کافی پُرجوش دلائل دیئے۔ اس کا سارا زور اس بات پر تھا کہ ملزم نے اپنی دیرینہ بےعزتی کا بدلہ لینے کے لئے مقتولہ کو کسی طرح شیشے میں اتارا پھر اسے پروجیکشن روم میں لا کر نہ صرف بےآبرو کیا بلکہ اس کی جان بھی لے لی۔

میں خاموشی سے وکیل استغاثہ کی تقریر سنتا رہا اور بیچ میں کہیں مداخلت ضروری نہ سمجھی کیونکہ مجھے جو کچھ کہنا تھا اپنی جگہ ٹھوس اور ناقابل انکار تھا اس لئے میں اپنی توانائی کو بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ جب وکیل استغاثہ گرج کر تھک گیا تو میرے برسنے کی باری آئی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔''جناب عالی! میں اپنے دلائل کا آغاز استغاثہ کے گواہوں کی ترتیب سے کروں گا۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ ضرور کہوں گا کہ میرا موکل بالکل بےگناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت قتل کے اس مقدمے میں پھنسایا گیا ہے۔''

''یہ بات آپ پہلے بھی کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں۔'' وکیل استغاثہ نے طنزیہ انداز میں کہا۔

میں نے وکیل استغاثہ کے طنز کا جواب دیتے ہوئے کہا۔''آئندہ بھی جب ضرورت محسوس ہو گی میں یہ بات ضرور کہوں گا۔'' پھر میں دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''جناب عالی! استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ میرے موکل نے اپنی دیرینہ بےعزتی کا بدلہ لینے کے لئے مقتولہ کو چنگل میں پھنسا کر شکار کیا۔ پہلے اسے مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا گیا پھر گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ استغاثہ کے اس دعوے کا پول انکوائری افسر پر ہونے والی جرح سے کھل جاتا ہے۔''

میں نے ایک لمحے کا توقف کر کے دلائل کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''یور آنر! جب کسی لڑکی یا عورت کو مجرمانہ حملے کا نشانہ بنایا جاتا ہے تو وہ اپنی آبرو کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں ضرور مارتی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ وہ بھرپور مزاحمت کا مظاہرہ کرتی ہے تو زیادہ موزوں اور مناسب ہوگا۔ موجودہ کیس میں اگر مقتولہ نے ایسی کوئی کوشش کی ہوتی تو اس کا واضح ثبوت مل جاتا۔ میں یہ کہنا...''

میرا جملہ مکمل ہونے سے قبل ہی وکیل استغاثہ نے مداخلت کر دی۔ ''ایسا کون سا ثبوت ہوتا ہے میرے فاضل دوست!''

''میرے فاضل دوست!'' میں نے وکیل استغاثہ کو براہِ راست جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر میرے موکل نے واقعی ایسی کوئی زیادتی کی ہوتی تو مقتولہ کی جانب سے مزاحمت کی صورت میں ملزم کے چہرے، گردن یا ہاتھوں پر اس کے ناخنوں کے کھرونچے ضرور پائے جاتے۔ انکوائری افسر نے میری جرح کے جواب میں تصدیق کی ہے کہ جب ملزم کو گرفتار کیا گیا تو اس کے جسم کے کسی بھی ظاہرہ حصے پر کسی قسم کا کوئی نشان موجود نہیں تھا۔ اس بات کی تصدیق پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ مذکورہ رپورٹ میں کہیں بھی اس بات کی نشاندہی نہیں ہوتی کہ مقتولہ کے ناخنوں کے تجزیے میں کہیں انسانی گوشت کے ریشے ملے ہوں جبکہ مقتولہ نے آئی او کے بیان کے مطابق...... یہ لمبے لمبے ناخن رکھ چھوڑے تھے جن پر نیل پالش لگی تھی۔ اگر مقتولہ نے اپنے بچاؤ کی کوشش کی ہوتی تو اس کے ناخنوں کے تجزیے سے اس کا ثبوت مل جاتا۔ ویسے بھی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ کی موت رات بارہ بجے سے دو بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے یعنی سترہ اور اٹھارہ اکتوبر کی درمیانی شب۔ جبکہ میرا موکل اس رات آخری شو کی فلم چلا کر لگ بھگ سوا بارہ بجے سینما سے نکل گیا تھا۔ وہ ٹھیک بارہ پینتالیس پر یعنی پونے ایک بجے گھر پہنچ گیا تھا۔ اپنے گھر کے نزدیک ہی واقع ایک پان کی دکان سے اس نے اپنے پسندیدہ برانڈ ولز کا ایک سگریٹ پیکٹ بھی خریدا تھا۔ اگر تصدیق کی ضرورت سمجھی گئی تو اس پان فروش کو گواہی کے لئے عدالت میں لایا جا سکتا ہے۔''

میں چند لمحے سانس لینے کو رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! پولیس کی ایک فاش غلطی معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ انہوں نے پروجیکشن روم کے مختلف حصوں سے ملزم کی انگلیوں کے نشانات تو اٹھا لئے مگر مقتولہ کی گردن سے قاتل کے فنگر پرنٹس حاصل کرنے کی زحمت گوارا نہ کی جبکہ استغاثہ کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے سپرد کیا گیا ہے۔ اس صورت میں یہ اور بھی ضروری ہو جاتا تھا کہ مقتولہ کی گردن سے فنگر پرنٹس اٹھائے جاتے۔

یہاں ایک اور بات بھی قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ اگر میرے موکل نے مقتولہ سے واقعی اس قسم کا کوئی انتقام لینا ہوتا تو وہ اس کام کے لئے پروجیکشن روم کے علاوہ کسی اور جگہ کا انتخاب کرتا تاکہ اس کی پکڑ کے امکانات موجود نہ رہتے۔ مقتولہ کی لاش پروجیکشن روم سے دریافت ہونے سے یہ

ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کارروائی ملزم کے علاوہ کسی اور ہی شخص کی ہو سکتی ہے۔''

میں نے رک کر جج کی جانب دیکھا۔ وہ میرے دلائل سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! اب میں سینما منیجر کے بیان کی طرف آتا ہوں۔ ملزم ایک سال سے اس سینما میں فلم چلا رہا تھا اور اس دوران منیجر کو اس سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی۔ اس کے بیان میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب اس نے مقتولہ کی لاش دیکھی تو وہ ابتر حالت میں پڑی تھی جبکہ انکوائری افسر کا کہنا ہے جب وہ موقع واردات پر پہنچا تو لاش کی ظاہرہ حالت ٹھیک ٹھاک تھی۔ اس کے بدن پر پورا لباس موجود تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے کہ پولیس کی آمد سے قبل مقتولہ کی لاش کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ضرور کی گئی تھی۔ دوسرے منیجر کا یہ بیان کہ اسے فون پر سپروائزر نے اطلاع دی تھی کہ سر آپ جلدی سے سینما آ جائیں، پروجیکٹر آپریٹر نے ایک لڑکی کو قتل کر دیا ہے۔ ازاں بعد پروجیکشن روم کی طرف جاتے ہوئے سپروائزر نے یہ اضافہ بھی کر دیا کہ لڑکی کو قتل کرنے سے پہلے مجرمانہ حملے کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ یہاں یہ اہم سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ سپروائزر کو یہ کیسے معلوم ہوا، اس لڑکی کا قاتل پروجیکٹر آپریٹر ہے؟ اور قتل سے پہلے اس لڑکی کو بے آبرو بھی کیا گیا ہے؟ سپروائزر نے میری جرح کے جواب میں کوئی تسلی بخش وضاحت پیش نہیں کی جس سے اس کی ذات شکوک کی دبیز چادر میں لپٹی نظر آتی ہے۔

سپروائزر اور بھی کئی حوالوں سے متنازع حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ مثلاً یہی کہ اس کی ڈیوٹی دوپہر گیارہ بارہ بجے سے رات ایک بجے تک ہوتی ہے مگر وقوعہ کے روز خلافِ معمول صبح نو بجے سینما میں موجود تھا اور مزے کی بات یہ ہے کہ اسے یاد نہیں وہ اس روز قبل از وقت سینما کیوں آیا تھا! پھر سپروائزر نے خاکروب کو صفائی کی ترتیب کی جو نئی ہدایات دی تھیں اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی خواہش تھی، مقتولہ کی لاش جلد از جلد دریافت ہو جائے۔ اس سے ایک بات پایہ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ وہ وقوعہ کے روز سینما پہنچنے سے پہلے جانتا تھا کہ پروجیکشن روم میں کسی لڑکی کی لاش موجود ہے جسے قتل کرنے سے پہلے بے آبرو بھی کیا گیا تھا۔ منیجر اور سپروائزر کی گفتگو بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے۔ سپروائزر کی یہ جان کاری حیرت انگیز ہی نہیں قابلِ تشویش بھی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لڑکی یعنی مقتولہ کو پیش آنے والے حالات و واقعات سے بخوبی آگاہ تھا۔''

میں نے گہری نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا جو مریل سی صورت بنائے میرے دلائل سن رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جنابِ عالی! سپروائزر کا دعویٰ ہے کہ سترہ اکتوبر کی رات اس نے مقتولہ اور ملزم کو ایک ساتھ پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ جب میں نے اس سے دونوں متذکرہ بالا افراد کے لباس کے بارے میں سوالات کئے تو وہ کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکا بلکہ لباس وغیرہ کے رنگ بھی ٹھیک طرح نہیں بتا سکا۔ یہ نوٹ کرنے کی بات ہے۔

ازیں علاوہ گواہ سپروائزر نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ ملزم انتہائی مغرور، جھگڑالو اور غصہ ور شخص

ہے لیکن وہ ملزم کی ان منفی عادتوں کی کوئی مثال پیش نہیں کر سکا جس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے، گواہ ملزم سے دشمنی کی بنا پر اس قسم کی الزام تراشی کا سہارا لے رہا ہے۔''

اس مرحلے پر وکیل استغاثہ نے اپنی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے کہا۔ ''گواہ، ملزم سے کیوں دشمنی کرے گا۔ اس سینما میں تو ملزم کو ملازمت دلوانے والا وہی شخص ہے؟''

میں نے کہا۔ ''دوستی اور دشمنی کا ثبوت انسان کے عمل سے ملتا ہے اور استغاثہ کے گواہ، سپروائزر کا عمل میرے موکل کے خلاف جاتا ہے۔ اس کا بیان ظاہر کرتا ہے کہ وہ ملزم کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لئے بے چین ہے۔''

پھر میں دوبارہ جج کی جانب متوجہ ہو گیا اور دلائل کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! سپروائزر کے بیان میں متعدد مقامات پر جھوٹ اور گھپلے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح سینما کے سویپر کا بیان بھی دروغ گوئی کی عمدہ مثال ہے۔ لگتا ہے، سپروائزر کے بیان سے مماثلت پیدا کرنے کے لئے خاکروب کو چند باتیں رٹوائی گئی ہیں۔ اس کے بیان کی دروغ گوئی دو باتوں سے بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔ نمبر ایک، اس نے بڑے وثوق سے بتایا ہے کہ وقوعہ کی رات جب وہ سپروائزر سے سو روپے ادھار لینے آیا تو اس نے سینما میں مقتولہ اور ملزم کو ایک ساتھ سینما کے پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا۔ میں نے جب گواہ سے مقتولہ کے لباس کے بارے میں سوال کیا تو اس نے جواب دیا، مقتولہ نے پھول دار کاٹن کا شلوار قمیض پہن رکھا تھا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مقتولہ وقوعہ کے روز مہندی رنگ کا ریشمی لباس زیب تن کئے ہوئے تھی اور اس پارٹی ڈریس کی وجہ تسمیہ مقتولہ کے باپ کے بیان سے ظاہر ہو چکی ہے۔ گواہ کا یہ جھوٹ ناقابل معافی اور قابل توجہ ہے۔ نمبر دو، خاکروب نے بھی ملزم کو جھگڑالو، فسادی، مغرور اور غصہ ور گردانتے ہوئے ایک فضول شخص کہا ہے مگر اس کی فضولیت کو ثابت نہیں کر سکا۔ اگر گواہ خاکروب ملزم سے کوئی ذاتی عناد نہیں رکھتا تو پھر یہ کہنا پڑے گا، اس نے سراسر دروغ گوئی سے کام لیا ہے۔''

میں نے چند لمحات کا توقف کیا پھر اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اب میں مقتولہ کے باپ کے بیان کی طرف آتا ہوں۔ اس نے بتایا، وقوعہ کی رات مقتولہ اپنی ایک سہیلی کی رسم مہندی میں شرکت کے لئے اس کے گھر گئی تھی مگر جب اس کا بھائی رات بارہ بجے کے لگ بھگ اسے واپس لانے سہیلی کے گھر پہنچا تو پتہ چلا وہ کسی ایمرجنسی کا بہانہ کر کے جا چکی ہے۔ مقتولہ کی سہیلی کو یہ جھوٹ اس لئے بولنا پڑا کہ مقتولہ اس سے ایک آدھ گھنٹے میں واپس آنے کا کہہ کر گئی تھی اور......'' میں نے ذرا توقف کرنے کے بعد سنسناتے ہوئے لہجے میں اضافہ کیا۔ ''اور گزشتہ پیشی پر مقتولہ کی حیدرآباد کی سہیلی کی زبانی اس بات کی حقیقت بھی کھل چکی ہے۔ یہ بات معزز عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ وقوعہ کی رات ٹھیک دس بجے اپنے کسی عاشق کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنے گئی تھی۔ اس کا عاشق کوئی امیر زادہ تھا، ایک سینما کے مالک کا بیٹا۔ اس امیر زادے کے استعمال میں

شیورلٹ جیسی قیمتی کار بھی تھی!''

میں نے طنزیہ نگاہ سے وکیل استغاثہ اور انکوائری افسر کو باری باری دیکھا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! جب مقتولہ اپنی سہیلی کے گھر سے اپنے امیر کبیر عاشق کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے گئی اس وقت میرا موکل پروجیکشن روم میں فلم کا آخری شو چلا رہا تھا یعنی ٹھیک دس بجے رات۔ اس بات کی تصدیق مقتولہ کی سہیلی کر چکی ہے کہ رات نو اور دس بجے کے درمیان مقتولہ اس کے گھر پر موجود تھی جبکہ استغاثہ کے گواہ سینما کے خاکروب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے ٹھیک سوا نو بجے مقتولہ اور ملزم کو سینما کے پروجیکشن روم کی طرف جاتے دیکھا تھا۔ انہی اوقات میں کچھ اسی قسم کا دعویٰ سینما کے سپروائزر نے بھی کیا ہے۔ ان دونوں کے جھوٹ کی قلعی کھل چکی ہے۔ مقتولہ کی سہیلی کے بیان کی روشنی میں ان کے دعوے باطل ہو چکے ہیں۔''

میں نے رک کر ایک طویل سانس خارج کی اور نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں جج سے درخواست کی۔ ''جناب عالی! ان حالات و واقعات کے پس منظر میں میرا موکل سراسر بے قصور اور مظلوم دکھائی دیتا ہے۔ حقائق کی روشنی اسے بے گناہ ثابت کرتی ہے۔ لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کرتا ہوں کہ میرے موکل کو باعزت بری کیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر!''

جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔ ''آپ کچھ کہنا چاہیں گے وکیل صاحب؟''

وہ ایک مرتبہ پھر کہانی کو گھسے پٹے انداز میں دہرانے لگا۔ ''جناب عالی! ملزم، مقتولہ سے گہرا عناد رکھتا تھا اور اس نے اپنی دیرینہ بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے......''

وکیل استغاثہ ابھی یہیں تک پہنچا تھا کہ جج نے اس کی بات کاٹ دی اور قدرے ناگوار لہجے میں کہا۔ ''اس کہانی کی اب ضرورت نہیں رہی۔ وکیل صفائی نے اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے جن حقائق کا تذکرہ کیا ہے، آپ ان کو غلط ثابت کرنے کے لئے کچھ کہنا چاہتے ہیں؟''

وکیل استغاثہ میرے دلائل سے بری طرح بوکھلایا ہوا تھا۔ وہ جج کے سوال کا جواب دینے کی بجائے مجھ سے مستفسر ہوا۔ ''اگر ملزم نے مقتولہ کو قتل نہیں کیا تو پھر اس کو بے آبرو کر کے قتل کرنے والا شخص کون ہے؟''

''یہ معلوم کرنا تو استغاثہ کا کام ہے۔'' میں نے تیکھے لہجے میں چوٹ کی۔ ''میں صرف اپنے موکل کو بچانے کا کام کرتا ہوں۔''

اس کا منہ لٹک گیا تاہم اس کی یہ مایوسی مجھ سے دیکھی نہ گئی اور میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے فاضل دوست! فی الحال تو یہ اہم بات سامنے آئی ہے کہ وقوعہ کی رات مقتولہ اپنے کسی عاشق کے ساتھ قیمتی شیورلٹ میں ملاقات کرنے گئی تھی۔ اب اس امیر زادے تک پہنچنا آپ کا کام ہے۔ وہ شخص بہتر طور پر بتا سکتا ہے کہ اس نے مقتولہ کو کہاں کی سیر کرائی تھی!''

جج نے فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

آئندہ پیشی پر ضروری عدالتی کارروائی کے بعد میرے موکل کو باعزت بری کر دیا گیا۔ تاہم اس دوران میں وکیل استغاثہ کے مشوروں پر پولیس نے بڑی سرگرمی دکھائی اور میرے اشارے کو فالو کرتے ہوئے انہوں نے سینما منیجر کے بیٹے کو گرفتار کر لیا۔

پولیس کی ابتدائی ''خاطر تواضع'' ہی نے منیجر کے بیٹے کو زبان کھولنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا۔ مقتولہ کی آبروریزی کے بعد موت کے گھاٹ اتارنے والا شخص وہی تھا۔ اس سلسلے میں سینما کے سپروائزر نے اس کی اچھی خاصی معاونت بھی کی تھی۔

منیجر کے بیٹے نے یہ وتیرہ اپنا رکھا تھا کہ اپنی امارت اور قیمتی شیورلٹ کا پُرکشش جال پھینک کر وہ ایسی لڑکیوں کو شکار کرتا تھا جو اپنی آنکھوں میں بہت اونچے خواب سجائے بیٹھی ہوتی تھیں۔ ایسی احمق اور اندھی لڑکیاں اس سے شادی کی خواہش اور امید میں اس کے جائز اور ناجائز مطالبے بھی مان لیتی تھیں، جنہیں مطلب نکل جانے کے بعد وہ دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر پھینکتا تھا۔ لیکن مقتولہ کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا تو وقت بہت آگے بڑھ چکا تھا۔ وہ ایک امیرزادے کی محبت میں اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ لٹا چکی تھی۔ اس نادرزیاں نے اس کا دماغ الٹ دیا۔ پھر وہ ایسی بپھری کہ قاتل کو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کرنا پڑا۔ اس نے مقتولہ کا گلا گھونٹ کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔ ازاں بعد مقتولہ کی لاش ٹھکانے لگانے کے لئے سپروائزر کے مشورے پر سینما کے پروجیکشن روم کا انتخاب کیا گیا۔ سپروائزر مقتول اور میرے موکل کے ماضی سے گہری واقفیت رکھتا تھا۔ اس طرح میرے موکل کو پھنسانے کا بہت مضبوط بندوبست کر دیا گیا تھا۔

مگر وہ کہتے ہیں نا...... جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے! میرا بے گناہ موکل موت کے جبڑوں سے زندہ سلامت واپس آ گیا اور اصل قاتل قرار واقعی سزا پا کر پھانسی کے پھندے تک جا پہنچا اور مقتولہ...... اس نے اپنی آنکھوں سے کہیں بڑے خواب دیکھ لئے تھے چنانچہ اس کے خوابوں کی تعبیر اس کی سوچ کے برعکس ثابت ہوئی۔

☆☆☆

کج بخت

مارچ کے مہینہ کا آغاز ہو چکا تھا۔

سردی مکمل طور پر گئی تھی، نہ ہی پوری طرح گرمی شروع ہوئی تھی۔ موسم خاصا معتدل اور خوشگوار ہو رہا تھا۔ میں حسب معمول اپنے دفتر میں بیٹھا پیشہ ورانہ ذمے داری نبھا رہا تھا کہ میری سیکرٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی۔

''سر! فریدی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟''

''کون فریدی صاحب؟''

''ان کا پورا نام جمیل فریدی ہے۔'' سیکرٹری نے بتایا۔

میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا مگر جمیل فریدی نام کا کوئی شخص وہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے اپنی سیکرٹری سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم انہیں انتظار گاہ میں بٹھاؤ اور ان کی باری پر میرے پاس بھیج دینا۔''

سیکرٹری نے کہا۔ ''سر! نمبر وار ان کی باری تو دو گھنٹے بعد آئے گی۔''

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔

میرے سوال پر سیکرٹری گڑبڑا گئی، جلدی سے بولی۔ ''سر! فریدی صاحب کا کہنا ہے کہ وہ آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ اگر بیچ میں آپ انہیں بلوا لیں تو مہربانی ہوگی۔'' ایک لمحے کا توقف دے کر اس نے اضافہ کیا۔ ''بیگ صاحب! جمیل فریدی صاحب آپ کے ایک دوست آذر علی کا حوالہ بھی دے رہے ہیں۔ آذر صاحب ہی نے انہیں آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

آذر علی سے میرے بڑے گہرے اور دیرینہ دوستانہ مراسم تھے۔ ''ریفرنس'' کا پاس کرنا ہماری مشرقی روایات کا خاصہ ہے اس لئے میں نے اپنی سیکرٹری سے کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے، میں انہیں تھوڑی دیر میں بلواتا ہوں۔''

انٹرکام کا ریسیور کریڈل کرنے کے بعد میں اپنے اس کلائنٹ کے ساتھ مصروف ہو گیا جو اس وقت میرے چیمبر میں موجود تھا۔ یکے بعد دیگرے دو مزید کلائنٹس نمٹانے کے بعد میں نے جمیل فریدی کو اپنے چیمبر میں بلوا لیا۔

جمیل فریدی کی عمر پچاس اور پچپن کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ اپنے وضع قطع اور شخصیت کے اعتبار سے ایک معزز اور صاحب حیثیت شخص دکھائی دیتا تھا۔ اس کا شمار ان افراد میں کیا جا سکتا تھا

جو قابل بھروسہ اور معقول ہوتے ہیں۔

میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لئے اپنی میز کی دوسری جانب رکھی کرسیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور جیب سے تعارفی کارڈ نکال کر میری سمت بڑھا دیا۔

میں نے اس کے وزیٹنگ کارڈ پر ایک نگاہ ڈالی جس کے مطابق وہ شہر کے ایک معروف فور اسٹار ہوٹل کا مالک تھا۔ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے وزیٹنگ کارڈ کو اپنے سامنے میز پر رکھا۔

وہ میری نگاہ کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! آذر علی آپ کے بہت اچھے دوست ہیں۔ میری ان کی شناسائی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا تاہم ہمارے درمیان بہت اچھی انڈرسٹینڈنگ اور کاروباری مراسم ہیں۔ مجھے ایک سلسلے میں قانونی مدد کی ضرورت پیش آئی تو آذر نے آپ سے ملنے پر زور دیا۔ ویسے تو میرے تعلق داروں میں ایک دو بہت معروف وکیل ہیں لیکن آذر کا مشورہ یہی ہے کہ آپ میرے معاملے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔''

''معاملہ کیا ہے؟'' میں نے کاغذ قلم سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کو مجھ سے کس قسم کی قانونی مدد درکار ہے؟''

''دراصل معاملہ میرا نہیں بلکہ میرے ایک ملازم کا ہے۔'' جمیل فریدی نے وضاحت آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرے ہوٹل کا کک شمشاد علی ایک بن بلائی مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے۔ وہ اس وقت جیل میں بند ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ شمشاد علی بے گناہ ہے۔ آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ آپ شمشاد علی کی بے گناہی ثابت کر کے اسے جیل سے رہائی دلائیں۔''

جمیل فریدی کی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ ''جمیل صاحب! پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کے ہوٹل کا باورچی جیل میں کیوں بند ہے...... یعنی اس پر کون سا الزام ہے؟ اس کے بعد یہ بھی بتائیں کہ کس بنیاد پر آپ یہ خیال کرتے ہیں، شمشاد علی بے گناہ ہے؟''

وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! شمشاد علی پر قتل کا الزام ہے۔ اور رہی بات اس کی بے گناہی کی تو...... وہ گزشتہ دس سال سے میرے پاس ملازم ہے۔ ویسے تو میرے ہوٹل کے کچن میں کھانا پکانے کا کام کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد ہے مگر شمشاد علی کی اپنی ایک جداگانہ اہمیت ہے۔ وہ کچن کا ہیڈ کک بھی ہے۔ میں دس سال کے طویل عرصے کے دوران میں اس کی زندگی کے ہر گوشے سے واقف ہو چکا ہوں اور اسے بھی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ بتاتا ہے کہ شمشاد علی قتل جیسے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔''

میں نے جمیل فریدی کے تجربے اور مشاہدے کو چیلنج کئے بغیر اہم نکتے کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کے ہوٹل کے باورچی نے کس کا قتل کیا ہے...... میرا مطلب ہے، شمشاد علی پر

کس شخص کو قتل کرنے کا الزام عائد کیا گیا ہے؟''

''مقتول کا نام عالیہ رحمٰن ہے۔'' اس نے بتایا۔

میں نے پوچھا۔ ''مقتول سے شمشاد علی کا کیا تعلق تھا؟''

''کوئی خاص نہیں۔'' جمیل فریدی نے جواب دیا۔ ''شمشاد، مقتولہ کے لئے ہفتے میں تین دن کھانا تیار کرتا تھا اور یہ کھانا بھی وہ اپنے گھر میں بنا کر اس کو پہنچاتا تھا۔''

''اپنے گھر میں کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

جمیل فریدی نے بتایا۔ ''بات دراصل یہ ہے کہ عالی رحمٰن نامی وہ عورت اپنے فلیٹ میں بالکل تنہا رہتی تھی۔ وہ اپنے یہاں لوگوں کا آنا جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ شمشاد علی سے اس نے یہی طے کر رکھا تھا کہ وہ ہفتے میں تین روز کھانا تیار کر کے اسے پہنچا آئے۔ کھانے کے سامان کی خریداری کے علاوہ شمشاد کو ''کوکنگ'' کے ذیل میں ایک معقول معاوضہ بھی دیتی تھی۔

میں تیزی سے اپنے پیڈ پر اہم نکات نوٹ کرتا جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''جمیل صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ آپ کا باورچی اس وقت جیل میں ہے۔ آپ کا مجھ سے رابطہ کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے باورچی کو ابھی سزا نہیں سنائی گئی اور آپ میری مدد سے اس کی رہائی چاہتے ہیں۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟''

اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ شمشاد کا کیس عدالت میں چل رہا ہے۔ لگ بھگ دو ماہ ہونے کو آ رہے ہیں مگر ابھی تک کوئی خاص قسم کی کارروائی عمل میں نہیں آئی۔ شمشاد علی جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کسٹڈی میں ہے۔''

''اس سے پہلے شمشاد کا کیس کون لڑ رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک وکیل صاحب تھے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں ان کا نام نہیں لینا چاہتا تاہم میں ان کی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہوں اسی لئے آپ کو اپروچ کیا ہے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''شمشاد علی کو کب اور کہاں سے گرفتار کیا گیا تھا؟''

''شمشاد علی کو اس کی رہائش گاہ سے گرفتار کیا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اس روز مہینے کی تیرہ تاریخ تھی...... یعنی تیرہ جنوری۔''

''شمشاد علی کی رہائش کہاں پر تھی؟''

''کینٹ اسٹیشن کے نزدیک اس نے ایک کوارٹر کرائے پر لے رکھا تھا۔'' جمیل فریدی نے جواب دیا۔ ''جہاں وہ اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کا اپنا گھر راولپنڈی میں ہے جہاں اس کی بیوی اور بچی رہتے ہیں۔ آج کل وہ دونوں بھی یہاں آئی ہوئی ہیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''مقتولہ عالیہ رحمٰن کی رہائش بھی کینٹ کے آس پاس ہی ہوگی؟''

''نہیں۔'' وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عالیہ رحمٰن ساحل سمندر پر واقع ایک اپارٹمنٹ

بلڈنگ میں رہتی تھی۔ اس کا فلیٹ بلڈنگ کے آخری یعنی آٹھویں فلور پر واقع تھا۔''

''جہاں وہ بالکل تنہا رہتی تھی!'' میں نے لقمہ دیا۔

اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ''عالیہ رحمٰن کو کب قتل کیا گیا؟''

''آٹھ جنوری کو۔'' اس نے بتایا۔

''آٹھ جنوری کو قتل کا واقعہ پیش آیا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مگر شمشاد علی کی گرفتاری تیرہ جنوری کو عمل میں آئی۔ یہ پانچ دن کی تاخیر کس خوشی میں کی گئی؟''

جمیل فریدی نے بتایا۔ ''بیگ صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ عالیہ رحمٰن کو قتل تو آٹھ جنوری کی رات ہی میں کیا گیا تھا تاہم اس کی لاش کا سراغ تیرہ جنوری کو ملا۔ اس کے بعد ہی شمشاد علی کو گرفتار کیا گیا تھا۔''

''مقتولہ کی لاش، موت واقع ہونے کے پانچ روز بعد دریافت کی گئی۔'' میں نے بدستور کاغذ پر قلم چلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کے بعد اسی روز آپ کے ہیڈ کک مسٹر شمشاد علی کو گرفتار کر لیا گیا۔ عالیہ رحمٰن کے قتل کا الزام شمشاد پر عائد کرنے کی کیا وجہ تھی؟''

وہ میرے سوال کا مقصد سمجھ گیا، اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''بیگ صاحب! پولیس نے تیرہ جنوری کو مقتول کے فلیٹ کا دروازہ توڑ کر ''دروازے کا لاک توڑ کر'' عالیہ رحمٰن کی لاش دریافت کی تھی۔ فلیٹ کی اندرونی حالت سے بخوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سیدھی سیدھی ڈکیتی اور قتل کی واردات تھی۔'' ایک لمحے کو وہ سانس لینے کی خاطر رکا پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''فوری طور پر شمشاد علی کو گرفتار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ موقع واردات پر شمشاد علی کا ''ہوٹل کارڈ'' پڑا پایا گیا تھا۔ اس کارڈ کی مدد سے پولیس والے پہلے ہوٹل پہنچے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ شمشاد علی چھٹی کر کے گھر جا چکا ہے تو انہوں نے شمشاد کے ایک ساتھی سے اس کے کوارٹر کا پتہ معلوم کیا پھر وہ اس کے گھر جا دھمکے اور اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ تھانے لے گئے۔''

''آپ کی فراہم کردہ معلومات خاصی سنسنی خیز اور دلچسپ ہیں۔'' میں نے فور اسٹار ہوٹل کے مالک جمیل فریدی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بہتر ہوگا کہ آپ مجھے اس کیس کے بارے میں تفصیلاً بتائیں تاکہ میں شمشاد علی کی پوزیشن اور حیثیت کا تعین کر سکوں۔''

وہ بولا۔ ''میں اس سلسلے میں جو کچھ جانتا ہوں وہ تو آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں مگر بہتر ہوگا، آپ شمشاد علی سے بھی ایک ملاقات کر لیں۔ اصل اور تفصیلی کہانی تو آپ کو وہی سنائے گا۔''

''اس سے بھی میں ضرور ملوں گا۔'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

جمیل فریدی نے پوچھا۔ ''کیا شمشاد سے ملاقات کے لئے آپ جیل جائیں گے؟''

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔ ''آئندہ پیشی کب ہے؟''

''دو روز بعد۔'' جمیل فریدی نے جواب دیا۔

میں نے مطمئن لہجے میں کہا۔ ''تب پھر جیل جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں وہیں عدالت میں اس سے اہم اور کام کی باتیں معلوم کر لوں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے جمیل فریدی سے کہا۔ ''فی الحال آپ کو جو کچھ معلوم ہے اس سے مجھے آگاہ کر دیں۔''

آئندہ پندرہ بیس منٹ میں اس نے مجھے کافی مفید معلومات فراہم کیں اور اپنی گفتگو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''بیگ صاحب! میرے ہوٹل کے کھانے غیر معمولی شہرت کے حامل ہیں...... اور اس شہرت کے حصول میں شمشاد برابر کا حصے دار ہے۔ میں اس کی خدمات کو فراموش نہیں کر سکتا۔ لہٰذا آپ یوں سمجھیں کہ اس کیس کے سلسلے میں آپ کی فیس سے لے کر عدالتی اخراجات تک جو بھی رقم خرچ ہوگی وہ میں اپنی جیب سے ادا کروں گا۔ میں اپنی رقم خرچ کروں گا، آپ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو کام میں لائیں۔ انشاء اللہ شمشاد علی باعزت بری ہو جائے گا۔''

میں نے اپنی فیس کی رقم وصول کر کے اسے رسید دے دی اور وہ میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

دو روز بعد شمشاد علی جب عدالت میں پیش ہوا تو میں نے اس کی حفاظت پر متعین سپاہی کی مٹھی گرم کر کے شمشاد علی سے ایک بھرپور ملاقات کر لی۔ ساتھ ہی میں نے وکالت نامے پر ملزم کے دستخط بھی لے لئے تھے۔ بعد ازاں میں نے متعلقہ عدالتی عملے سے کیس کی نقل بھی حاصل کر لی تھی۔ میں یہ بات پہلے ہی معلوم کر چکا تھا کہ آئندہ پیشی ایک ماہ بعد تھی، یہ مدت میرے لئے بہت زیادہ تھی۔ اس دوران میں، میں بڑی تفصیل اور باریک بینی سے کیس فائل کا مطالعہ کر سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

ملزم شمشاد علی سے ہونے والی ''ملاقات'' اور اس کے مقدمے کی فائل کے مطالعے سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئیں اس میں غیر ضروری باتیں حذف کر کے میں ایک خلاصہ قسم کا جائزہ یہاں پیش کرتا ہوں تاکہ قارئین سسپنس اس مقدمے کے پس منظر سے اچھی طرح آگاہ ہو سکیں۔ یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ان میں سے بہت سی باتیں مجھے بعد میں معلوم ہوئی تھیں اور چند ایک نہایت ہی اہم معاملات کی تفصیل میں نے اپنے مخصوص ذرائع سے حاصل کی تھی۔

☆☆☆

ملزم یعنی میرا موکل شمشاد علی راولپنڈی کے کسی نواحی گاؤں کا رہنے والا تھا اور ایک طویل عرصے سے کراچی میں نوکری کر رہا تھا۔ جمیل فریدی کے بیان کے مطابق وہ اس کے ہوٹل میں دس سال سے کام کر رہا تھا۔ شمشاد کی عمر لگ بھگ چالیس سال تھی۔ اس کی بیوی بشریٰ اور بیٹی کلثوم راولپنڈی میں رہتے تھے تاہم شمشاد پر نازل ہونے والی اس افتاد کا سن کر وہ دونوں کراچی چلی آئی

تھیں اوران دنوں اس کے کینٹ والے کوارٹر ہی میں ٹھہری ہوئی تھیں۔

واقعات کے مطابق شمشاد علی ہوٹل کی ملازمت کے علاوہ مقتولہ عالیہ رحمٰن کے لئے بھی کوکنگ کا کام کرتا تھا۔ مقتولہ اس کے علاوہ سودا سلف کے لئے اسے ایک معقول رقم دیتی تھی۔ شمشاد، مقتولہ کے بتائے ہوئے مینیو کے مطابق کھانے تیار کر کے ہفتے میں تین روز اس کے گھر پہنچا دیتا تھا۔ یہ تین روز مخصوص تھے یعنی پیر، بدھ اور جمعہ۔ ''یہ ڈیوٹی'' وہ کم وبیش چار سال سے انجام دے رہا تھا۔ وہ سال میں صرف ایک مرتبہ اپنے آبائی گاؤں ہفتے بھر کے لئے جاتا تھا اور بیوی بچوں سے مل کر واپس آ جاتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اسے ہوٹل کے ساتھ ساتھ مقتولہ سے بھی چھٹی لینا پڑتی تھی تاہم یہ ہفتے کی چھٹی صرف تین دن پر مشتمل ہوتی تھی۔

مقتولہ عالیہ رحمٰن اپنے فلیٹ میں بالکل تنہا رہتی تھی۔ حاصل شدہ معلومات کے مطابق وہ اریب قریب پانچ سال سے اسی فلیٹ میں رہائش پذیر تھی۔ مقتولہ کا آس پڑوس یا بلڈنگ کے دیگر مکینوں سے کسی قسم کا میل تال نہیں تھا۔ وہ انتہائی ریزرو رہنے والی عورت تھی۔ ویسے بھی وہ معاشرے کے جس طبقے اورانسانوں کی جس کلاس میں قیام پذیر تھی وہاں صرف اپنے کام سے کام رکھا جاتا تھا۔ کوئی ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہتا اور کسی کو اس بات سے کوئی مطلب نہیں ہوا کہ اس کے پڑوس میں کون آباد ہے اوراس کی مصروفیات کیا ہیں؟ یہ سب اپنے آپ میں مگن رہنے والے لوگ ہوتے ہیں...... اوراپنے معاملات میں کسی دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔

مقتولہ کے فلیٹ پر صرف چار افراد کا آنا جانا تھا۔ نمبر ایک، سلیم قدوسی۔ یہ شخص ایک بوتیک کا مالک تھا۔ سلیم قدوسی کی عمر پچاس کے قریب تھی اوراس کی بوتیک بہادرآباد کے علاقے میں واقع تھی۔ مقتولہ اعلیٰ درجے کی ڈریس ڈیزائنر بھی تھی۔ سلیم قدوسی اسی سلسلے میں اس سے ملنے آتا تھا تاہم اس کی آمد کے لئے ہفتے میں صرف دو دن مخصوص تھے...... پیر اور جمعرات۔ ان دونوں دنوں میں وہ سہ پہر تین سے چار بجے کے درمیان مقتولہ سے ملنے اس کے فلیٹ پر آتا تھا۔

نمبر دو، شمشاد علی۔ ملزم ہفتے میں تین دن (پیر، بدھ، جمعہ) شام پانچ بجے کے قریب کھانا لے کر مقتولہ کے فلیٹ پر پہنچتا تھا۔ وہ کھانے کی مختلف ڈشوں کو مقتولہ کے حوالے کر کے واپس چلا جاتا تھا۔

نمبر تین، عزیزہ۔ یہ گھروں میں کام کرنے والی ایک ماسی نما عورت تھی۔ تاہم وہ اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے ماسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ عزیزہ کی عمر پینتالیس کے قریب تھی۔ وہ ہفتے اور اتوار کے علاوہ روزانہ دن میں گیارہ سے بارہ بجے تک ایک گھنٹے کے لئے مقتولہ کے فلیٹ پر آتی تھی۔ صفائی ستھرائی اور جھاڑو پونچھے جیسے کام اس کے ذمے تھے۔ وہ ایک گھنٹے میں اپنا کام نمٹا کر واپس چلی جاتی تھی۔

نمبر چار، کنول۔ یہ اٹھارہ سال کی ایک سائنس اسٹوڈنٹ تھی اورانٹرنس پری میڈیکل کی تیاری کر رہی تھی۔ مقتولہ کے معمولات میں ایک یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ ایک وقت میں کسی ایک لڑکی

کو انٹر سائنس کی ٹیوشن ضرور پڑھایا کرتی تھی۔ کنول کی رہائش وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ ہفتے اور اتوار کے علاوہ روزانہ شام کو چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک مقتولہ سے ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔

ان چار افراد کے علاوہ کوئی بھی شخص مقتولہ کے فلیٹ میں داخل نہیں ہوتا تھا اور یہ چاروں مقتولہ کے لئے قابل بھروسہ تھے۔ مجھے جہاں تک معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق مقتولہ کا اور کوئی ملاقاتی اس سے ملنے نہیں آتا تھا۔ لانڈری وغیرہ سے کپڑے لانے اور لے جانے کا کام وہ خود کرتی تھی۔ وہ روزانہ لگ بھگ دس بجے رات فلیٹ سے نکلتی تھی اور گھنٹہ، آدھا گھنٹہ باہر گزار کر اپنی ٹویوٹا کرولا پر واپس آ جاتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ ہفتے کی رات اور اتوار کا دن اپنے گھر سے باہر گزارتی تھی تاہم یہ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ لگ بھگ چوبیس گھنٹے کے لئے کہاں جاتی تھی!

اس تناظر میں مقتولہ عالیہ رحمٰن کے بارے میں بھی تفصیلاً بتا دینا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے خود بھی مقتولہ کے بارے میں جاننے کے لئے تھوڑا فیلڈ ورک کیا تھا اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ خاصی صاحب حیثیت شخصیت تھی۔ قتل کے وقت عالیہ رحمٰن کی عمر لگ بھگ پینتیس سال رہی ہوگی۔ وہ گزشتہ پانچ سال سے ساحل سمندر پر واقع اس فلیٹ میں تنہا رہ رہی تھی۔ اس کے تنہا زندگی گزارنے کی کئی اور وجوہات تھیں جن میں سب سے واضح وجہ یہ تھی کہ پانچ سال پہلے اس کے باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ عالیہ رحمٰن کا باپ عبدالرحمٰن ایک کاروباری شخص تھا۔ گلشن اقبال کے ایک عالی شان بنگلے میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ رہتا تھا۔ عالیہ کی والدہ صادقہ کی شادی کم عمری میں ہی ہو گئی تھی اور عالیہ اس کی پہلی اولاد تھی۔ پھر حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ عالیہ کے والدین میں لڑائی جھگڑے شروع ہو گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان میں علیحدگی ہو گئی۔ جب صادقہ بیگم اپنے شوہر سے طلاق حاصل کر چکی اس وقت عالیہ کی عمر صرف آٹھ سال تھی۔ عبدالرحمٰن نے حتیٰ الوسع کوشش کی تھی کہ صادقہ اسے چھوڑ کر نہ جائے مگر اس کی یہ کوشش ناکامیاب رہی تھی۔ صادقہ نے طلاق کے کچھ عرصے بعد ایک ممتاز صنعت کار جمشید غوری سے شادی کر لی تھی۔ یہ بھی سننے میں آیا تھا کہ صادقہ، جمشید غوری کی محبت میں مبتلا ہو گئی تھی۔

عالیہ رحمٰن اپنے باپ کے پاس رہ گئی تھی۔ اس کے باپ نے بھی کچھ عرصے بعد فہمیدہ نامی ایک لڑکی سے شادی کر لی تھی جس سے اب عبدالرحمٰن کے تین بچے تھے۔ چھبیس سالہ فرقان جس نے امریکہ کے ایک میڈیکل کالج سے ایم ڈی۔ (ڈاکٹر آف میڈیسن) کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہیں کے ایک ہسپتال میں ملازمت کر لی تھی۔ اس سے چھوٹا تئیس سالہ عدنان تھا جو اپنے بڑے بھائی کی ضد ثابت ہوا تھا۔ اس نے بمشکل رو دھو کر انٹرنس کیا تھا اور پڑھائی چھوڑ کر آوارہ گردی کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ لوفر لڑکوں کی صحبت میں وہ سگریٹ نوشی، چوری، دنگا فساد، آوارہ گردی اور لڑکیوں کو تنگ کرنے جیسے تمام قابل مذمت کاموں میں ''ماہر'' ہو گیا تھا۔ عبدالرحمٰن اس کی حرکتوں سے نالاں رہتا تھا۔ لڑکیوں کے ذیل میں ایک ایسا شرمناک واقعہ پیش آیا جسے عبدالرحمٰن

برداشت نہ کر سکا۔ اسے شدتِ غم سے دل کا دورہ پڑا جو ازاں بعد جان لیوا ثابت ہوا۔

عدنان سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ فوزیہ نامی اس لڑکی نے حال ہی میں میٹرک پاس کیا تھا۔ فوزیہ کی عمر کم و بیش پندرہ سال تھی۔

عبدالرحمٰن نے اپنی زندگی میں ایک اچھا کام یہ کیا تھا کہ اپنی دولت و جائیداد کے معاملات کی تقسیم کا مسئلہ صاف کر دیا تھا۔ اس نے ایک وکیل کی مدد سے وصیت تیار کروالی تھی تاکہ اس کی موت کے بعد اولاد اور بیوی میں کسی قسم کا تنازع نہ اٹھ کھڑا ہو۔ پانچ سال قبل جب عبدالرحمٰن کا انتقال ہوا، مقتولہ عالیہ رحمٰن اپنی سوتیلی ماں اور بہن بھائی کے ساتھ گلشن اقبال والے بنگلے میں رہتی تھی مگر والد کی وفات کے بعد وہ وصیت کے مطابق اپنا حصہ لے کر الگ ہوگئی۔

عالیہ رحمٰن کے حصے میں لگ بھگ بیس لاکھ روپے آئے تھے۔ پچیس تیس سال پہلے یہ بہت بڑی رقم تھی۔ عالیہ نے چونکہ بالکل الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا چنانچہ سب سے پہلے اس نے اپنی رہائش کا بندوبست کیا۔ ساحل سمندر پر واقع ایک خوب صورت اپارٹمنٹ بلڈنگ میں اس نے آٹھ لاکھ روپے کا ایک فلیٹ خریدا۔ آج کل اس نوعیت کے فلیٹ کی قیمت کم و بیش پچیس لاکھ ہوگی۔ تین لاکھ کی رقم سے عالیہ نے ایک شاندار گاڑی خریدی۔ آٹھ لاکھ روپے ایک محفوظ ترین اسکیم میں انویسٹ کر دیئے جہاں سے اسے منافع کے طور پر دس ہزار روپے ماہانہ آمدنی ملنے لگی۔ باقی رقم اس نے فلیٹ کی ڈیکوریشن اور اپنے زیورات و ملبوسات پر خرچ کر ڈالی۔

عالیہ رحمٰن نے بی ایس سی کے بعد انگلش میں ماسٹرز کیا ہوا تھا۔ علاوہ ازیں وہ ایک اعلیٰ پائے کی ڈریس ڈیزائنر بھی تھی۔ فلیٹ میں منتقل ہونے کے بعد اس نے خود کو مصروف رکھنے کے لئے ٹیوشن کے ساتھ ساتھ ڈریس ڈیزائننگ بھی شروع کر دی۔ اس طرح اسے ایک معقول آمدنی بھی ہو جاتی تھی۔ یہ کام وہ ایک اصول کے تحت کرتی تھی۔ یعنی وہ صرف ایک ہی بوتیک کے لئے ڈیزائننگ کرتی تھی۔ بوتیک کا مالک سلیم قدوسی مقررہ دنوں میں مخصوص اوقات پر اس کے پاس آتا تھا۔ اسی طرح وہ ایک وقت میں صرف ایک اسٹوڈنٹ کو فزکس، کیمسٹری، بائیولوجی اور انگلش کی ٹیوشن پڑھاتی تھی جس کے لئے اس نے ایک خاص وقت مقرر کر رکھا تھا۔

مقتولہ اپنے قائم کردہ اصولوں اور ضابطوں کے مطابق کم و بیش پانچ سال سے اس قسم کی زندگی گزار رہی تھی کہ ایک روز اسے قتل کر دیا گیا۔ عالیہ رحمٰن کے قتل کے الزام میں باورچی شمشاد علی کو گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا جس کے نتیجے میں ملزم شمشاد علی جوڈیشل ریمانڈ پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلا گیا تھا۔

واقعات کے مطابق مقتولہ کی لاش تک پہنچنے کے لئے پولیس والوں کو اس کے فلیٹ کا لاک توڑنا پڑا تھا۔ پولیس والوں کو اطلاع دینے والا مقتولہ کا پڑوسی ظہیر خان تھا جو فلیٹ نمبر آٹھ سو دو میں رہتا تھا۔ عالیہ رحمٰن کے فلیٹ کا نمبر آٹھ سو ایک تھا۔ مقتولہ کے بالکل سامنے آٹھ سو چار میں ایک

بینکار مقبول حسین رہتا تھا جبکہ ظہیر خان کے سامنے یعنی آٹھ سو تین میں نادر علی نامی ایک شخص اپنی فیملی کے ساتھ رہائش پذیر تھا۔ اس بلڈنگ میں ایک فلور پر صرف چار فلیٹ ہی بنے ہوئے تھے۔ وہ فلور اس بلڈنگ کا آخری فلور تھا۔

ظہیر خان کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں جنرل منیجر تھا۔ تیرہ جنوری منگل کی رات اس کے فلیٹ کی گھنٹی بجی۔ اس وقت چھ بجے تھے۔ ان دنوں ساڑھے پانچ کے قریب سورج غروب ہو جاتا تھا اور اس وقت مکمل اندھیرا ہو چکا ہوتا تھا۔ ظہیر خان کے ملازم نے گھنٹی کی آواز پر دروازہ کھولا تو سامنے کنول کو اپنے والد کے ساتھ کھڑے پایا۔ ظہیر کا ملازم عبدالکریم کنول کو مقتولہ کی اسٹوڈنٹ کے حوالے سے جانتا تھا۔ عبدالکریم ایک فل ٹائم گھریلو ملازم تھا جو باورچی ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر چھوٹے موٹے کام بھی کرتا تھا۔ وہ اپنی نوجوانی کی عمر سے ظہیر خان کے گھر میں رہ رہا تھا۔ وہ اس دنیا میں تنہا تھا۔ عنقریب ظہیر کے توسط سے اس کی شادی بھی ہونے والی تھی۔

''جی فرمائیں!'' عبدالکریم نے سوالیہ انداز میں کہا۔

کنول کے والد نے کہا۔ ''میں اس گھر کے مالکوں سے ملنا چاہتا ہوں۔''

عبدالکریم نے ایک نظر کنول کو دیکھتے ہوئے اس کے والد نفیس احمد سے کہا۔ ''آپ اندر آ جائیں۔'' اس کے ساتھ ہی اس کے داخلے کا راستہ چھوڑ دیا۔

چند لمحوں کے بعد کنول اور نفیس احمد، ظہیر خان کے ڈرائنگ روم میں گداز صوفوں پر براجمان ہو چکے تھے۔ عبدالکریم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر اطلاع دینے چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد ظہیر خان بہ نفس نفیس وہاں موجود تھے۔

ظہیر خان عام طور پر رات دیر سے گھر آتا تھا تاہم اس روز اس کی طبیعت ناساز تھی اس لئے وہ سرِ شام ہی دفتر سے نکل آیا تھا۔ کنول اور نفیس احمد اس کے لئے اجنبی تھے۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ کنول کو بھی وہ آج پہلی مرتبہ ہی دیکھ رہا تھا۔

ظہیر خان کے چہرے پر موجود الجھن کو رفع کرنے کے لئے نفیس احمد نے کہا۔ ''میرا نام نفیس احمد ہے اور میں یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر واقع ایک بلڈنگ میں رہتا ہوں۔ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہوں۔'' پھر اس نے اپنے قریب بیٹھی کنول کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ میری بیٹی ہے جو آپ کے پڑوس میں عالیہ رحمٰن نامی خاتون سے ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔''

ظہیر خان کا چہرہ بدستور الجھن زدہ خیالات کی غمازی کر رہا تھا۔ اس نے قدرے اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''محترم! میں ابھی تک آپ کے آنے کا مقصد نہیں سمجھ پایا ہوں۔''

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' نفیس احمد نے شائستہ لہجے میں کہا۔ ''دراصل بات یہ ہے کہ میری بیٹی اپنی ٹیوٹر کی طرف سے بہت پریشان رہتی ہے۔ یہ ہفتے اور اتوار کے علاوہ روزانہ چھ سے آٹھ بجے تک عالیہ رحمٰن سے ٹیوشن پڑھنے آتی ہے۔ آخری مرتبہ بھی جمعرات آٹھ جنوری کو پڑھ کر

گئی تھی۔ جمعہ کے روز یہ پڑھنے آئی تو کئی مرتبہ گھنٹی بجانے کے باوجود بھی دروازہ نہیں کھولا گیا حالانکہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ دوسری مرتبہ گھنٹی بجانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔"

ایک لمحے کو نفیس احمد سانس لینے کو رکا، پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بہر حال کنول واپس گھر چلی گئی۔ اس نے یہی خیال کیا کہ ممکن ہے، عالیہ رحمٰن گھر میں موجود ہی نہ ہو! اپنے اس خیال پر اسے الجھن بھی محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس قسم کا اتفاق پہلے کبھی پیش نہیں آیا تھا۔"

نفیس احمد نے اتنا بتا کر ظہیر خان کے چہرے پر موجود تاثرات کا جائزہ لیا اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے، میں خوامخواہ آپ کے آرام میں مخل ہوا ہوں۔ یقیناً آپ کا یہ وقت بہت قیمتی ہوگا مگر....."

ظہیر خان نے قطع کلامی کرتے ہوئے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "کوئی بات نہیں، آپ بتائیں مزید کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

"جمعہ کے بعد ہفتہ اور اتوار کو کنول کی ٹیوشن کی چھٹی ہوتی ہے۔" نفیس احمد نے کہا۔ "پیر بارہ جنوری یعنی گزشتہ روز مقررہ وقت پر کنول اپنی ٹیوٹر کے دروازے پر پہنچی تو اسے جمعہ والی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ کئی مرتبہ گھنٹی بجانے پر بھی عالیہ رحمٰن نے دروازہ نہیں کھولا اور کنول مایوس ہو کر واپس چلی گئی۔ آج یہ مجھے بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔" نفیس احمد نے ذرا توقف کر کے ظہیر خان کی آنکھوں میں دیکھا اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کو حیرت ہوگی جناب! آج بھی وہی صورت حال ہے۔ میں خود متعدد بار گھنٹی بجا چکا ہوں لیکن جواب ندارد۔"

"اس میں میرے لئے حیرت کی کون سی بات پوشیدہ ہے؟" ظہیر خان نے بیزاری سے پوچھا۔

نفیس احمد نے کہا۔ "جناب! عالیہ رحمٰن آپ کی پڑوسی ہے اور....."

"دیکھیں نفیس صاحب!" ظہیر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، عالیہ رحمٰن نامی وہ عورت میری پڑوسی ہے مگر ہم پڑوسیوں کے معاملات و معمولات پر نظر نہیں رکھتے۔ میں نہیں جانتا، عالیہ رحمٰن جب اپنے فلیٹ میں ہوتی ہے تو کیا کرتی ہے اور جب یہاں نہیں ہوتی تو کہاں جاتی ہے!"

ظہیر خان کی اکتاہٹ کے پیش نظر نفیس احمد نے کہا۔ "جناب! ممکن ہے، آپ کے گھر کے کسی اور فرد کو عالیہ رحمٰن کے غیاب کے بارے میں کچھ معلوم ہو۔ ہم دراصل اس کی خیریت جاننے کے لئے بے چین ہیں۔"

ظہیر نے وہیں بیٹھے بیٹھے عبدالکریم کو آواز دی۔ وہ اس وقت کچن میں موجود تھا۔ کچن ڈرائنگ روم کے نزدیک ہی واقع تھا۔ اپنے مالک کی آواز پر ملازم فوراً اس کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ظہیر خان نے کہا۔ "کریم! بیگم صاحبہ تو اس وقت گھر پر موجود نہیں ہیں۔ بچے بھی ان کے ساتھ ہی گئے ہوئے ہیں۔" پھر اس نے نفیس احمد کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ صاحب آٹھ سو ایک والی خاتون کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔ اگر تم کچھ جانتے ہو تو انہیں بتا دو۔"

وہ بولا۔ "ہاں، میں نے آپ کی بیٹی کو آٹھ سو ایک میں آتے جاتے کئی مرتبہ دیکھا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے، یہ وہاں ٹیوشن پڑھنے آتی ہے۔ لیکن عالیہ رحمٰن کہاں روپوش ہے، اس سلسلے میں، میں کچھ نہیں جانتا لیکن....."

بولتے بولتے وہ اچانک رک گیا اور ایسی نظر سے وہاں موجود افراد کو تکنے لگا جیسے اچانک ہی اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ نفیس احمد نے اضطرابی لہجے میں دریافت کیا۔

"لیکن کیا؟"

وہ ایک انگلی سے اپنی کھوپڑی کو بجاتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ کہ عالیہ رحمٰن واقعی اپنی فلیٹ سے غائب ہے۔"

"غائب ہے..... کہاں؟" نفیس احمد نے استفسار کیا۔

ظہیر خان نے پوچھا۔ "کریم! آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"جناب! میں تو اتنا جانتا ہوں کہ وہ چند دنوں سے اپنے فلیٹ پر موجود نہیں۔ لیکن وہ کہاں گئی ہے، اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"تمہیں یہ بات کس طرح پتہ چلی کہ عالیہ رحمٰن چند دنوں سے اپنے فلیٹ پر موجود نہیں؟" ظہیر خان نے اپنے ملازم سے پوچھا۔

عبدالکریم نے بتایا۔ "جناب! اس بات کا اندازہ میں نے یوں لگایا کہ عالیہ رحمٰن کے لئے کھانا لانے والا باورچی اس کا کھانا آٹھ سو چار میں رکھوا کر چلا جاتا ہے۔ مقبول صاحب کے باورچی سے اس کی سلام دعا ہے۔ اگر عالیہ رحمٰن اپنے گھر پر موجود ہوتی تو وہاں کھانا رکھوانے کی کیا ضرورت تھی!"

آٹھ سو چار نمبر فلیٹ مقتولہ عالیہ رحمٰن کے فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک کے بالکل سامنے واقع تھا۔

نفیس احمد کو جب یہ معلوم ہوا کہ آٹھ سو چار نمبر فلیٹ کے باورچی سے عالیہ رحمٰن کے باورچی کی علیک سلیک تھی تو اس نے عبدالکریم سے پوچھا۔

"آٹھ سو چار میں کام کرنے والے باورچی کا نام کیا ہے؟"

"امتیاز علی۔" عبدالکریم نے جواب دیا۔

"تم تو عالیہ رحمٰن کے بارے میں مزید کچھ نہیں جانتے نا؟" نفیس احمد نے پوچھا۔

عبدالکریم نے نفی میں گردن ہلا دی۔

نفیس احمد کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے، میں امتیاز علی سے بھی مل لیتا ہوں۔" پھر اس نے ظہیر خان کی جانب الوداعی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "اس زحمت کے لئے میں شرمندہ ہوں جناب!"

"کوئی بات نہیں۔" ظہیر خان نے عام سے لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہو گیا۔

نفیس احمد جتنی دیر ظہیر خان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا، ایک عجیب سی بے نام چیز محسوس کرتا رہا تھا۔ اس کی سونگھنے کی حس عام انسان سے کافی تیز تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس گھر کی فضا میں کوئی بیرونی بو بھی شامل ہے۔ وہاں بیٹھنے کے دوران میں اس نے چونکہ اس طرف پوری توجہ نہیں دی تھی اس لئے بھی اس سلسلے میں اس کا ذہن صاف نہیں ہوا تھا۔ اب وہ گہری توجہ سے اس بے نام بو کو سونگھنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ چونک اٹھا۔

''ظہیر صاحب!'' اس نے سنسنی خیز لہجے میں گھر کے مالک کو مخاطب کیا۔ ''آپ کے فلیٹ سے عجیب سی بو کہاں سے آرہی ہیں؟''

''بو...... کیسی بو؟'' ظہیر نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

''آں...... ہاں۔'' نفیس نے گہری گہری سانس لیتے ہوئے اندازہ لگانے والے انداز میں کہا۔ ''ایسی بو...... ایسی بو...... جیسی کسی ڈیڈ باڈی سے اٹھتی ہو۔''

ظہیر سناٹے میں رہ گیا۔ پھر تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے، کسی لاش سے اٹھنے والی بو؟''

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' نفیس نے اثبات میں جواب دیا اور کچن کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بو اس طرف سے آرہی ہے۔'' وہ کچن میں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کا رواں تبصرہ بھی جاری تھا۔ ''کچن کے اندر بھی یہ بو کہیں باہر سے آرہی ہے۔'' پھر اس نے کچن کی سلائڈنگ ونڈو سے سر باہر نکال کر دائیں بائیں سونگھا اور حتمی لہجے میں فیصلہ صادر کر دیا۔ ''جناب! مجھے پورا یقین ہے، یہ بو بائیں جانب والے فلیٹ سے باہر آرہی ہے۔''

ظہیر خان اور عبدالکریم حیران پریشان، نفیس احمد کو دیکھ رہے تھے۔ ظہیر خان کے کچن کی بائیں جانب عالیہ رحمٰن کا کچن تھا۔ اور اس کے کچن کی سلائڈنگ ونڈو تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔ اس بلڈنگ کے تمام فلیٹس کے کچن فلیٹ کی عقبی دیوار سے باہر کھلتے تھے یعنی وہ فلیٹ کے پچھلے حصے میں واقع تھے۔ ظہیر خان کے کچن کی بائیں جانب عالیہ رحمٰن کا کچن تھا۔ دونوں کچنز کی سلائڈنگ ونڈوز کے درمیان صرف چار فٹ کا فاصلہ تھا۔ یعنی وہ دونوں فلیٹس کی درمیانی دیوار دو دو فٹ ہٹ کر شروع ہوتی تھی۔ اس ترتیب کے حساب سے، سامنے کی جانب سے عالیہ رحمٰن کا فلیٹ ظہیر خان کے فلیٹ کی دائیں طرف پڑتا تھا۔ عالیہ کا فلیٹ زینے کے ساتھ ہی تھا۔ بلڈنگ کے فلیٹس میں آمد و شد کے لئے لفٹ کا نظام بھی موجود تھا اور کسی ہنگامی صورت میں زینے بھی استعمال کئے جاتے تھے۔

نفیس احمد کے انکشاف نے ظہیر خان اور اس کے ملازم کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ظہیر نے جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کا مطلب ہے، یہ بو عالیہ رحمٰن کے فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک کے کچن کی کھڑکی سے باہر نکل رہی ہے؟''

اس دوران میں ظہیر خان ناک سکیڑ کر بار بار اس نادیدہ بو کو سونگھ بھی رہا تھا۔ عبدالکریم اور ظہیر

خان اس بو کے وجود پر یقین لے آئے تھے کیونکہ وہ وہاں اپنا وجود رکھتی تھی مگر نہایت ہی مدھم احساس کے ساتھ۔ بات دراصل وہی تھی کہ ظہیر خان وغیرہ وہاں مستقل رہ رہے تھے اس لئے فلیٹ کے مکینوں نے اس مدھم بو کو محسوس نہیں کیا تھا جبکہ نفیس احمد باہر سے آیا تھا، پھر وہ سونگھنے کی غیر معمولی صلاحیت کا بھی حامل تھا۔ جب اس نے ظہیر اور کریم کی توجہ اس جانب مبذول کرائی تو وہ بھی اس بو کو محسوس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

ظہیر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے نفیس نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''میں پورے یقین سے کہتا ہوں، یہ بو میری بیٹی کی ٹیوٹر عالیہ رحمٰن کے کچن سے سفر کر کے اس کچن کے راستے آپ کے فلیٹ کی فضا میں نفوذ کر رہی ہے۔''

ظہیر خان ہراساں لہجے میں بولا۔ ''اگر آپ کا یہ اندازہ درست ہے کہ یہ بو کسی لاش سے اٹھ رہی ہے تو پھر ذہن میں پہلا یہی سوال پیدا ہوتا ہے...... عالیہ رحمٰن کے کچن یا گھر میں کس کی لاش پڑی ہے؟''

''میرے ذہن میں یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔'' نفیس احمد پُر وثوق انداز میں بولا۔ ''مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے، وہ لاش عالیہ رحمٰن ہی کی ہو گی۔''

ظہیر خان نے گھور کر نفیس احمد کو دیکھا اور کہا۔ ''آپ نے تو بتایا تھا، آپ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتے ہیں؟''

''ہاں۔'' نفیس احمد نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

''مگر مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے، آپ کا تعلق پولیس سے ہے۔''

نفیس احمد زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میری غیر معمولی سونگھنے کی صلاحیت تو خدا کی دین ہے۔''

''اس صلاحیت کے علاوہ آپ کا انداز بھی خاصا سراغ رسانوں جیسا ہے۔'' ظہیر خان نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو آپ اس وقت کسی جاسوس سے کم نہیں دکھائی دے رہے۔''

''شکریہ......'' نفیس احمد نے دوستانہ انداز میں کہا پھر بولا۔ ''ظہیر صاحب! میں چاہوں گا کہ آپ اپنے ملازم کو بھیج کر آٹھ سو چار نمبر فلیٹ کے ملازم امتیاز علی کو یہاں بلا لیں۔ ممکن ہے، وہ عالیہ رحمٰن کے بارے میں کچھ مزید معلومات فراہم کر سکے۔''

ظہیر خان نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' کسی لاش وغیرہ سے اٹھنے والی بو کو محسوس کر کے وہ خاصا چاق و چوبند ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی جو طبیعت خراب تھی، وہ موجودہ صورتحال میں ''ٹھیک'' ہو چکی تھی۔ اس نے عبدالکریم کی طرف دیکھتے ہوئے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''جاؤ، تم تھوڑی دیر کے لئے امتیاز علی کو بلا لاؤ۔''

دس منٹ بعد امتیاز علی، ظہیر خان کے ڈرائنگ روم میں موجود تھا۔ اس دوران میں ظہیر اور نفیس

کے درمیان عالیہ رحمٰن ہی موضوع گفتگو بنی رہی تھی۔

لاش اور بو کا تذکرہ کئے بغیر ظہیر خان نے امتیاز علی سے پوچھا۔ ''کیا تم کسی شمشاد علی کو جانتے ہو جو تمہاری طرح باورچی کا کام کرتا ہے؟''

اس نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''جی، شمشاد، عالیہ رحمٰن کے لئے کھانا پکا کر لاتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ کسی بہت بڑے ہوٹل میں بھی کام کرتا ہے۔''

''مجھے پتہ چلا ہے کہ شمشاد کچھ دنوں سے تمہارے پاس کھانا رکھوا رہا ہے؟'' ظہیر نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

وہ معتدل لہجے میں بولا۔ ''جناب! اس نے صرف دو روز میرے پاس کھانا رکھوایا تھا۔ جمعہ اور پیر کے دن۔''

''تمہارے پاس کھانا رکھوانے کی وجہ کیا تھی؟''

''شمشاد نے بتایا تھا کہ اس کی مالکن یعنی عالیہ رحمٰن اپنے فلیٹ میں موجود نہیں۔'' امتیاز علی نے جواب دیا۔ ''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں وہ کھانا فریج میں رکھ لوں اور جب عالیہ رحمٰن واپس آئے تو میں اسے وہ کھانا دے دوں۔''

''کیا تم نے وہ کھانا عالیہ رحمٰن کو دے دیا تھا؟'' اس مرتبہ نفیس احمد نے پوچھا۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! میں نے جب بھی کھانا دینے کے لئے آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ کی گھنٹی بجائی، مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔''

''پھر تم نے کیا، کیا؟'' نفیس نے پوچھا۔

امتیاز علی نے بتایا۔ ''شمشاد علی پہلی مرتبہ جمعہ کی شام پانچ بجے کھانا میرے پاس رکھوا کر گیا تھا۔ ہفتہ اور اتوار کے دن وہ نہیں آیا۔ جب پیر کے روز وہ دوبارہ آیا تو میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ بھی پریشان ہو گیا تاہم اس روز بھی وہ کھانا اپنے ساتھ لایا تھا۔ وہ کھانا بھی اس نے میرے پاس رکھوا دیا اور کہا کہ ایک مرتبہ پھر کوشش کروں۔ اس روز بھی آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ کا دروازہ لاک تھا۔ یہ بات شمشاد کو بار بار گھنٹی بجانے کے بعد معلوم ہو چکی تھی۔ بہر حال، اس نے پیر کے روز بھی اس سے کھانا لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔ وہ خاصا الجھا ہوا تھا۔ پریشان پریشان واپس چلا گیا۔''

نفیس احمد نے کہا۔ ''پیر تو کل تھا۔ کیا شمشاد آج بھی یہاں آیا تھا؟''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! آج تو اس کے آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''کیوں بھئی، آج ایسی کیا بات ہے؟'' ظہیر خان نے استفسار کیا۔

امتیاز علی نے بتایا۔ ''شمشاد علی ہفتے میں صرف تین دن کھانا لے کر آتا ہے۔ یعنی پیر، بدھ اور

جمعہ کے روز۔ آج تو منگل کا دن ہے۔''

''تمہارے خیال میں عالیہ رحمٰن کہاں گئی ہوگی؟'' نفیس احمد نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم جناب!'' وہ سادگی سے بولا۔

''کیا تم نے اپنے مالک مقبول حسین سے اس سلسلے میں کوئی بات کی تھی؟''

''نہیں جناب، انہیں میں نے کچھ نہیں بتایا۔'' امتیاز نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' ظہیر خان نے امتیاز علی سے کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جاتے ہوئے اس نے پوچھ لیا۔ ''صاحب! سب خیریت تو ہے نا۔ آپ عالیہ رحمٰن کے بارے میں اتنے سوالات کیوں کر رہے ہیں؟''

''کوئی خاص بات نہیں۔'' ظہیر خان نے رکھائی سے کہا۔

امتیاز نے پوچھا۔ ''شمشاد کو تو کچھ نہیں ہو گیا؟''

''آج منگل ہے اور کل بدھ۔'' ظہیر خان نے بیزاری سے کہا۔ ''کل وہ تمہارے پاس آئے گا تو اسی سے پوچھ لینا کہ اسے کیا ہوا ہے اور عالیہ رحمٰن کہاں گئی ہیں...... اور تم اب یہاں سے جا سکتے ہو۔''

امتیاز ظاہر ہے ظہیر خان سے کوئی بحث و تکرار تو کر نہیں سکتا تھا لہٰذا وہ آنکھوں میں الجھن بھر کر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

''آپ کا اب کیا پروگرام ہے؟'' ظہیر خان نے نفیس احمد کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ادھر کی خبر لینا چاہئے۔''

''یعنی فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک؟''

''بالکل۔ میرا اشارہ اسی جانب ہے۔''

''مگر وہ فلیٹ تو بند ہے۔'' ظہیر خان نے کہا۔ ''اس کے اندر کا احوال کس طرح معلوم کیا جا سکتا ہے؟''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں یہ کام کر سکتا ہوں۔'' عبدالکریم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''کیا تم نے اس فلیٹ کی کوئی ڈپلی کیٹ چابی بنوا رکھی ہے؟'' ظہیر خان نے تیوری چڑھا کر تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

عبدالکریم نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں جناب!'' پھر وہ نفی میں گردن جھٹکنے لگا۔

نفیس احمد نے پوچھا۔ ''کریم! تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟''

وہ باری باری ظہیر خان اور نفیس احمد کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ''جناب! ہمارے کچن کی کھڑکی آٹھ سو ایک نمبر کے کچن کی کھڑکی کے بہت نزدیک ہے اور وہ تھوڑی سی کھلی ہوئی بھی ہے۔ اگر میں اپنی کھڑکی سے نکل کر اس کھڑکی کے راستے آٹھ سو ایک میں داخل ہو جاؤں تو وہاں کی

صورت حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ کی سلائیڈنگ ونڈو کو دھکیل کر آسانی سے کھولا جاسکتا ہے۔''

عبدالکریم کی تجویز انتہائی معقول اور خطرناک تھی۔ معقول ان معنوں میں کہ دونوں فلیٹس کی درمیانی دیوار سے کچنز کی کھڑکیاں صرف دو دو فٹ کے فاصلے پر تھیں۔ آٹھ سو دو نمبر فلیٹ (ظہیر خان والا فلیٹ) کے کچن کی کھڑکی میں پاؤں رکھ کر باآسانی آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ (عالیہ رحمٰن والا فلیٹ) کے کچن کی کھڑکی تک پہنچا جاسکتا تھا۔ اتفاق سے آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ کے کچن کی کھڑکی اسی جانب سے تھوڑی کھلی ہوئی تھی جس طرف آٹھ سو دو نمبر فلیٹ کے کچن کی کھڑکی واقع تھی۔

دوسری جانب یہ تجویز اس اعتبار سے انتہائی خطرناک تھی کہ وہ دونوں فلیٹس بلڈنگ کے آٹھویں فلور پر واقع تھے۔ یعنی سطح زمین سے کم از کم سو فٹ کی بلندی پر۔ اس صورت میں ذرا سی بھی بے احتیاطی عبدالکریم کے لئے جان لیوا ثابت ہوسکتی تھی۔ انہی حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ظہیر خان نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔

''کریم! تم اپنے ہوش وحواس میں تو ہو؟''

''جی صاحب! میں بالکل سنجیدہ ہوں۔'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔

ظہیر خان نے کہا۔ ''اگر تمہارا ہاتھ یا پاؤں ذرا سا بھی غلط پڑ گیا تو جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے!''

''مجھے اس پہلو کا اندازہ ہے جناب!'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مگر آپ فکر نہ کریں۔ میں بہت ہی زیادہ احتیاط سے کام لوں گا۔ اپنی کھڑکی کو ایک ہاتھ سے نہایت ہی مضبوطی سے تھام کر دوسری کھڑکی میں قدم رکھوں گا......اور مجھے یقین ہے، انشاء اللہ میں کامیاب رہوں گا۔''

عبدالکریم کے جذبے اور ولولے کو دیکھتے ہوئے اسے اس خطرناک مہم کی اجازت دے دی گئی۔ عبدالکریم نے انتہائی پُراعتماد اور مشاق مہم جو کی طرح دوسرے فلیٹ میں اتر کر وہاں کی صورت حال واضح کردی۔

یہ صورت حال انتہائی سنسنی خیز اور انکشاف انگیز تھی۔

عبدالکریم نے واپس آٹھ سو دو نمبر فلیٹ میں آکر جو کہانی سنائی اس کے مطابق عالیہ رحمٰن اپنے فلیٹ کے اندر ایک کرسی پر بندھی پڑی تھی۔ اس کے منہ میں سختی سے کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ نائیلون کی مضبوط رسی سے اس کے ہاتھ اور پاؤں کرسی کے پشتے کے ساتھ جکڑے ہوئے تھے۔ وہ ایک سو ایک فیصد مرچکی تھی۔

کرسی پر بندھی ہوئی عالیہ رحمٰن کی لاش بری طرح اکڑ چکی تھی اور وہ ناگوار سی بو اسی لاش سے اٹھ رہی تھی۔ مذکورہ کرسی کچن سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی اسی لئے لاش سے اٹھنے والی بو باآسانی سفر کر کے فلیٹ نمبر آٹھ سو دو کے کچن کے راستے گھر کے اندر پہنچ گئی تھی جسے نفیس احمد نے اپنی غیر معمولی سونگھنے کی صلاحیت سے محسوس کرلیا تھا......اور بعد میں اس نے ظہیر خان اور عبدالکریم کو بھی

اس مخصوص بو کا احساس دلا دیا تھا۔

پوری بات سننے کے بعد نفیس احمد نے کہا۔ ''ظہیر صاحب! ہمیں فوراً آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہونا چاہئے۔''

''میں ایسی حماقت ہرگز نہیں کرسکتا۔'' ظہیر خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''اس میں حماقت کی کون سی بات ہے؟''

عبدالکریم، عالیہ رحمٰن کی عبرت ناک موت کے علاوہ یہ بھی بتا چکا تھا کہ آٹھ سو ایک نمبر فلیٹ کے اندر بڑی افراتفری نظر آئی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ٹھیک ٹھاک تلاشی لی گئی ہو۔

انہی معلومات کے پیش نظر ظہیر خان نے نفیس احمد کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''کریم کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہاں قتل کے ساتھ ساتھ ڈکیتی کی واردات کے آثار بھی موجود ہیں۔ اس صورت حال میں ہمیں فوراً پولیس کو اطلاع دینا چاہئے۔ وہ جیسے چاہیں، فلیٹ کے اندر داخل ہوں۔ ہمیں خواہ مخواہ قانون کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے۔''

یہ بات نفیس احمد کی سمجھ میں آگئی۔ چنانچہ پہلی فرصت میں متعلقہ تھانے فون کھڑکایا گیا۔ پھر آدھے گھنٹے کے اندر اندر پولیس وہاں موجود تھی۔

پولیس والوں کو جب عبدالکریم کی ''کارکردگی'' سے آگاہ کیا گیا تو انہوں نے خاصے طنزیہ انداز میں اس ''کارنامے'' کو سراہا۔

فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک میں داخل ہونے کے لئے پولیس والوں نے داخلی دروازے کا لاک توڑ دیا۔ دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوگئے۔ ظہیر خان اور نفیس احمد بھی پولیس والوں کے ساتھ ہی تھے۔ عبدالکریم اور کنول کو البتہ پولیس نے اندر جانے سے روک دیا تھا۔ اس موقع پر نفیس احمد نے اپنی بیٹی کو گھر جانے کی ہدایت کی اور کنول وہاں سے روانہ ہوگئی تھی۔ نفیس نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ فی الحال وہ یہاں کی صورتحال کو اپنے تئیں رکھے۔

فلیٹ کے اندر اچھا خاصا اندھیرا تھا۔ اندرونی لائٹس آن کی گئیں تو نظروں کے سامنے ابتری کا ایک ''شاہکار'' منظر گھوم گیا۔ تمام کمروں کے دروازے کھلے ہوئے تھے اور کمروں میں موجود تمام اشیاء کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا تھا۔ پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہاں ڈکیتی کی ایک بھرپور واردات کی گئی تھی۔

کچن کے نزدیک ہی ایک کرسی پر عالیہ رحمٰن نائیلون کی رسیوں سے بندھی پڑی تھی کچھ دن پہلے یہ واقعی عالیہ رحمٰن ہوگی مگر اس وقت تو وہ محض ایک اکڑی ہوئی انسانی لاش تھی جس سے ناگوار سی تعفن آمیز بو اٹھ رہی تھی۔ غنیمت تھا، وہ سردیوں کے دن تھے ورنہ اگر جون جولائی یا ستمبر کا مہینہ ہوتا تو بدبو کے بھبکوں سے پورا فلیٹ بس جاتا۔

عالیہ رحمٰن کی لاش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اسے زبردستی کرسی پر باندھا گیا تھا۔ کرسی کے

ہتھوں پر اس کے دونوں بازو اور پایوں کے ساتھ اس کی ٹانگیں نہایت مضبوطی سے جکڑی گئی تھیں۔ کمر میں بھی رسی ڈال کر اسے کرسی کی پشت گاہ سے فکس کر دیا گیا تھا۔ یہ تمام ایسی مضبوط جکڑ بندیاں تھیں کہ عالیہ رحمٰن اپنی جگہ سے ہل نہیں سکتی تھی۔ علاوہ ازیں اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اس کی آواز کو بھی ناپید کر دیا گیا تھا۔

پولیس والوں نے اپنی ماہرانہ نظروں سے فوراً اندازہ لگا لیا کہ عالیہ رحمٰن کو اس دنیا سے کوچ کئے کافی وقت گزر چکا تھا اور یہ کہ اسے گلا گھونٹ کر موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ فلیٹ کے اندر جو ابتری پھیلی ہوئی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں آنے والوں نے ہر شے کو ادھیڑ کر رکھ دیا تھا۔

پولیس والے لگ بھگ ایک گھنٹے تک وہاں مصروف رہے، پھر عالیہ رحمٰن کی لاش کو لے کر چلے گئے۔ جاتے ہوئے وہ فلیٹ کے داخلی دروازے پر اپنا سرکاری تالا بھی ڈال گئے تھے۔

اس اندوہناک واقعے نے اس اپارٹمنٹ بلڈنگ خصوصاً آٹھویں فلور کے مکینوں میں کھلبلی مچا دی تھی۔ وہ جو آس پڑوس والوں کے معاملات سے قطعی غیر متعلق رہنے کے عادی تھے، آن واحد میں ''متعلق'' ہو گئے تھے کیونکہ پولیس والے ایک ایک سے مختلف قسم کے سوالات کر رہے تھے اور ڈکیتی و قتل کی اس واردات کے ذمے دار شخص یا ذمے دار افراد تک پہنچنے کے لئے بے چین نظر آتے تھے۔

خیریت گزری کہ پولیس والوں کے ہتھے ایک ایسی چیز آ گئی جس کی وجہ سے پڑوسیوں کی طرف سے ان کا دھیان ہٹ گیا۔ جہاں پر عالیہ رحمٰن مردہ حالت میں ایک کرسی پر بندھی پائی گئی تھی، وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر پولیس آفیسر کو ایک کارڈ پڑا ہوا مل گیا تھا۔

وہ ملزم شمشاد علی کا ہوٹل کارڈ تھا جو جائے وقوعہ پر پڑا پایا گیا تھا۔ پولیس والوں کو ایک کلیو مل جائے تو پھر اس کی تحقیق و تفتیش کی گاڑی چل نکلتی ہے۔ شمشاد علی کے اس کارڈ میں ایک مقامی فور اسٹار ہوٹل کا نام و پتہ درج تھا۔ عالیہ رحمٰن کی لاش کو ہسپتال بھجوانے کے بعد پولیس والے مذکورہ ہوٹل پہنچ گئے۔

اس وقت شمشاد علی ہوٹل سے چھٹی کر کے جا چکا تھا۔ وہ کینٹ ریلوے اسٹیشن کے نزدیک کرائے کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ ہوٹل سے پولیس والوں کو اس کے گھر کا پتہ مل گیا اور وہ سیدھے شمشاد کے کوارٹر پر پہنچ گئے۔ جب شمشاد کو گرفتار کر لیا گیا، گھڑیاں مقامی وقت کے مطابق رات کے دس بجا رہی تھیں۔

یہ تھے وہ واقعات جن کی بھینٹ چڑھ کر شمشاد علی پہلے اپنے کوارٹر سے تھانے پہنچا، پھر براستہ عدالت وہ جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا پہنچا۔ اس کے مقدمے کو عدالت میں لگے ہوئے لگ بھگ دو ماہ ہونے کو آئے تھے مگر ابھی تک کوئی قابل ذکر کارروائی عمل میں نہیں آئی تھی۔ اب یہ کیس میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ اس سے پہلے جو وکیل صاحب اسے ''ڈیل'' کر رہے تھے، جمیل فریدی نے ان کی چھٹی کر دی تھی۔ فور اسٹار ہوٹل کا مالک جمیل فریدی حقیقی معنوں میں

ایک ہمدرد دل اور انسان دوست شخص تھا۔ وہ خلوص نیت سے شمشاد علی کی مدد کرنے کا خواہاں تھا۔

میں نے اپنے موکل اور اس مقدمے کے ملزم شمشاد علی سے جو ''ملاقات'' کی تھی اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ وقوعہ سے چند روز قبل بس میں آتے جاتے اس کی جیب کٹ گئی تھی جس میں اس ہوٹل کارڈ کے علاوہ اس کے چار سو روپے بھی نکل گئے تھے۔ وہ اس بارے میں بالکل کچھ نہیں جانتا تھا کہ جائے واردات پر اس کا کارڈ کس نے اور کس طرح پہنچایا تھا۔ شمشاد علی نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ تیرہ جنوری بروز منگل بھی وہ مقتولہ عالیہ رحمٰن کے فلیٹ پر گیا تھا اور دروازہ لاک پا کر لوٹ آیا تھا تاہم اس روز اس نے مقبول حسین کے باورچی امتیاز علی سے ملاقات نہیں کی تھی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتولہ عالیہ رحمٰن کی موت آٹھ جنوری بروز جمعرات رات دس اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ موت کا سبب دم گھٹنے کو بتایا گیا تھا۔ لاش کے تجزیئے سے یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ مقتولہ کو گلا گھونٹ کر موت کے حوالے کیا گیا تھا تاہم اس کا گلا گھونٹنے کے لئے ہاتھوں کی بجائے کسی کپڑے وغیرہ کا استعمال کیا گیا تھا۔ زیادہ امکان کسی دوپٹہ نما کپڑے کا تھا۔ البتہ کرسی پر بندھی، اکڑی ہوئی لاش کے نزدیک اس نوعیت کا کوئی کپڑا نہیں پایا گیا تھا۔

اس واقعے کا ایک افسوس ناک پہلو یہ بھی تھا کہ پوسٹ مارٹم کے بعد جب پولیس والوں نے عالیہ رحمٰن کی لاش کو اس کے ورثا کے حوالے کرنا چاہا تو اس سلسلے میں انہوں نے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی۔ عالیہ کے والد پانچ سال پہلے دارِ فانی سے اٹھ چکے تھے۔ ایک سوتیلا بھائی امریکہ میں ملازم تھا، دوسرا سوتیلا بھائی آوارہ اور بدچلن نکل آیا تھا۔ سوتیلی بہن تو خیر ابھی ان ذمے داریوں کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ سوتیلی والدہ نے بھی اس سلسلے میں کسی پیش رفت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد پولیس والوں نے عالیہ کی سگی والدہ صادقہ بیگم سے بھی رابطہ کیا۔ صادقہ بیگم اس وقت پچپن سال کی عمر کو پہنچ چکی تھی اور دوسرے شوہر سے بھی طلاق حاصل کرنے کے بعد کسمپرسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ جمشید غوری سے اس کی تین اولادیں ہوئی تھیں۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ یہ تینوں اپنے باپ کے پاس رہتے تھے۔ تاہم وہ ماں سے بھی ملنے آتے رہتے تھے۔ ان دنوں صادقہ فالج زدہ ہو کر بستر سے جا لگی تھی۔ اگر اس وقت وہ اپنے ہاتھ پاؤں کی ہوتی تو ممکن تھا، وہ بیٹی کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں کوئی سرگرمی دکھاتی۔ فالج کے حملے کے بعد وہ ایک عضو معطل کی شکل اختیار کر چکی تھی۔

چنانچہ پولیس والوں نے عالیہ رحمٰن کی لاش کو ایک خیراتی ادارے کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس موقع پر عالیہ رحمٰن کا پڑوسی ظہیر خان خاصا جذباتی ہو گیا۔ اس نے تفتیشی آفیسر سے کہا۔

''ٹھیک ہے، مقتولہ کا کوئی وارث اس وقت اس کی تجہیز و تکفین میں دلچسپی نہیں لے رہا تو اسے کسی لاوارث کی طرح خیراتی ادارے کے حوالے کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔''

"پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟" پولیس آفیسر نے پوچھا۔
ظہیر خان نے کہا۔ "اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں یہ ذمے داری لینے کو تیار ہوں۔"
پولیس والوں کو بھلا اس سلسلے میں کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ پڑوسی ہونے کے ناتے ظہیر خان کا مقتول پر اتنا حق تو بنتا ہی تھا۔ چنانچہ عالیہ رحمٰن کے جنازے اور کفن دفن کا بندوبست ظہیر خان کے توسط سے ہوا تھا۔

پولیس والے میرے موکل کو عالیہ رحمٰن کا قاتل اور اس ڈکیتی کا ذمے دار سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کے خلاف استغاثہ تیار کیا گیا تھا۔ میں تمام حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کے بعد جس نتیجے پر پہنچا تھا، اس کے مطابق شمشاد علی بے قصور تھا۔ اس نے عالیہ رحمٰن کو قتل کیا تھا اور نہ ہی ڈکیتی کی کسی واردات میں ملوث تھا۔ اس کی بدقسمتی اور مجرم یا مجرموں کی عیاری نے اسے اس کیس میں پھنسا دیا تھا۔ وہ کسی سوچی سمجھی سازش کا شکار ہو گیا تھا۔

میں کیس فائل، پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور اپنے موکل شمشاد علی کے بیان سے خاصا مطمئن ہو گیا تھا اور اسی اطمینان کے سہارے میں نے اپنے موکل شمشاد علی کو بے گناہ ثابت کر کے باعزت بری کروانا تھا۔

اس کے علاوہ بھی شمشاد علی کی زبانی مجھے چند اہم باتیں معلوم ہوئیں جن کا ذکر سردست مناسب نہیں۔ آپ عدالتی کارروائی کے دوران گاہے بگاہے خود ہی ہر بات سے آگاہ ہو جائیں گے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر میں شمشاد علی کے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں موجود تھا۔ اس سے پہلے ایک پیشی پر ملزم کو فردِ جرم پڑھ کر سنائی جا چکی تھی اور اس نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا تھا تاہم اس کے بعد کوئی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ گزشتہ تین پیشیوں سے کارروائی ہو ہی نہیں سکی تھی۔ ایک مرتبہ جج غیر حاضر تھا، دوسری مرتبہ وکیل صفائی اور تیسری مرتبہ پیش کار کی ناسازیٔ طبع کی عرضی آ گئی تھی۔

میں نے سب سے پہلے اپنے موکل کی درخواست ضمانت دائر کی اور ضمانت کے حق میں بولنا شروع کیا۔ "جناب عالی! میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے کسی سازش کے تحت اس کیس میں ملوث کرنے کی کوشش کی گئی ہے لہٰذا معزز عدالت سے میں استدعا کرتا ہوں کہ اس کی درخواست ضمانت منظور کر کے اسے رہا کیا جائے۔"

جج نے اپنی میز پر رکھے ضمانت کے کاغذات کا باریک بینی سے جائزہ لیا اور مجھے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ "آپ نے اپنے موکل کے لئے شخصی ضمانت کا بندوبست کیا ہے؟"
میں آپ کو یہ بتانا بھول گیا کہ شمشاد علی کے لئے نور اسٹار ہوٹل کے مالک جمیل فریدی نے اپنی ضمانت دی تھی جو ظاہر ہے، شخصی ضمانت تھی۔

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! میرے موکل کی ضمانت دینے والا شخص اس شہر کے ایک معروف نور اسٹار ہوٹل کا مالک ہے۔ اس کی ضمانت پر کسی شک و شبہے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ جمیل فریدی صاحب ایک معزز اور صاحب ثروت انسان ہیں۔"

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے درخواست ضمانت کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ "یور آنر! جمیل فریدی صاحب یقیناً صاحب حیثیت اور معزز شہری ہوں گے مگر ملزم قتل اور ڈکیتی جیسے سنگین جرائم کا مرتکب ہوا ہے لہٰذا ملزم کی درخواست ضمانت منظور کرنا انصاف کے اصول کے منافی ہو گا۔"

میں نے کہا۔ "کسی بے گناہ شخص کو جیل میں ڈال دینا بھی انصاف کے اصولوں کی نفی کرتا ہے۔ میرا موکل قتل اور ڈکیتی کی واردات میں کسی بھی طور ملوث نہیں۔"

وکیل استغاثہ نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وکیل صفائی اپنے موکل کو بے گناہ گردانتے ہیں۔ کیا ان کے پاس ملزم کی بے گناہی کا کوئی بیّن ثبوت بھی ہے؟"

اپنی بات مکمل کر کے وکیل استغاثہ نے طنزیہ نظر سے مجھے دیکھا جج مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ "بیگ صاحب! آپ اس سلسلے میں کیا کہتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جناب عالی! میں اس کیس میں وکیل صفائی کی حیثیت سے شامل ہوں جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ میں نے اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنا ہے۔ اس تناظر میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ میں اپنے موکل کو باعزت بری کروانے کے لئے اپنے ترکش میں کچھ تیر ضرور رکھتا ہوں گا۔"

جج نے میری وضاحت پر وکیل استغاثہ کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ "یور آنر! وکیل صفائی اپنی لچھے دار باتوں کے حوالے سے بہت مشہور ہیں۔ اس وقت بھی وہ یہی حربہ آزما رہے ہیں۔ اگر ان کے پاس اپنے موکل کی بے گناہی میں کچھ کہنے کے لئے ہے تو وہ بات کو گھمانے پھرانے کی بجائے وہ ثبوت عدالت کے سامنے لائیں۔"

اس مرتبہ جج نے مجھے سوالیہ نظر سے دیکھا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! ہر کام کے لئے ایک خاص وقت اور مقررہ مقام ہوتا ہے۔ یقیناً میرے پاس اپنے موکل کی صفائی میں کہنے کے لئے بہت کچھ ہے۔ لیکن ابھی تو اس مقدمے کی کارروائی شروع ہوئی ہے۔ انشاء اللہ جرح کے دوران میں اور دلائل کے موقع پر میں نہایت ہی اہم انکشافات کروں گا۔ وکیل استغاثہ خاطر جمع رکھیں۔ ان کی "تشفی" کے لئے میرے پاس بہت کچھ ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے اضافہ کیا۔

"جناب عالی! میرا موکل ایک بے گناہ اور ستم رسیدہ شخص ہے۔ اس پر پڑنے والی بپتا کا سن کر اس کی بیوی اور بچی بھی راولپنڈی کے ایک نواحی گاؤں سے یہاں پہنچ چکی ہیں۔ دونوں بہت پریشان ہیں۔ اس وقت وہ ماں بیٹی عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔" میں نے اپنے موکل کی

بیوی بشریٰ اور بیٹی کلثوم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔ ''جمیل فریدی صاحب نے ان کی دیکھ بھال کا مناسب بندوبست کر دیا ہے۔ مگر کسی بیوی کے لئے اس کا شوہر اور بچی کے لئے اس کا باپ بہت اہم ہوتا ہے۔ انسانیت اور انصاف کا تقاضا تو یہی ہے کہ میرے موکل کی درخواست ضمانت منظور کرتے ہوئے اسے رہا کیا جائے۔ ضمانت پر رہائی اس کی بیوی بچی کے لئے ایک بہت بڑا تحفہ ثابت ہوگا۔ یہ مقدمہ عدالت میں لگا ہوا ہے۔ اس کا جو بھی فیصلہ ہوگا اس کے مطابق ازاں بعد ملزم سے سلوک کیا جا سکتا ہے۔ جب اس شہر کا ایک معزز شہری میرے موکل کی ضمانت دے رہا ہے تو میرے خیال میں اس کی درخواست ضمانت منظور ہو جانا چاہئے۔''

جج نے میری بات مکمل ہونے پر وکیل استغاثہ کی طرف دیکھا۔ وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''یور آنر! یہ قتل اور ڈکیتی کی سنگین واردات کا مقدمہ ہے اور جائے وقوعہ پر ملزم کا ''ہوٹل کارڈ'' بھی پڑا پایا گیا ہے۔ ازیں علاوہ بھی ایسے بہت سے شواہد ہیں جو ملزم کو مجرم ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں لہٰذا میں معزز عدالت سے استدعا کروں گا کہ ملزم کی درخواست ضمانت رد کرتے ہوئے آئندہ پیشی کی تاریخ دے دی جائے تاکہ گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔''

اس کے بعد میں نے اپنے موکل کی ضمانت کے لئے تھوڑا زور مارا مگر بات نہ بن سکی اور جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

میں اس کارروائی سے قطعاً مایوس نہیں تھا۔ قتل کے ملزم کی ضمانت بہت مشکل ہوتی ہے اور سو میں سے پچانوے مقدمات میں تو ضمانت ہوتی ہی نہیں۔ جن مقدمات میں کسی صورت ضمانت منظور ہو جاتی ہے، وہ بھی سال دو سال کے بعد جبکہ کیس کوئی واضح اور موافق صورت حال اختیار کر چکا ہوتا ہے۔

ہم عدالت سے باہر آئے تو جمیل فریدی نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آج کی کارروائی میری توقع کے خلاف نہیں مگر شمشاد علی کی بیوی خاصی مایوس نظر آ رہی ہے۔''

کلثوم اور بشریٰ بھی اس وقت جمیل فریدی کے ساتھ ہی کھڑی تھیں۔ ان دنوں وہ دونوں شمشاد علی کے کوارٹر، واقع نزد کینٹ ریلوے اسٹیشن میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ جمیل فریدی نے ان کے رہن سہن اور حفاظت کا معقول بندوبست کر رکھا تھا۔ جمیل فریدی اپنے ایک ادنیٰ ملزم کی بھرپور مدد کر رہا تھا جو اس کے اعلیٰ ظرف ہونے کی دلیل تھی۔

میں نے دکھی صورت بشریٰ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو شاید عدالت اور مقدمے وغیرہ کا پہلے کوئی تجربہ نہیں ہے اسی لئے پریشان ہو رہی ہیں؟''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ''آج میں پہلی مرتبہ عدالت میں آئی ہوں۔ زندگی میں اس سے پیشتر کبھی کسی مقدمہ سے واسطہ نہیں پڑا۔''

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ فکرمند نہ ہوں۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جمیل صاحب آپ کی بہت مدد کر رہے ہیں۔''

بشریٰ نے تشکر بھری نظر سے جمیل فریدی کو دیکھا اور ممنونیت آمیز لہجے میں بولی۔ ''ان کے احسانات کو تو میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔''

آٹھ سالہ کلثوم نے میری طرف دیکھتے ہوئے معصوم سوال کیا۔ ''کیا میرے ابو گھر آ جائیں گے؟''

اس سادہ سے سوال میں دنیا جہاں کا کرب سمایا ہوا تھا جسے کوئی اہل دل اور صاحب اولاد ہی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کلثوم کو دیکھا پھر اس کا کومل گال تھپتھپاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

''ہاں بیٹا! تمہارے ابو بہت جلد تم لوگوں کے پاس آ جائیں گے۔ تم تو بہت بہادر بچی ہو نا۔ پورے حوصلے سے ابو کی واپسی کا انتظار کرو۔ اپنی امی کو بھی حوصلہ دو۔ ہم ہیں نا! میں پوری کوشش کر رہا ہوں۔ تمہارے ابو اس مصیبت سے انشاء اللہ نکل آئیں گے۔''

اس کے بعد میں تھوڑی دیر تک اپنے موکل کی بیوی بشریٰ سے تسلی تشفی کی باتیں کرتا رہا۔ پھر ایک دوسری عدالت کی جانب بڑھ گیا۔

میں نے مقدمے کی فائل کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کیا تھا۔ استغاثہ کی جانب سے نصف درجن سے زیادہ گواہوں کے ناموں پر مشتمل فہرست دائر کی گئی تھی جن میں بعض افراد پر جرح غیر دلچسپ اور بے معنی رہی تھی۔ لہٰذا عدالتی کارروائی کا احوال بیان کرنے کے دوران میں، میں ان گواہوں پر اپنی جرح کی تفصیل کا ذکر گول کر جاؤں گا اور صرف نہایت ہی اہم کارروائی کو آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔ یہ سسپنس کے قیمتی صفحات کا تقاضا بھی ہے اور قارئین کے ذوق کی ضرورت بھی۔

میں نے اپنے موکل کے خیر خواہ جمیل فریدی کی مدد سے اپنے طور پر بھی کچھ فیلڈ ورک مکمل کیا تھا، نتیجے کے طور پر نہایت ہی اہم معلومات مجھے حاصل ہوئی تھیں جو عدالتی کارروائی کے دوران میں بہت مفید ثابت ہو سکتی تھیں۔

٭☆٭

منظر اسی عدالت کا تھا اور گواہوں کے کٹہرے میں مقتولہ کی گھریلو ملازمہ عزیزہ ماسی کھڑی تھی۔ عزیزہ کی عمر پینتالیس سال کے قریب تھی تاہم اس نے خود کو خاصا سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ وہ اپنی وضع قطع اور لباس سے ماسی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے اپنا بیان ریکارڈ کروایا، پھر وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے قریب پہنچ گیا۔

''عزیزہ بی بی!'' وکیل استغاثہ گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ''تم کتنے عرصے سے مقتولہ

کے پاس ملازمت کر رہی تھیں؟''

''جب سے انہوں نے اس فلیٹ میں رہائش اختیار کی تھی۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے تم مقتولہ کو شروع سے جانتی ہو؟''

''جی ہاں۔''

''وہ کیسی عورت تھی؟''

''میں سمجھی نہیں!'' عزیزہ نے الجھے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

وکیل استغاثہ نے وضاحت کی۔ ''میرا مطلب ہے تمہارے ساتھ اس کا رویہ کیسا تھا؟''

''بہت اچھا۔'' گواہ نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ ''وہ بہت ہمدرد اور نیک دل عورت تھی۔'' پھر اس نے دوسرے کٹہرے میں کھڑے ملزم شمشاد علی کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

''میں تو کہتی ہوں عالیہ صاحبہ کے قاتل کو جلد از جلد موت کی سزا سنا دی جائے۔''

شمشاد علی کے چہرے پر ایک رنگ سا آ کر گزر گیا۔ عدالتی کارروائی کے دوران میں سب سے قابل رحم کردار ملزم کا ہوتا ہے۔ اسے اپنے خلاف ہر قسم کی کڑوی کسیلی اور دشمنانہ باتیں سننا اور برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ وہ اپنے خلاف دیئے گئے کسی ریمارکس یا کمنٹس پر کچھ بولنے کا مجاز نہیں ہوتا۔ اسے سب کچھ خاموشی سے سہنا ہوتا ہے۔

وکیل استغاثہ نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے سوال کیا۔ ''عزیزہ بی بی! تمہاری مالکن یعنی عالیہ رحمٰن اپنے فلیٹ میں بالکل اکیلی رہتی تھی۔ کیا تم بتا سکتی ہو کہ فلیٹ پر اس سے ملنے کون کون آتا تھا؟''

''یہ بتانا تو بہت ہی آسان ہے۔'' عزیزہ بی بی نے جواب دیا۔ ''میرے علاوہ فلیٹ پر سلیم قدوسی، شمشاد اور ایک لڑکی باقاعدگی سے آتی تھی۔'' پھر اس نے لڑکی کا نام بتایا۔

''ملزم شمشاد کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتی۔'' عزیزہ نے ناگواری سے شمشاد علی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ شروع ہی سے بڑا خطرناک لگتا تھا...... اور آخر کار اس نے ایک خطرناک اور گھٹیا حرکت کر ہی ڈالی۔''

دو چار غیر ضروری سوالات پوچھنے کے بعد وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کر دی اور اپنے لئے مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میری باری تھی۔ میں نے گواہ پر جرح کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''عزیزہ بی بی! آپ کی عمر کتنی ہو گی؟''

''آپ کو میری عمر سے کیا لینا دینا؟'' وہ جواباً مستفسر ہوئی۔

میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کچھ نہیں...... بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ اگر آپ نہیں

بتانا چاہتیں تو مت بتائیں۔''

وہ میری وضاحت پر کچھ نہیں بولی، خاموش کھڑی رہی۔

میں نے پوچھا۔ ''عزیزہ صاحبہ! آپ سے وکیل استغاثہ نے پوچھا تھا، آپ کتنے عرصے سے مقتولہ کے پاس ملازم تھیں تو آپ نے جواب دیا، جب سے مقتولہ نے اس فلیٹ میں رہائش اختیار کی تھی۔ آپ کے جواب سے مدت کا تعین نہیں ہوتا۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' وہ اکھڑے ہوئے لہجے میں بولی۔

میں نے معقول انداز میں کہا۔ ''پھر آپ صرف اتنا کریں کہ مقتولہ کے یہاں اپنی ملازمت کا عرصہ سالوں یا مہینوں یا دنوں میں بتائیں، جو بھی صورت رہی ہو؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں عالیہ بیگم صاحبہ کے پاس پانچ سال سے ملازمت کر رہی تھی۔ وہ پانچ سال پہلے اس فلیٹ میں آئی تھیں۔''

میں نے پوچھا۔ ''عزیزہ بی بی! تم ہفتے میں کتنے دن مقتولہ کے یہاں کام کرنے جاتی تھیں؟''

''پانچ دن۔'' اس نے جواب دیا۔

''کون سے پانچ دن؟''

''ہفتہ اور اتوار کے علاوہ باقی پانچ دن۔''

''تمہارے کام کی نوعیت کیا تھی؟''

''میں وہاں صفائی ستھرائی اور جھاڑو پونچھا کرتی تھی۔'' گواہ نے بتایا۔

''کیا تم وہاں پورا دن کام کرتی تھیں؟''

وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں روزانہ دن میں گیارہ سے بارہ بجے تک صرف ایک گھنٹے میں اپنا کام نمٹا کر چلی جاتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس کے علاوہ بھی دن میں یا رات میں تمہارا اس فلیٹ میں کبھی آنا جانا ہوتا تھا؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر نفی میں جواب دیتے ہوئے بتایا۔ ''اصول و قواعد اور اوقاتِ کار کے بارے میں عالیہ صاحبہ بہت سخت تھیں۔ گیارہ اور بارہ بجے کے درمیانی وقفے کے سوا مجھے فلیٹ میں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مجھے ہر صورت میں اسی ایک گھنٹے میں اپنا کام ختم کرنا ہوتا تھا۔''

میں آہستہ آہستہ اسے پھندے میں لا رہا تھا۔ ''عزیزہ بی بی!'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے سوال کیا۔ ''تم نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ تمہارے علاوہ مقتولہ سے ملنے جو افراد فلیٹ پر آتے تھے ان میں صرف سلیم قدوسی، شمشاد علی اور کنول نامی لڑکی شامل تھی۔ کیا میں غلط تو نہیں کہہ رہا؟''

''آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں۔'' اس نے تصدیق کی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا تم بتا سکتی ہو کہ یہ تینوں افراد مقتولہ کے فلیٹ پر کس مقصد سے آتے تھے؟“

”بالکل بتا سکتی ہوں۔“ وہ پُر وثوق انداز میں بولی۔ ”سلیم قدوسی ایک بوتیک کے مالک ہیں۔ وہ اپنے کپڑوں کی ڈیزائننگ کروانے عالیہ صاحبہ کے پاس آتے تھے۔ مرحومہ عالیہ صاحبہ ایک بہت اچھی ڈریس ڈیزائنر تھیں۔ کنول نامی لڑکی بیگم صاحبہ سے ٹیوشن پڑھنے آتی تھی اور شمشاد علی......“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ناپسندیدہ نظر سے میرے موکل کو دیکھا اور کہا۔ ”یہ شخص بیگم صاحبہ کے لئے کھانا تیار کر کے لاتا تھا۔ بیگم صاحبہ نے اس پر بہت احسانات کئے تھے مگر یہ احسان فراموش نکلا۔ اس نے اپنی محسنہ ہی کو ڈس لیا۔ ایسے کم ظرف اور کج بخت شخص کو سخت سے سخت سزا ملنا چاہئے۔“

میرے موکل نے استغاثہ کے گواہ کے اس تلخ و ترش تبصرے پر بھی خاموشی اختیار کئے رکھی تاہم اس کا چہرہ متغیر ضرور ہوا تھا۔

میں نے گواہ کو اپنے دام میں لانے کی کوشش جاری رکھی۔ ”عزیزہ بی بی! ابھی جن تین افراد کا ذکر ہو رہا ہے، کیا یہ تینوں بھی تمہاری طرح ہفتے میں پانچ دن مقتولہ کے فلیٹ پر اس سے ملنے آتے تھے؟“

”نہیں جناب!“ وہ تیقن سے بولی۔ ”ان سب کا اپنا اپنا معاملہ تھا۔“

”معاملہ تھا...... کیا مطلب؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولی۔ ”میں آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ یہ تینوں مختلف دنوں اور مختلف اوقات میں مقتولہ عالیہ رحمٰن کے پاس آتے تھے۔“

”اور تمہیں ان کے مخصوص دن اور مقررہ اوقات بھی معلوم ہوں گے؟“

”جی ہاں۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولی۔ ”بوتیک والے سلیم قدوسی صرف پیر اور جمعرات کے دن سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان آتے تھے۔ ملزم شمشاد علی ہفتے میں تین دن پیر، بدھ اور جمعہ کے روز شام پانچ بجے کھانا لے کر آتا تھا اور کنول نامی وہ شاگرد ہفتے اور اتوار کے علاوہ روزانہ شام چھ بجے سے رات آٹھ بجے تک دو گھنٹے کے لئے ٹیوشن پڑھنے آتی تھی۔“

”بہت بہت شکریہ عزیزہ بی بی!“ میں نے گردن کو ذرا سا خم دیتے ہوئے کہا۔

وہ بھونچکا رہ گئی۔ ”اس میں شکریے والی کون سی بات ہے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ”عزیزہ بی بی! تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری مالک مقتولہ عالیہ رحمٰن اصول و قواعد اور ٹائم ٹیبل کے معاملے میں بہت سخت تھیں۔ تمہیں اپنی ڈیوٹی کے مخصوص اوقات (دوپہر گیارہ بجے سے بارہ بجے تک) کے سوا اس فلیٹ پر آنے یا جانے کی اجازت نہیں تھی۔“ ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور

سنسناتے ہوئے انداز میں کہا۔ ”تم نے یہی بتایا تھا نا عزیزہ بی بی؟“

وہ میرے سوال کی تہ تک نہ پہنچ سکی، جلدی سے بولی۔ ”ہاں، میں نے یہی کہا تھا۔“

”اگر یہی بات ہے تو پھر تم معزز عدالت کو یہ بھی بتا دو کہ جھوٹی گواہی کے لئے تم نے کتنی رقم بطور رشوت وصول کی ہے...... یا پولیس والے تمہیں ڈرا دھمکا کر اپنا کام نکال رہے ہیں؟“

”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھی وکیل صاحب!“ پہلی مرتبہ وہ ہراساں نظر آئی۔

وکیل استغاثہ بخوبی میرے مقصد کو پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا اور چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔ ”آبجیکشن یور آنر!“

حاضرین عدالت نے چونک کر وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ جج بھی سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو تکتے ہوئے بولا۔ ”آپ کو کس بات پر اعتراض ہے وکیل صاحب؟“

وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ”جناب عالی! وکیل صفائی استغاثہ کی معزز گواہ پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔“

”میں نے تو اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا۔“ میں نے سادگی سے کہا۔

میرے لہجے کی بے گانگی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وکیل استغاثہ نے چراغ پا ہوتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! وکیل صفائی نے استغاثہ کی گواہ عزیزہ بی بی پر الزام لگایا ہے کہ اس نے پولیس والوں سے رشوت لے کر جھوٹا بیان دیا ہے۔ یہ سراسر زیادتی ہے۔“

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں میرے عزیز دوست!“ میں نے تمسخرانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ واقعی زیادتی کی بات ہو گی کہ پولیس والوں کے بارے میں کسی شخص کو رشوت دینے کا تذکرہ کیا جائے۔ کیونکہ پولیس والے تو صرف رشوت لیتے ہیں۔“

میں نے رک کر اس کیس کے انکوائری آفیسر کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے خاصا جاہ و جلال میں نظر آیا۔ میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے جج سے کہا۔

”جناب عالی! میں محسوس کر رہا ہوں، وکیل استغاثہ رات کو پوری نیند نہیں لے سکے اسی لئے ان کے حواس مختل اور توجہ منتشر ہے۔“ پھر میں نے وکیل مخالف کی طرف دیکھتے ہوئے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”مائی ڈیئر کونسلر! آپ نے یقیناً میری بات غور سے نہیں سنی۔ میں نے استغاثہ کی گواہ عزیزہ بی بی سے سوال کیا تھا کہ جھوٹی گواہی دینے کے لئے اس نے کتنی رقم بطور رشوت وصول کی ہے۔ یہاں کہیں بھی پولیس کا نام استعمال نہیں کیا گیا البتہ......“ میں نے جملہ نامکمل چھوڑ کر طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور کہا۔

”وکیل صاحب! پولیس کا نام میرے سوال میں صرف اس حوالے سے آیا ہے کہ پولیس والے ڈرا دھمکا کر تو اپنا کام نہیں نکال رہے...... یعنی وہ کسی مخصوص دھمکی کے زور پر تو اسے جھوٹی گواہی

دینے پر مجبور نہیں کر رہے۔ کچھ آیا سمجھ شریف میں؟'' میں نے ایک لمحے کا وقفہ دے کر اضافہ کیا۔ ''میرا وہ سوال من و عن عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ آپ ''اطمینانِ قلب'' کے لئے اس ریکارڈ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔''

وہ خجالت آمیز انداز میں مجھے دیکھنے لگا پھر جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''کچھ بھی ہے، آپ نے استغاثہ کے گواہ کے بیان پر اپنے شک کا اظہار کیا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے دروغ گو گردانا ہے۔''

''میں اس جسارت سے انکار نہیں کروں گا۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''آپ اپنے موقف کی وضاحت کریں بیگ صاحب!'' جج نے مجھ سے کہا۔

میں نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے بتایا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کی گواہ مسماۃ عزیزہ بی بی ایک طرف تو یہ کہتی ہے کہ مقتولہ عالیہ رحمٰن اصول و قواعد کی بہت سخت تھیں اور دن گیارہ سے بارہ بجے کے درمیانی وقفے کے سوا اسے فلیٹ میں پھٹکنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی۔ دوسری جانب گواہ بڑی تفصیل سے بتاتی ہے کہ ہفتے کے کس دن، کتنے کتنے بجے، کون کون شخص مقتولہ سے کس سلسلے میں ملنے آتا تھا۔ اس قسم کی معلومات تو کوئی گھر کا بھیدی ہی بتا سکتا ہے یا پھر وہ شخص......'' میں نے توقف کر کے وکیل استغاثہ کی سمت دیکھا اور جملہ مکمل کر دیا۔ ''یا پھر وہ شخص جسے طوطے کی طرح یہ سبق رٹوایا گیا ہو۔''

وکیل استغاثہ سٹپٹائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''یہ کوئی فارمولا نہیں ہے۔''

''آپ کیا کہنا چاہتے ہیں وکیل صاحب؟'' جج نے وکیل استغاثہ سے پوچھا۔

وہ برہمی سے بولا۔ ''یور آنر! میرا مطلب ہے کہ کسی انسان کی معلومات کا تعلق ضروری نہیں اس کے ذاتی تجربے ہی سے ہو۔ وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے سے بھی بہت سی باتیں جان سکتا ہے۔ مثال کے طور پر میں نے انگلینڈ نہیں دیکھا مگر میں اس ملک کے سیاسی اور سماجی حالات و تاریخ سے بخوبی آگاہ ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''بجا فرمایا آپ نے۔ انسان اپنے مطالعے، مشاہدے اور دید شنید سے بھی بہت سی معلومات اکٹھی کر سکتا ہے مگر اس کے لئے ایک چیز شرط ہے!''

''وہ کیا؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''دلچسپی۔''

''میں سمجھا نہیں!''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ انگلینڈ کے سیاسی اور سماجی پس منظر و پیش منظر کا علم رکھتے ہیں تو اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے، آپ اس ملک سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ بصورت دیگر ایسی ہی مستند اور تازہ ترین معلومات آپ کو موزمبیق یا فاک لینڈ یا جاوا سماٹرا کے

بارے میں بھی ہونا چاہئے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہوگا کیونکہ آپ کو ان ممالک سے دلچسپی نہیں ہوگی۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ لاجواب سا ہو کر میرا منہ تکنے لگا۔ میں نے کہا۔ ''میرے عزیز دوست! اب آپ معزز عدالت کو یہ بتائیں کہ استغاثہ کی گواہ عزیزہ بی بی، مقتولہ عالیہ رحمٰن کے گھر آنے جانے والوں کے بارے میں اتنی گہری معلومات کس بنا پر رکھتی ہے۔ مقتولہ کے گھر سے اسے کیا دلچسپی ہے؟''

''یہ تو آپ اسی سے پوچھیں۔'' وہ بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''میں تو اسی سے پوچھ رہا تھا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو خواہ مخواہ ''آبجیکشن'' کا نعرہ مار کر ہمارے درمیان کود پڑے تھے۔'' پھر میں نے کٹہرے میں کھڑی استغاثہ کی گواہ عزیزہ بی بی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ اس سلسلے میں کیا کہتی ہیں؟''

وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگی تاہم اس نے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔ اس کی بوکھلاہٹ اور احتراز پوری تاثیر کے ساتھ عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ کر لیا گیا۔

میں دوبارہ استغاثہ کی گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''عزیزہ بی بی! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ملزم شمشاد علی کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور معزز عدالت کے سامنے بتایا تھا کہ ملزم شروع ہی سے تمہیں بڑا خطرناک لگتا تھا۔ اس شروع ہی سے تمہاری کیا مراد تھی؟''

وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''اس سے میری مراد تھی، جب سے میں نے ملزم کو دیکھا تھا۔''

''تمہیں ملزم کی شخصیت یا کردار میں کون سی بات خطرناک دکھائی دی تھی؟''

''اس کی مونچھیں اور آنکھیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''مونچھیں اور آنکھیں کیوں؟''

وہ کٹہرے میں کھڑے شمشاد علی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ خود دیکھ لیں، اس شخص نے کتنی ڈراؤنی مونچھیں پال رکھی ہیں اور اس کی سرخ سرخ آنکھیں بھی کیسی خوفناک ہیں۔''

میں اس کی وضاحت پر مسکرا کر رہ گیا۔

میں نے مزید سوال نہیں پوچھا اور اپنی جرح ختم کر کے مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

عزیزہ بی بی کے بعد گواہوں کے کٹہرے میں جو شخص آ کر کھڑا ہوا اس کا نام غفور احمد تھا۔ اس کی عمر پینتیس سال کے قریب تھی۔ وہ پیشے کے اعتبار سے ایک باورچی تھا مگر جثے کے لحاظ سے کوئی پہلوان دکھائی دیتا تھا۔ وہ ایک مقامی ہوٹل کے کچن میں کھانا پکانے کا کام کرتا تھا۔

راست گوئی کا حلف اٹھانے کے بعد اس نے اپنا مختصر سا بیان ریکارڈ کروایا۔ اس کے بعد وکیل استغاثہ اپنے حصے کا کام کرنے کٹہرے کے پاس چلا گیا۔ اس نے گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے سوال

کیا۔

''غفور صاحب! آپ ملزم کو کب سے جانتے ہیں؟''

''کافی عرصے سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کافی عرصے سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ''لگ بھگ تین سال سے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''تم لوگ پیشے کی مناسبت سے ایک ہی ہو۔ کیا تم دونوں کی شناسائی کی وجہ بھی یہی ہے؟''

''ہاں، آپ کہہ سکتے ہیں۔'' غفور احمد نے جواب دیا۔

وکیل استغاثہ جرح کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے بولا۔ ''کیا ملزم اور آپ ایک ساتھ کام کرتے تھے؟''

''کسی زمانے میں ایسا ہی تھا۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''گویا بعد میں ایسا نہیں رہا تھا؟''

''جی ہاں۔''

وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ ''غفور صاحب! جس زمانے میں آپ دونوں ایک ساتھ کام کرتے تھے تو آپ نے ملزم کو کیسا پایا؟''

جواب دینے سے پہلے گواہ نے نفرت آمیز نظر سے میرے موکل کو دیکھا اور کہا۔ ''میں نے اس عرصے کے دوران میں ملزم کو نہایت ہی کمینہ اور گھٹیا شخص پایا تھا۔''

''آپ ملزم کے کمینے پن اور گھٹیا ہونے کی وضاحت کریں گے؟'' وکیل استغاثہ نے گواہ سے یہ سوال پوچھنے کے بعد عجیب سی نظر سے مجھے دیکھا۔

گواہ نے جواباً بتایا۔ ''اس سے زیادہ گھٹیا پن اور کمینگی کیا ہوگی کہ یہ شخص ایک ایسی عورت کی عزت اور دولت کو ہتھیانے کی منصوبہ بندی میں لگا رہتا تھا جو اس کی محسنہ تھی۔ میرا اشارہ مقتولہ عالیہ رحمٰن کی جانب ہے۔''

''وہ مقتولہ کے خلاف کس قسم کی منصوبہ سازی میں مصروف رہتا تھا؟''

''یہی کہ کس طرح وہ مقتولہ کو اپنے دامِ فریب میں لا کر اس کا جسم اور دولت اپنے قبضے میں کر لے۔'' گواہ نے ڈھٹائی کی عظیم الشان مثال قائم کرتے ہوئے بے باکی سے کہا۔

اس موقع پر عدالت میں موجود ملزم کی بیوی بشریٰ کی حالت دیدنی تھی۔ اس کے شوہر کی کردار کشی کی جا رہی تھی جس پر وہ بے چارہ چیں بہ جبیں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس جھوٹی الزام تراشی پر شمشاد علی شرمندگی سے زمین میں گڑا جا رہا تھا مگر اس کا کیا کیجئے کہ وہ تمام کارروائی عدالت کے کمرے میں کی جا رہی تھی۔ جس طرح شرع میں کوئی شرم نہیں ہوتی بالکل اسی طرح عدالت کے

کمرے میں بھی ایسے ایسا مناظر اور ایسی ایسی باتیں سامنے آتی ہیں، عام حالات میں جن کے بارے میں انسان کرنے سے پہلے سو بار سوچ کر رہ جاتا ہے۔ خصوصاً حدود کے مقدمات کی کارروائی کے دوران میں ''مظلومہ'' پر وکیل مخالف جس قسم کی جرح کرتا ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا اخلاقی اصولوں کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قسم کی زیادتی کا شکار ہونے والی زیادہ تر لڑکیاں یا عورتیں دادرسی کے لئے عدالتوں کا رخ نہیں کرتیں۔ وہ اپنی دانست میں مزید بے عزتی سے بچنا چاہتی ہیں جس کے نتیجے میں ''جابر'' صاف بچ نکلتا ہے...... گویا وہ مزید ''جبر'' کے لئے معاشرے میں آزادی اور بے خوفی سے دندناتا پھرتا ہے۔

اور بالآخر وہ اپنے مقصد میں جزوی طور پر کامیاب ہو گیا۔ وکیل استغاثہ نے خیال افروز انداز میں کہا۔ ''اس نے مقتولہ عالیہ رحمٰن کو موت کے گھاٹ اتار کر اس کے فلیٹ میں ڈکیتی کی واردات کر ڈالی۔''

گواہ غفور احمد نے وکیل کی سوچ پر رڈا چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ شخص نہ صرف ایک قاتل اور ڈکیت ہے بلکہ بہت سازشی بھی ہے۔''

''وہ کس طرح؟'' وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

گواہ نے نفرت سے ملزم کو گھورا اور تحقیر آمیز انداز میں بتایا۔ ''جب میں نے اس شیطان کو سمجھایا کہ وہ اپنے مذموم عزائم سے باز آئے تو یہ الٹا میرا دشمن ہو گیا۔ اس نے چپکے چپکے سے ہوٹل کے مالک کے کان بھرنا شروع کر دیئے۔ قطرہ قطرہ پانی کی بوند اگر کسی مضبوط پتھر پر بھی ٹپکائی جائے تو اس میں بھی سوراخ ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہوٹل کا مالک میرے خلاف ہو گیا اور بالآخر مجھے نوکری سے نکال دیا گیا۔ میں تو کہتا ہوں......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر میرے موکل کو معاندانہ نظر سے گھورنے لگا۔ پھر دانت کچکچاتے ہوئے بولا۔

''میں تو کہتا ہوں، اس خبیث شخص کو پہلی فرصت میں پھانسی دے دی جائے تاکہ اس ہوس کار کے شر سے دیگر انسان محفوظ رہ سکیں۔''

اس گواہ کی انٹری پر وکیل استغاثہ معزز عدالت کو یہ باور کروانا چاہتا تھا کہ میرے موکل نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت مقتولہ کے گھر میں ڈکیتی کی واردات کی تھی اور ازاں بعد خود کو محفوظ رکھنے کی خاطر مقتولہ کے خون میں ہاتھ رنگ ڈالے تھے تاکہ نہ رہے بانس اور نہ ہی بجے بانسری۔ غفور احمد استغاثہ کی خصوصی ''پیش کش'' تھی جسے بڑے اعتماد کے ساتھ منصۂ شہود پر لایا گیا تھا۔

مزید دو چار غیر ضروری سوالات کرنے کے بعد وکیل استغاثہ نے اپنی جرح موقوف کر دی۔ میں اپنی باری پر اٹھ کر وٹنس باکس (گواہوں والا کٹہرا) کے نزدیک آ گیا اور چند لمحات تک ٹٹولتی ہوئی نظر سے گواہ غفور احمد کا جائزہ لیتا رہا۔

کہتے ہیں، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے اور جھوٹے انسان کا حافظہ بہت کمزور ہوتا ہے۔ میں نے جب چبھتی ہوئی نگاہ سے گواہ کو گھورنا شروع کیا تو وہ اضطرابی انداز میں کھڑا کھڑا اپنے کیم شحیم وجود کا بے انداز وزن ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں پر منتقل کرنے لگا۔ اسی وقت میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

''غفور صاحب!'' میں نے تیز آواز میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کو بتایا ہے کہ آپ عرصہ تین سال سے میرے موکل کو جانتے ہو۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ جان کاری کس نوعیت کی ہے؟''

''جان کاری کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''بس میں اسے جانتا ہوں۔''

''اس جاننے کے دوران میں آپ میرے موکل کو اپنا دوست سمجھتے رہے یا دشمن؟'' میں نے استفسار کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے تو ہمیشہ اسے اپنا دوست ہی سمجھا تھا۔''

''غفور صاحب! آپ اس مقدمے کے ملزم اور میرے موکل شمشاد علی کے ساتھ ایک طویل عرصہ کام کر چکے ہیں۔'' میں نے آہستہ آہستہ اس کی گھسائی شروع کر دی۔ ''کیا تم دونوں اسی ہوٹل میں ایک ساتھ کام کرتے رہے ہو جہاں آج کل تم ملازم ہو؟''

وہ نفی میں جواب دیتے ہوئے بولا۔ ''نہیں جناب! یہاں تو میں تقریباً ایک سال سے کام کر رہا ہوں۔ ہم دونوں ایک ساتھ اس فوراسٹار ہوٹل کے کچن میں کام کرتے تھے جہاں ان دنوں ملزم کام کر رہا تھا۔''

''غفور صاحب!'' میں نے سوالات کے سلسلے کو دراز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں آپ نے بتایا ہے کہ ایک ساتھ کام کرنے کے دوران میں آپ نے میرے موکل کو انتہائی کمینہ اور گھٹیا پایا تھا۔ اپنے اس قسم کے محسوسات کی کچھ وضاحت کریں گے؟ کیا اس نے آپ کے ساتھ کسی نوعیت کی کوئی غیر اخلاقی یا ناشائستہ حرکت کی تھی؟''

وکیل استغاثہ فوراً گواہ کی مدد کو لپکا۔ ''جناب عالی! معزز گواہ ملزم کے کمینے پن اور گھٹیا پن کی وضاحت کر چکا ہے۔ لگتا ہے، وکیل صفائی کا دھیان اس وقت کسی اور طرف تھا۔''

وکیل استغاثہ کی اس بھونڈی چوٹ پر میں زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میرے فاضل دوست! میرا دھیان اس وقت پوری طرح گواہ کے الفاظ پر مرکوز تھا اور میں نے اس کی وضاحت کو اچھی طرح ذہن نشین بھی کر لیا تھا مگر میں محسوس کر رہا ہوں، آپ اس وقت بہت زیادہ منتشر خیالی کا شکار ہیں۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' وہ میری جوابی چوٹ سے تلملا اٹھا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میرا مطلب بہت واضح ہے۔ آپ اپنے ذہن کو اگر تھوڑی سی زحمت دینا گوارا کر لیتے تو یہ مقصد یا مطلب آپ پر بھی کھل جاتا۔ بہر حال......'' میں نے معنی خیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر وکیل استغاثہ کو دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''بہر حال اتنا سمجھ لیں کہ آپ میرے سوال کو کیچ نہیں کر سکے۔''

''کیا آپ کا سوال کوئی گیند تھا جسے میں کیچ نہیں کر سکا؟''

میں نے اسے مزید تپانے کے لئے کہا۔ ''آپ اسے باؤنسر کہہ سکتے ہیں۔''

یہ میرا مخصوص حربہ تھا۔ میں اپنی نوک دار اور کٹیلی باتوں سے سامنے والے کو بوکھلاہٹ، جھنجلاہٹ اور اُکتاہٹ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس طرح وہ بہت جلد اپنا ارتکاز توجہ کھو بیٹھتا تھا اور میں با آسانی اسے شکار کر لیتا تھا۔ وکیل استغاثہ بھی میرے جواب پر جوش میں آ گیا اور تڑپ کر بولا۔

''یہ کیا آپ الٹی سیدھی ہانک رہے ہیں؟''

''بیگ صاحب! آپ اپنی بات کی ذرا وضاحت کریں۔'' جج نے اس صورت حال کو خوش اسلوبی سے ہینڈل کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔

میں نے روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے بولنا شروع کیا۔ ''جناب عالی! بات بہت معمولی سی تھی۔ وکیل استغاثہ خواہ مخواہ جوش و جذبات میں آ رہے ہیں۔ میں نے تو گواہ سے صرف اتنا پوچھا تھا کہ وہ ملزم کے حوالے سے جس کمینے پن اور گھٹیا پن کا ذکر کر چکا ہے، آیا ایسی ہی بد اخلاقی کی کوئی حرکت ملزم نے گواہ کے ساتھ بھی کی تھی؟''

میری اس وضاحت پر وکیل استغاثہ بغلیں جھانکنے لگا۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ اپنی جرح جاری رکھیں۔''

میں نے گواہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے جواب دیا۔ ''میرے ساتھ ملزم ظاہر ہے، وہ کچھ تو نہیں کر سکتا تھا جس قسم کے عزائم وہ اپنے دل میں مقتولہ عالیہ رحمٰن کی بابت رکھتا تھا تاہم اس نے اپنے سازشی ذہن کو استعمال کرتے ہوئے مجھے نوکری سے نکلوا دیا تھا۔''

''آپ کے خلاف میرے موکل نے ایسی سازش کیوں کی؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ناپسندیدہ نظر سے اکیوزڈ باکس (ملزم والا کٹہرا) میں کھڑے شمشاد علی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ میری جانب سے خطرہ محسوس کرنے لگا تھا۔''

''کس قسم کا خطرہ؟''

''اسے خدشہ تھا کہ میں اس کے مذموم منصوبے کی پٹی کھول دوں گا۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''چنانچہ اس سے پہلے کہ میں ہوٹل کے مالک سے یا پھر مقتولہ عالیہ رحمٰن سے ملزم کے عزائم کے

بارے میں کوئی بات کرتا، اس عیار شخص نے میرے خلاف سازش کر کے مجھے ہوٹل سے نکلوا دیا۔''

میں نے کہا۔ ''غفور صاحب! اگر آپ کے بیان کو صد فی صد درست مان بھی لیا جائے تو پھر یہ سوال سر اٹھاتا ہے کہ آپ نے مقتولہ کو، اس کے خلاف ہونے والے منصوبے سے آگاہ کیوں نہیں کیا۔ ممکن ہے، اگر آپ عالیہ رحمٰن کو شمشاد علی کے عزائم کے بارے میں بتا دیتے تو وہ محتاط ہو جاتی اور ملزم سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔ کیا یہ آپ کا اخلاقی فرض نہیں بنتا تھا؟''

وہ تامل کرتے ہوئے بولا۔ ''پہلے میں نے اس بارے میں سوچا تھا۔ پھر مصروفیت کے باعث اس سوچ پر عمل نہ کر سکا جس کا اب مجھے افسوس ہو رہا ہے۔''

میں نے سوالات کا زاویہ تھوڑا سا تبدیل کیا اور درشت لہجے میں استفسار کیا۔ ''غفور صاحب! آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو ملزم کی شکایت پر نوکری سے نکالا گیا تھا اور......''

میں نے مصنوعی تشکر کے اثرات اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔ ''اس تصحیح کا بہت بہت شکریہ میرے فاضل دوست۔''

پھر میں گواہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''غفور صاحب! اگر میں کہوں کہ آپ کا بیان مبنی بر دروغ ہے تو؟''

''میں نے کون سی دروغ گوئی کی ہے؟''

''آپ کا کہنا ہے کہ آپ کو ملزم کی سازش کے تحت نوکری سے نکالا گیا تھا۔'' میں نے تیکھی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ اپنی ''حرکتوں'' کے سبب برخاست کئے گئے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وکیل استغاثہ تیز لہجے میں مستفسر ہوا۔ ''کس قسم کی حرکتیں؟''

''غفور صاحب! آپ کے وکیل صاحب کچھ پوچھ رہے ہیں۔'' میں نے معنی خیز انداز میں گواہ سے کہا۔

وہ بے چینی سے وکیل استغاثہ کی طرف تکتے ہوئے بولا۔ ''پتہ نہیں، وکیل صفائی کون سی حرکتوں کا شوشہ چھوڑ رہے ہیں۔''

''آپ اسے شوشہ کہیں، پھلجھڑی یا آتش بازی۔'' میں نے تفریح لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر اے معزز گواہ استغاثہ! اس بے اعتنائی اور بے خبری کا مظاہرہ تو نہ کریں۔ ہر انسان کو اپنی حرکتوں کا بخوبی علم ہوتا ہے۔''

اس الجھن زدہ صورت حال کو واضح کرنے کے لئے جج نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ ہی اپنی بات کی وضاحت کر دیں۔''

میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے جج کو دیکھا اور کہا۔ ''جناب عالی! میں واقعات کی تفصیل میں جا کر معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد نہیں کروں گا۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ استغاثہ

کے گواہ غفور احمد کا چال چلن قابل مذمت تھا۔ نچلے طبقے کی کئی عورتوں سے اس نے قابل دخل اندازی پولیس قسم کے ''تعلقات'' استوار کر رکھے تھے۔ یہ اس کا ایک ذاتی فعل تھا۔ اگر وہ اس عادت کو محض اپنی ذات تک ہی محدود رکھتا تو شاید میرا موکل اس کے معاملات میں ٹانگ نہ اڑاتا اور سمجھانے بجھانے میں ناکامیابی کے بعد گواہ کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا لیکن...'' میں نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا پھر جج سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! لیکن جب گواہ نے اپنی ''سرگرمیوں'' کے لئے ہوٹل کو استعمال کرنا شروع کر دیا اور یہ بات میرے موکل کے علم میں آ گئی تو اس نے گواہ کو سمجھایا کہ وہ اپنے کالے کرتوتوں کو ذریعہ روزگار سے دور رکھے مگر گواہ کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ ناچار میرے موکل کو ہوٹل کے مالک جمیل فریدی سے بات کرنا پڑی۔ اس ''بات'' کا نتیجہ جلد ہی برآمد ہو گیا۔ جمیل فریدی نے تصدیق کرنے کے فوراً بعد گواہ غفور احمد اور ہوٹل کے چوکیدار سعید خان کو پہلی فرصت میں نوکری سے نکال دیا۔''

جج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ''چوکیدار سعید خان نے کس جرم کی سزا پائی؟''

''گواہ اپنی مصروفیات کے لئے چوکیدار کا کمرہ استعمال کرتا تھا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بات بھی چھپی نہیں رہی تھی کہ اس ''کام'' میں چوکیدار بھی بعض اوقات اس کا ساتھی بن جاتا تھا۔''

جج نے نفرت آمیز نظر سے کٹہرے میں کھڑے استغاثہ کے گواہ غفور احمد کو دیکھا اور تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔ ''یہ سب سچ ہے؟''

وہ لکنت زدہ انداز میں گویا ہوا۔ ''نن...... نہیں...... وکیل صاحب...... مجھ پر خواہ مخواہ...... الزام لگا رہے ہیں۔''

''بیگ صاحب! آپ ''خواہ مخواہ'' کے جواب میں کیا کہیں گے؟'' جج کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں نے کہا۔ ''جناب عالی! ''خواہ مخواہ'' کا مناسب اور موزوں جواب تو یہ ''خود بہ خود'' ہی ہو سکتا ہے۔''

وکیل استغاثہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنی موجودگی کا یقین دلانا ضروری سمجھا اور جھنجلاہٹ آمیز انداز میں بڑبڑایا۔

''یہ خود بخود کیا ہوتا ہے؟''

جج نے مجھ سے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ کو اس ''خود بہ خود'' کی وضاحت کرنا ہو گی۔''

''آل رائٹ یور آنر!'' میں نے تمسخرانہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور کہا۔ ''کہتے ہیں، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے، پڑھے لکھے کو فارسی کیا ہے...... ایسا کہتے ہیں تو یقیناً ٹھیک ہی کہتے

ہیں۔ ہمارے پاس اس ''خود بہ خود'' کو پرکھنے کی ایک کسوٹی موجود ہے۔ کیوں نہ پہلی فرصت میں جھوٹے سچے کی پرکھ کر لی جائے!''

''آپ کس کسوٹی کا ذکر کر رہے ہیں؟'' جج کے لہجے میں حیرت کی جھلک تھی۔

میں نے کہا۔ ''نور اسٹار ہوٹل کا مالک جمیل فریدی صاحب کا ذکر کر رہا ہوں جناب عالی! موصوف اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔ اس سلسلے میں ان سے مدد لی جا سکتی ہے۔''

میں نے ایک معقول تجویز پیش کی تھی۔ چنانچہ جج کے حکم پر جمیل فریدی، گواہوں کے کٹہرے پر آن کھڑا ہوا، پھر جج کے استفسار پر اس نے بتایا کہ باورچی غفور احمد اور چوکیدار سعید خان کی بدکرداری ثابت ہونے کے بعد اس نے ان دونوں کو نوکری سے نکالا تھا۔ اس نے مزید بتایا کہ وہ فریقین ثانی میں سے ایک عورت سے بھی رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اس پیشہ ور عورت نے بھی ان دونوں کے ''نامہ اعمال'' پر تصدیق مہر ثبت کر دی تھی۔

جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! کیا آپ کسی طرح چوکیدار سعید خان کو اس سلسلے میں گواہی کے لئے عدالت میں بلا سکتے ہیں؟''

میں نے جواب دینے سے پہلے جمیل فریدی کو دیکھا۔ وہ میری نگاہ میں پوشیدہ سوال کو پڑھ کر بولا۔ ''آئندہ پیشی کے لئے اگر کوئی نزدیکی تاریخ دے دی جائے تو ایسا کرنا ممکن ہو سکے گا۔ ورنہ کھیل بگڑ بھی سکتا ہے۔''

''آپ کہنا کیا چاہتے ہیں جمیل صاحب؟'' میں نے استفسار کیا۔

وہ بولا۔ ''سعید خان آج کل کاروں کے ایک شوروم میں چوکیداری کر رہا ہے اور مجھے باخبر ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ وہاں بھی اس پر عذاب الٰہی کی آمد آمد ہے۔ اس کی رہائش بھی شوروم کے ایک حصے ہی میں ہے۔ اس پر الزام ہے کہ وہ کمپنی کے فون کا ناجائز استعمال کر رہا ہے اور شوروم بند ہو جانے کے بعد اس کی دیگر غیر نصابی سرگرمیاں بھی شروع ہو جاتی ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ وہ بہت جلد وہاں سے بھی کک آؤٹ کر دیا جائے گا۔''

جج نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ''بیگ صاحب! آپ استغاثہ کے گواہ سے اور کوئی سوال پوچھنا چاہتے ہیں؟'' اس کے ساتھ ہی اس نے دیوار گیر کلاک کی جانب بھی دیکھا۔

عدالت کا وقت ختم ہونے میں چند منٹ باقی رہ گئے تھے۔ میں نے گواہ کی طرف توجہ مرکوز کرتے ہوئے سوال کیا۔

''غفور صاحب! آپ آٹھ جنوری کی رات دس اور بارہ بجے کے درمیان کہاں تھے؟''

''کون سی آٹھ جنوری؟'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اسی سال کی آٹھ جنوری۔ اس دن جمعرات

تھی اور یہ وہی تاریخ ہے جب مقتولہ عالیہ رحمٰن کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔'' ایک لمحے کا توقف دے کر میں نے اضافہ کیا۔ ''جنوری ہر سال کا پہلا مہینہ ہوتا ہے۔ کچھ آپ کی یادداشت میں ہلچل پیدا ہوئی یا کوئی اور حربہ استعمال کیا جائے آپ کے سوئے ہوئے ''معاملات'' کو جگانے کے لئے؟''

''ہاں، مجھے یاد آ گیا۔'' وہ چونکتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس روز رات کو میں اپنے دوست کے ساتھ ایک فلم کا آخری شو دیکھنے گیا ہوا تھا۔''

''آخری شو سے آپ کی مراد، رات نو سے بارہ والا شو ہے نا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کس سینما میں فلم دیکھنے گئے تھے؟''

''بمبینو سینما میں۔''

''اور فلم کون سی تھی؟''

اس نے ایک رومانی اردو فلم کا نام لے دیا۔

میں نے کرید جاری رکھی۔ ''آپ کے دوست کا نام کیا ہے جو آٹھ جنوری کی رات آپ کے ساتھ بمبینو سینما میں ایک رومانی فلم کا آخری شو دیکھ رہا تھا؟''

''مشکور...... مشکور حسین۔'' اس نے تامل کرتے ہوئے بتایا۔

''مشکور کے گھر کا پتہ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور وہ کہاں کام کرتا ہے؟''

گواہ نے اپنے فلم بین دوست کا پتہ دہرانے کے بعد بتایا۔ ''مشکور اسی ہوٹل میں بیرا گیری کرتا ہے جہاں آج کل میں کام کر رہا ہوں۔''

میں نے جج کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! گواہ غفور احمد کے بیان کی تصدیق کے لئے اس کے دوست مشکور حسین کو میں عدالت میں بلوانے کی درخواست کروں گا۔ استغاثہ کو پابند کیا جائے کہ وہ آئندہ پیشی پر مرد مذکور کو عدالت میں پیش کرے۔''

جج نے وکیل استغاثہ کو سوالیہ نظر سے دیکھا۔ وکیل مخالف نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے با آواز بلند اعلان کیا۔ ''مجھے فی الحال اس گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

جج نے سات یوم بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔

''دی کورٹ از ایڈجارنڈ۔''

میں بخوبی سمجھ رہا تھا کہ اتنے نزدیک کی تاریخ دینے کے سلسلے میں جج نے جمیل فریدی کی خواہش نما فرمائش کو ملحوظ رکھا تھا اور یہ حالات کا تقاضا بھی تھا۔

اس روز ہم عدالت کے کمرے سے باہر آئے تو جمیل فریدی کے ساتھ ساتھ ملزم کی بیوی بشریٰ بھی خاصی مطمئن نظر آ رہی تھی۔ میں نے جمیل سے پوچھا۔ ''آپ میری کارکردگی سے کس حد تک

مطمئن ہیں؟''

''میں آپ کی طرف سے خاصا مطمئن ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''اس اطمینان میں اضافے اور میری کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لئے آپ کو میری مدد کرنا ہوگی جمیل صاحب!''

''میں مالی تعاون کے علاوہ بھی ہر قسم کی مدد کے لئے تیار ہوں۔'' وہ خلوص دل سے بولا۔

میں نے ایک دو چھوٹے موٹے کام اس کے ذمے لگائے اور اپنے موکل کی بیوی کو تسلی دے کر پارکنگ ایریا کی جانب بڑھ گیا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ آج کا دن صبح سے خاصا مصروف ہو گیا تھا۔ اب مجھے اپنے مخصوص ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد اپنے دفتر کا رخ کرنا تھا۔ دفتر کی مصروفیات رات نو دس بجے تک چلنے والی تھیں۔

ہر انسان اپنے مخصوص ماحول اور معمول پر کاربند ہے، خاص طور پر پیشہ ور افراد تو ایک مستقل دائرے میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ چونکہ حرکت میں برکت ہے اس لئے یہ حرکت ہر حال میں جاری و ساری رہتی ہے۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر فور اسٹار ہوٹل کے مالک جمیل فریدی نے سعید خان نامی اس چوکیدار کو عدالت میں پیش کر کے موکل کے حق میں بیان دلوا دیا۔ میں نے اس پر مختصر سی جرح بھی کی جس کی تفصیل بیان کرنا ضروری نہیں۔ قصہ مختصر سعید خان نے گواہ غفور احمد کے بیان کے خلاف اس بات کی تصدیق کر دی کہ ان دونوں کو انہی ''حرکات'' پر نوکری سے نکالا گیا تھا۔ سعید خان کی آمد نے میرے موکل کی پوزیشن قدرے بہتر کر دی تھی اور اس سے استغاثہ کے گواہ غفور احمد کی حیثیت مشکوک اور گواہی ناقص ہو گئی تھی۔

اس پیشی پر استغاثہ، غفور احمد کے دوست مشکور حسین کی عدالت میں پیش نہیں کر سکا اور عذر یہ بتایا کہ موصوف کراچی سے کہیں باہر گیا ہوا تھا۔ ویسے میں نے اپنے طور پر جمیل فریدی کے تعاون سے یہ معلوم کر لیا تھا کہ آٹھ جنوری بروز جمعرات بمبینو سینما پر ایک انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی جبکہ استغاثہ کے گواہ غفور احمد کا بیان تھا کہ انہوں نے وقوعہ کے روز ایک رومانی اردو فلم دیکھی تھی۔ اس بیان سے گواہ کے جھوٹ کی قلعی کھل گئی تھی۔ میں نے انگریزی فلم اور سینما والی حقیقت عدالت میں ریکارڈ پر محفوظ کرا دی۔

اس کے علاوہ اس روز جب اور گواہوں کو بھی بھگتایا گیا تھا مگر ان کے بیان میں قابل ذکر بات کوئی نہیں تھی۔ مثلاً بوتیک کے مالک سلیم قدوسی نے بیان دیا تھا کہ وہ صرف پیر اور جمعرات کو مقتولہ کے فلیٹ پر آتا تھا۔ وقوعہ کے دن یعنی آٹھ جنوری بروز جمعرات وہ مقررہ وقت پر مقتولہ کے پاس آیا تھا اور معمول کی ملاقات کے بعد واپس چلا گیا تھا۔ پھر جب پیر کے روز وہ مذکورہ فلیٹ پر

پہنچا تو اسے لاک پایا۔ وہ واپس چلا گیا۔ اب اسے آئندہ جمعرات کو آنا تھا اس سے پہلے ہی تیرہ جنوری بروز منگل کو عالیہ رحمٰن کو پیش آنے والا حادثہ منظر عام پر آ گیا۔

سلیم قدوسی نے میرے سوالات کے نہایت معقول جواب دیئے تھے لہٰذا اسے فارغ کر دیا گیا۔ اسی طرح مقتولہ کی اسٹوڈنٹ کنول اور اس کے باپ کا بیان بھی ہوا تھا۔ نفیس احمد تیرہ جنوری کو خاصی مستعدی کا مظاہرہ کر چکا تھا اس لئے اس کا بیان بھی ضروری سمجھا گیا۔ اس کے بیان میں زیادہ باتیں وہی تھیں جن کا ابتدائی صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔

علاوہ ازیں آٹھ سو چار نمبر فلیٹ میں کام کرنے والے باورچی امتیاز علی کو بھی عدالت میں پیش کیا گیا تھا۔ ملزم شمشاد علی چند روز اس کے پاس کھانا رکھواتا رہا تھا۔ امتیاز علی کے بیان میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جو ملزم کی مخالفت یا موافقت میں جاتی لہٰذا اس کا ذکر گول کرتے ہوئے میں آگے بڑھاتا ہوں۔

مزید تین چار غیر ضروری گواہوں کو نمٹانے میں عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ استغاثہ کی جانب سے دو گواہوں کی پیشی باقی رہ گئی تھی۔ ایک تو وہی غفور احمد کا فلم بین دوست مشکور حسین تھا اور دوسرا شخص فلیٹ نمبر آٹھ سو دو کا باورچی عبدالکریم تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے مقتولہ کی لاش دریافت کی تھی اور وہاں ہونے والی ڈکیتی کا انکشاف کیا تھا۔ آئندہ پیشی پر استغاثہ ان دونوں گواہوں کو پیش کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

میں نے پیش کار سے بات کر کے اسے تاکید کر دی کہ آئندہ پیشی پر ہمارا مقدمہ شروع میں رکھا جائے گا تاکہ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت مل سکے۔ پیش کار نے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا تھا۔

عدالت سے باہر آ کر میں نے جمیل فریدی پر بھی یہ واضح کر دیا کہ وہ پیشی کے دن ذرا جلدی عدالت پہنچ جائے۔ وہ میرا مقصد سمجھ گیا تاہم بشریٰ وغیرہ کا پہلی مرتبہ اس قسم کے معاملے سے واسطہ پڑا تھا اسی لئے وہ خاصی مضطرب نظر آتی تھیں۔ میں نے اور جمیل فریدی نے بھی اس کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے تسلی دی کہ اب اس کے شوہر کی باعزت رہائی میں زیادہ دن باقی نہیں رہے۔ وہ بہت جلد آزاد ماحول میں شمشاد علی سے ملاقات کر سکے گی۔

وہ بے چاری ہماری تسلی تشفی سے مطمئن تو ہو جاتی تھی تاہم یہ سارے واقعات اس کے لئے بہت طلسمی اور خواب ناک سے تھے اس لئے اس کے یقین میں وہ پختگی نہیں آ پا رہی تھی جو کسی تجربہ کار اور واقف حال شخص میں دکھائی دیتی ہے۔ بہر حال، اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔

☆☆☆

استغاثہ کے گواہ عبدالکریم نے سچ بولنے کا حلف اٹھایا، پھر جج کی اجازت سے اس کا بیان ریکارڈ کیا گیا۔ اس کے بیان میں میرے لئے بہت سی باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ میں اس تمام

گفتگو اور واقعات کی تفصیل سے آگاہ ہو چکا تھا جو تیرہ جنوری کی شام آٹھ سو دو نمبر فلیٹ پر ظہور پذیر ہوئے تھے۔ ظہیر خان، نفیس احمد، کنول اور عبدالکریم کے درمیان جو باتیں ہوئی تھیں وہ میرے موکل کی موافقت میں جاتی تھیں مگر عبدالکریم نے ابھی جو بیان عدالت میں ریکارڈ کروایا تھا اس میں بہت سی باتیں میرے موکل کے خلاف جاتی تھیں۔ گواہ کا یہ بیان پولیس کو دیئے گئے بیان سے قدرے مختلف تھا۔

"عبدالکریم! تم ایک بہادر اور نڈر انسان ہو۔ تم نے جس طرح اپنی زندگی داؤ پر لگا کر مقتولہ کی لاش دریافت کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔"

گواہ مسرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھنے لگا۔ وکیل استغاثہ نے عام سے لہجے میں کہا۔ "تم ان واقعات کو مختصر الفاظ میں دہراؤ جو تیرہ جنوری کی رات تمہیں خطرناک طریقے سے ایک فلیٹ سے دوسرے فلیٹ میں لے گئے تھے؟"

"میں اس دن پیش آنے والے واقعات کو کیسے بھول سکتا ہوں۔" وہ پُر اعتماد لہجے میں بولا۔ اس کے بعد اس نے پوری تفصیل دہرا دی۔

وکیل استغاثہ خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔ گواہ کے خاموش ہونے پر اس نے کہا۔ "پھر تم اپنے کچن کی کھڑکی میں قدم رکھ کر پڑوس کے کچن کے راستے اس فلیٹ میں پہنچ گئے؟"

"جی ہاں، بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔" گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک میں تم نے کیا دیکھا؟"

"سب سے پہلے تو میری نظر کرسی پر بندھی ہوئی عالیہ رحمٰن پر گئی جسے دیکھتے ہی میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس دنیا سے اُس دنیا میں سفر اختیار کر چکی ہے۔" گواہ عبدالکریم نے نہایت ہی پُر اعتماد لہجے میں بتایا۔ "اس کے بعد فلیٹ کی حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں ڈکیتی کی ایک بھرپور واردات عمل میں آ چکی تھی۔ میں فوراً ہی واپس اپنے فلیٹ میں آ گیا اور ظہیر صاحب کو پڑوس کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ انہوں نے پولیس کو فون کیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ پولیس اور عدالت کے ریکارڈ پر موجود ہے۔"

وکیل استغاثہ نے اگلا سوال کیا۔ "عبدالکریم! تم کتنے عرصے سے ظہیر خان کے یہاں ملازمت کر رہے ہو؟"

"میں نوعمری سے ہی ان کے پاس ہوں۔"

"پھر تو تم ملزم کو اچھی طرح جانتے ہو گے؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ "یہ تو مقتولہ کے پاس صرف چار سال سے آ جا رہا تھا۔"

گواہ نے جواب دیا۔ "میں ملزم کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"یہ ہفتے میں کتنے دن مقتولہ کے لئے کھانا لے کر آتا تھا؟"

"مشہور تو اس نے یہی کر رکھا ہے کہ یہ صرف تین روز (پیر، بدھ اور جمعہ) کو کھانا لے کر مقتولہ عالیہ رحمٰن کے پاس آتا تھا۔" گواہ نے طنزیہ نظر سے ملزم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ کوئی حتمی بات بھی نہیں ہے۔"

گواہ کا انداز و بیان یہاں سے میرے موکل کی مخالفت کی راہ پر گامزن ہو گیا تھا۔ وکیل استغاثہ نے اس پر مرچ مسالا کا چھڑکاؤ کرتے ہوئے پوچھا۔

"عبدالکریم! اگر یہ حتمی بات نہیں ہے تو پھر حقیقت کیا ہے؟"

"حقیقت تو یہ ہے جناب!" وہ جج کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ "کہ ملزم ان مخصوص تین دنوں کے علاوہ بھی اس بلڈنگ میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے۔"

وکیل استغاثہ نے ایک امکانی پہلو سامنے لاتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے، ملزم اس بلڈنگ کے کسی اور فلیٹ والوں کے لئے بھی اپنی باورچیانہ خدمات پیش کرتا ہو؟"

"ناممکن۔" عبدالکریم قطعیت سے نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ "میں نے لگ بھگ اپنی تمام عمر اسی بلڈنگ میں گزاری ہے اس لئے وہاں کے معمولات اور لوگوں کی مصروفیات سے اچھی طرح واقفیت رکھتا ہوں۔ ملزم، مقتولہ عالیہ رحمٰن کے سوا کسی کے لئے کسی بھی قسم کی خدمات انجام نہیں دے رہا تھا۔"

وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ "عبدالکریم! کیا ملزم کو صرف بلڈنگ ہی میں آتے جاتے دیکھا گیا ہے یا وہ آٹھویں فلور پر بھی پایا جاتا رہا ہے۔ میرا مطلب ہے، اس کے مخصوص دنوں کے علاوہ؟"

"جی ہاں، میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ ملزم پیر، بدھ اور جمعہ کے علاوہ نہ صرف بلڈنگ میں بلکہ خصوصاً آٹھویں فلور پر دیکھا گیا ہے۔" گواہ نے اپنے لہجے میں خوب مضبوطی بھرتے ہوئے کہا۔

وکیل استغاثہ نے سوالات کا زاویہ بدل دیا اور گواہ کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ "عبدالکریم! ملزم کم و بیش چار سال سے اس بلڈنگ میں آ جا رہا تھا خاص طور پر فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک میں تو اس کی آمد و شد باقاعدہ تھی۔ تم جس فلیٹ پر رہتے ہو وہ فلیٹ نمبر آٹھ سو ایک سے ملا ہوا ہے یعنی فلیٹ نمبر آٹھ سو دو۔ اس صورت حال میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ملزم کی تمہارے ساتھ اچھی خاصی علیک سلیک ہو گی، خصوصاً اس صورت حال میں بھی کہ تم دونوں ہم پیشہ بھی ہو۔ تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو؟"

"جیسا عام طور پر نظر آ رہا ہے، حقیقت اس کے بالعکس تھی۔" گواہ نے سنجیدگی سے کہا۔ "ہمارے درمیان کبھی بھی اچھی دعا سلام نہیں رہی۔ تعلق یا دوستی تو بہت دور کی بات ہے۔"

"یہ بات عجیب اور حیرت انگیز نہیں عبدالکریم؟"

"ہاں، ہے تو۔" وہ بے پرواہی سے بولا۔ "مگر حقیقت تو حقیقت ہی ہوتی ہے۔ وہ عجیب ہو یا

غریب......امیر ہو یا کبیر......حیرت انگیز ہو یا نفرت آمیز۔"

"تمہاری ملزم کے ساتھ نہ بننے کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

"بس میں اسے پسند نہیں کرتا تھا۔" گواہ نے جواب دیا۔ "یہ شخص شروع ہی سے مجھے کچھ پراسرار اور مشکوک لگتا تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ ایک نہ ایک روز یہ ضرور کوئی چاند چڑھائے گا اور دیکھ لیں اس نے کتنا لاجواب "کارنامہ" انجام دیا ہے جس کے "انعام" کے طور پر یہ یہاں موجود ہے۔"

گواہ کے جملوں کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے خصوصی طور پر تیاری کروائی گئی ہے۔ وہ میرے موکل کو غیر معزز اور ناقابل اعتبار ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

اس کے بعد وکیل استغاثہ جس قسم کی جرح کرتا رہا اس کا لب لباب کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ جب اس نے اپنی جرح موقوف کر دی تو میں اپنی ذمے داری نبھانے گواہ عبدالکریم کے نزدیک آ گیا۔

"عبدالکریم!" میں نے اس کے چہرے پر نگاہ ٹکاتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے تیرہ جنوری کی رات پولیس کو جو بیان دیا تھا وہ اس بیان سے قدرے مختلف ہے جو ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے معزز عدالت کے روبرو ریکارڈ کروایا ہے۔ اس کی کوئی خاص وجہ تھی؟"

وکیل استغاثہ نے اس موقع پر فوراً اعتراض جڑ دیا۔ عبدالکریم کی گواہی اس کے لئے بڑی اہمیت کی حامل تھی اس لئے وہ پوری تن دہی سے اس کی حفاظت اور مدد کرنے کا خواہاں نظر آتا تھا۔ اس نے تیز اور معترض لہجے میں کہا۔

"استغاثہ کے معزز گواہ نے پولیس کو جو بیان دیا تھا اسے کسی بھی صورت عدالت کے روبرو دیئے گئے بیان سے مختلف یا اس کے متضاد نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ پولیس والے بیان کو قدرے ادھورا اور عدالت والے بیان کو مکمل کہا جا سکتا ہے۔"

میں وکیل استغاثہ کا پینترا سمجھ گیا۔ تکنیکی لحاظ سے وہ بالکل درست کہہ رہا تھا۔ تازہ ترین بیان میں جو کچھ نئی باتیں شامل کی گئی تھیں جو سابق بیان میں ندارد تھیں اور یہی "اضافہ" میرے موکل کے خلاف جاتا تھا۔ مگر میں بھی کچی گوٹیاں نہیں کھیلا ہوا تھا۔ میں نے اپنے موکل کی سیفٹی اور مقدمے کی جیت کے لئے بڑی خاص الخاص تیاری کر رکھی تھی اور اپنی پیشہ ورانہ مہارت کو کام میں لاتے ہوئے مجھے مخالف وکیل کو چت کرنا تھا۔

میں فروعی معاملات کو پس پشت ڈالتے ہوئے ناگزیر مسائل کی طرف آ گیا اور گواہ عبدالکریم کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔

"عبدالکریم! تم نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ میرا موکل اپنی آمد وشد کے مقررہ دنوں کے علاوہ بھی اس اپارٹمنٹ بلڈنگ میں دیکھا گیا تھا؟"

"جی، میں نے یہی بتایا تھا۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تمہارا یہ دعویٰ یا بیان سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے یا پھر تم نے خود اسے بلڈنگ میں آتے جاتے دیکھا تھا؟"

"میں نے خود اپنی ان گناہ گار آنکھوں سے کئی مرتبہ ملزم کو مقررہ دنوں کے علاوہ بلڈنگ میں آتے جاتے دیکھا تھا۔" وہ اپنے ہاتھوں سے دونوں آنکھوں کو چھوتے ہوئے بولا۔

مجھے اس موقع پر تفریح سوجھی۔ میں نے اپنے لہجے میں وافر سنجیدگی بھرتے ہوئے کہا۔

"عبدالکریم! تم اپنی آنکھوں کو گناہ گار کیوں کہہ رہے ہو۔ خدانخواستہ کہیں تم......"

میں نے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں نے محاورتاً اپنی آنکھوں کو گناہ گار کہا ہے ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔"

"کیسی کوئی بات نہیں؟" میں نے دلچسپی لیتے ہوئے استفسار کیا۔

"م......میرا مطلب ہے......" وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

میں نے اس کی بوکھلاہٹ سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "میں نے جرم نہیں بلکہ گناہ کا ذکر کیا تھا۔"

"ہاں ہاں، وہی۔" وہ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "گناہ اور جرم ایک ہی بات ہے۔ میں نے نہ کوئی گناہ کیا ہے اور نہ کوئی جرم۔"

میں نے جرح کے سلسلے کو مناسب رفتار سے آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "عبدالکریم! تم نے تھوڑی دیر پہلے وکیل استغاثہ کو بتایا تھا کہ تمہاری، میرے موکل سے نہ علیک سلیک تھی اور نہ ہی دوستی کی فضا میں تمہارے درمیان کوئی تعلق تھا۔ پھر اگلے چند سوالات کے جواب دیتے ہوئے تم نے اس دوری کا یہ سبب بتایا تھا کہ تمہیں میرا موکل ناقابل اعتبار، غیر معزز، مشکوک اور پراسرار شخص لگتا تھا جس کی وجہ سے تم نے اس سے ربط ضبط بڑھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کیا تمہارے اس بیان سے ظاہر نہیں ہوتا کہ تم میرے موکل کے ساتھ کھلی دشمنی کر رہے ہو؟"

"اس میں دوستی اور دشمنی والی کوئی بات نہیں۔" عبدالکریم نے بیزار کن لہجے میں کہا۔ "میں نے صرف ملزم کے لئے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے......اور میں اپنے خیالات کے اظہار کے لئے خود کو آزاد محسوس کرتا ہوں۔"

"بے شک، بے شک۔" میں نے سراہنے والے انداز میں تصدیق کرتے ہوئے کہا۔ "شخصی آزادی ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ یہ ضروری حق تمہیں بھی ملنا چاہئے۔ تم بھی اپنے خیالات، محسوسات، نظریات اور پسند، ناپسند کے لئے کلی طور پر آزاد ہو۔"

میری ان باتوں سے وہ یہ سمجھا کہ میں اس سے متاثر ہو گیا ہوں۔ وہ سینہ تان کر کٹہرے میں

سیدھا کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کے گرد اپنے سوالات کا حلقہ تنگ کرتے ہوئے جرح جاری رکھی۔

”عبدالکریم! وکیل استغاثہ کی جانب سے تمہیں بہت سارے تمغے مل چکے ہیں۔ مثلاً تمغۂ بہادری، تمغۂ جرأت، تمغۂ امتیاز وغیرہ۔ یہ تمام اعزازات تمہیں اس کارنامے پر دیئے گئے ہیں جو تم نے دو فلیٹس کی سلائیڈنگ ونڈوز کو استعمال کر کے زمین کی سطح سے لگ بھگ سو فٹ بلند مقام پر انجام دیا ہے۔ اس قسم کے مناظر عموماً اشتہارات کی فلموں میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کیا تم نے کبھی کسی اشتہار کی عکس بندی میں اسسٹنٹ کے طور پر بھی کام کیا ہے؟“

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”نہیں جناب، میں نے کبھی کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ حالانکہ مجھے بہت شوق ہے اس کام کا۔“

میں نے پوچھا۔ ”عبدالکریم! جب تم اپنے فلیٹ کی کھڑکی سے مقتولہ کے فلیٹ کی کھڑکی کے ذریعے اس کے فلیٹ میں پہنچے تو تم نے وہاں کیا دیکھا؟“

میں نے مقتولہ کو ایک کرسی پر بندھے ہوئے پایا۔“

”پھر اس کے بعد کیا دیکھا؟“

”مقتولہ سے نظر ہٹی تو میں نے فلیٹ کا بغور جائزہ لیا اور پلک جھپکتے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں ڈکیتی کی واردات کی گئی تھی۔ فلیٹ کے ہر کمرے میں موجود سامان کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا گیا تھا اور ایک ابتری کا عالم تھا۔“ گواہ نے سنجیدہ لہجے میں بتایا۔

میں نے سوال کیا۔ ”اس کے بعد تم نے کیا، کیا؟“

”میں فوراً واپس آ گیا۔“

”اسی طرح کھڑکیوں کا استعمال کرتے ہوئے؟“

”جی ہاں...... بالکل اسی طرح۔“

”تم فلیٹ کے اندر داخل ہو چکے تھے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”اگر تم چاہتے تو داخلی دروازے سے بھی باہر آ سکتے تھے۔ پھر واپسی کے لئے تم نے وہی خطرناک راستہ اختیار کیوں کیا؟“

”دراصل فلیٹ کا داخلی دروازہ تو لاک تھا نا!“

”وہ دروازہ باہر سے اندر آنے والوں کے لئے لاک تھا۔“ میں نے کہا۔ ”اندر سے باہر جانے والوں کے لئے اس لاک کی کیا اہمیت تھی۔ تم با آسانی دروازہ کھول کر باہر نکل سکتے تھے۔“

میرے اس غیر متوقع سوال پر وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ متامل لہجے میں اس نے جواب دیا۔ ”وہ...... وہ اس وقت میرا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ فوری طور پر میرے ذہن میں یہی آیا کہ میں جیسے فلیٹ میں داخل ہوا تھا اسی طریقے سے واپس بھی چلا جاؤں۔“

میں نے کہا۔ ”عبدالکریم! ذرا سوچ کر بتاؤ، تم مقتولہ کے فلیٹ میں کتنی دیر رکے تھے؟“

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟“ وہ جلدی سے بولا۔ ”اور یہ بات بھی درست نہیں کہ میں مقتولہ کے فلیٹ میں رکا تھا۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے وضاحت کی۔ ”وکیل صاحب! میں تو بس وہاں یوں گیا اور یوں واپس آ گیا تھا۔“ بات ختم کرتے ہوئے اس نے دو مرتبہ چٹکی بجائی۔ اس طرح وہ شاید کم سے کم وقت کو ظاہر کر رہا تھا۔

میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ”عبدالکریم! تمہاری چٹکی اور ’یوں‘ سے وقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ ذہن پر زور دے کر وضاحت کرو کہ تم کتنی دیر مقتولہ کے فلیٹ میں رہے تھے۔ یعنی یہ مدت وقت کی مخصوص اکائی میں بتاؤ...... جیسے سیکنڈ، منٹ، گھنٹے، دن، مہینے، سال...... وغیرہ وغیرہ۔

استغاثہ کا گواہ عبدالکریم ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں مقتولہ کے فلیٹ میں زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ رکا ہوں گا۔ ویسے میرا اندازہ ہے کہ وقت کا یہ دورانیہ تین منٹ کے قریب ہوگا۔“

”صرف تین منٹ یا زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں تم نے وہ سب کچھ دیکھ لیا؟“ میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے تمہارا مشاہدہ بہت طاقتور ہے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ”میرا حافظہ اور مشاہدہ کافی مضبوط ہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”عبدالکریم! تم نے مقتولہ کے فلیٹ میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلا کام کیا، کیا تھا اور اسی طرح وہاں سے رخصت ہونے سے پہلے تم نے آخری کام کون سا کیا تھا؟“

وکیل استغاثہ نے مداخلت ضروری سمجھتے ہوئے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ”مجھے اعتراض ہے جناب عالی!“

”اعتراض کی وضاحت کریں۔“ جج نے سنجیدہ لہجے میں وکیل استغاثہ سے کہا۔

وہ بولا۔ ’استغاثہ کا معزز گواہ بڑے واضح الفاظ میں یہ بات بتا چکا ہے کہ وہ کم و بیش تین منٹ تک مقتولہ کے فلیٹ میں رکا تھا۔ یعنی صرف ایک سو اسی سیکنڈ۔ اس قلیل مدت میں پہلا کام اور آخری کام کون سا کیا جا سکتا ہے؟ وکیل صفائی خواہ مخواہ معزز گواہ کو الجھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا یہ فعل عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ انہیں ایسی کوشش سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔“

میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ”جناب عالی! وکیل استغاثہ کا اعتراض انتہائی بچکانہ اور احمقانہ بھی ہے۔ کوئی بھی دو کام (پہلا اور آخری) کرنے کے لئے ایک سو اسّی سیکنڈ تو بہت ہی زیادہ وقت ہے۔ میرے خیال میں تو بعض کام ایسے بھی ہیں کہ جنہیں ایک کام فی سیکنڈ کے حساب سے کیا جا سکتا ہے...... یعنی تین منٹ میں ایک سو اسّی کام۔“

”یہ کس قسم کے کام ہیں، ذرا اس کی بھی وضاحت فرما دیں میرے فاضل دوست! وکیل استغاثہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ضرور جناب، ضرور۔“ پھر ایک لمحے کا توقف دے کر

میں نے جج کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''جناب عالی! اس سلسلے میں ایک چھوٹے سے کام کی مثال میں یوں دوں گا کہ آنکھیں بند کرنا اور آنکھیں کھولنا۔ یہ دو کام ہوئے اور میرا خیال ہے یہ عمل دو سیکنڈ میں با آسانی انجام دیا جا سکتا ہے۔'' میں نے بات ختم کر کے وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا۔

وہ شدید نوعیت کی جھنجلاہٹ کا شکار ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی جھنجلاہٹ میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ''استغاثہ کا معزز گواہ تو ماشاءاللہ انتہائی مضبوط قوتِ مشاہدہ اور قوتِ حافظہ کا مالک ہے۔ وہ تین سے پانچ منٹ کے عرصے کے دوران میں بہت سارے کام کر سکتا ہے اور انہیں یاد بھی رکھ سکتا ہے۔'' پھر میں نے براہِ راست گواہ کو دیکھا اور پوچھا۔ ''عبدالکریم! تم بھی تو کچھ بولو نا؟''

وہ بولا۔ ''میں نے مقتولہ کے فلیٹ میں کوئی تکنیکی یا دستی کام نہیں کیا تھا۔ بس اس عرصے کے دوران میں، میں نے اپنی آنکھوں کا استعمال کیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ کرسی پر بندھی ہوئی عالیہ رحمٰن موت کے منہ میں جا چکی ہے اور ازاں بعد فلیٹ میں ہونے والی ڈکیتی کے بارے میں مجھے معلوم ہوا۔ یعنی میں نے اپنی آنکھوں سے فلیٹ کی اندرونی حالت کا تفصیلی جائزہ لیا۔''

''شکریہ عبدالکریم!'' میں نے دوستانہ لہجے میں کہا پھر پوچھا۔ ''تم آٹھ جنوری بروز جمعرات کی رات دس اور بارہ بجے کے دوران میں کہاں تھے؟''

اس نے چونک کر ہراساں نظر سے مجھے دیکھا اور جلدی سے بولا۔ ''میں اپنے گھر میں ہی تھا۔''

''اپنے گھر میں...... یعنی ظہیر خان کے فلیٹ میں؟''

''ظاہر ہے جناب! وہی فلیٹ میرا گھر ہے۔''

''کیا تمہارے مالک ظہیر صاحب اور ان کی فیملی بھی اس روز خصوصاً رات دس سے بارہ بجے کے دوران میں اپنے فلیٹ پر موجود تھے؟''

''نن...... نہیں۔'' وہ گڑبڑا گیا۔ ''وہ سب لوگ اس دن گھر میں نہیں تھے۔''

''وہ کہاں گئے ہوئے تھے؟''

''وہ حیدرآباد گئے تھے۔'' گواہ نے بتایا۔ ''وہاں ان کے کسی قریبی رشتے دار کی شادی تھی۔''

''وہ مذکورہ روز کتنے بجے گھر سے نکلے تھے؟'' میں نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''اور ان کی واپسی کب تک ہوئی تھی؟''

عبدالکریم نے جواب دیا۔ ''وہ آٹھ جنوری کی رات آٹھ بجے گھر سے روانہ ہوئے تھے اور اگلے روز یعنی نو جنوری کی دوپہر میں واپس آئے تھے۔''

مجھے اپنی توقع کے مطابق جواب مل گیا تھا۔ یہ بات میں پہلے ہی معلوم کر چکا تھا۔ اسی قسم کی اور بھی بہت سی باتیں میں نے اپنے طور پر جان لی تھیں۔ میں جب بھی کوئی کیس اپنے ہاتھ میں لیتا ہوں تو اس کے تمام کرداروں کے بارے میں اچھی طرح چھان بین اور معلومات حاصل کر لیتا ہوں اور اس طرح عدالتی کارروائی کے دوران میں گواہوں اور وکیل مخالف سے ''کھیلنے'' میں بہت

مزہ آتا ہے۔ ظہیر خان بھی اس ''کہانی'' کا ایک کردار تھا چاہے ایکسٹرا ہی سہی، اس لئے میں نے اس کے معمولات خصوصاً آٹھ اور تیرہ جنوری کی مصروفیات کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کر لی تھیں جواب کام آ رہی تھیں۔

میں نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے درخواست کی۔ ''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ تو تقریباً نمٹ ہی چکے ہیں، البتہ مشکور حسین کا معاملہ ابھی تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ آئندہ پیشی پر ملزم کا بیان اور پھر اس پر جرح بھی ہونا ہے۔ سردست میں معزز عدالت کی اجازت سے اس کیس کے انکوائری آفیسر سے چند سوالات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں نے کٹہرے میں کھڑے تفتیشی آفیسر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آئی۔ او صاحب! جب آپ ظہیر خان کی اطلاع پر موقع واردات پر پہنچے تو سب سے پہلے آپ نے کون سا کام کیا؟''

وہ پُراعتماد لہجے میں گویا ہوا۔ ''جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے لئے مقتولہ کے فلیٹ کے اندر پہنچنا ضروری تھا اور اس کے لئے فلیٹ کا دروازہ توڑنا ضروری تھا، چنانچہ ہم نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مقتولہ کے فلیٹ کے دروازے کا تالا توڑ ڈالا۔''

''تالا ٹوٹنے کے بعد دروازہ کھل گیا ہوگا۔'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''آئی۔ او صاحب! جب آپ مقتولہ کے فلیٹ میں داخل ہوئے تو آپ کی گھڑی میں کیا بجا تھا؟''

''وہ ساڑھے دس اور گیارہ بجے کے درمیان کا کوئی وقت تھا۔''

''دن کے یا رات کے؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، رات کے۔'' اس نے بیزار لہجے میں جواب دیا۔

''آئی۔ او صاحب!'' میں نے اپنے مقصد کی طرف آتے ہوئے سوال کیا۔ ''تیرہ جنوری کی رات جب آپ ساڑھے دس، گیارہ بجے مقتولہ کے فلیٹ کا تالا توڑ کر فلیٹ کے اندر داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ کو کیا نظر آیا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''کیوں، کچھ بھی کیوں نہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

اس نے جواب دیا۔ ''آدھی رات کو ایک بند فلیٹ کے اندر، اندھیرے میں کیا نظر آ سکتا ہے؟ میں نے سب سے پہلے فلیٹ کی لائٹس آن کروائیں پھر ہم فلیٹ کا اندرونی جائزہ لینے لگے۔''

''دیٹس اِز پوائنٹ یور آنر!'' میں نے اپنی فائلوں پر ہاتھ مارتے ہوئے تیز آواز میں کہا اس کے ساتھ ہی عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔

✵☆✵

''جناب عالی!'' میں نے دلائل کا آغاز کرتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔

اُس روز عدالت کا کمرا پوری طرح بھرا ہوا تھا۔ کچھ افراد کو میں نے خاص طور پر مدعو کیا تھا جن

کا ذکر آگے چل کر ہو گا۔ یہ مقدمہ اپنے اختتامی مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ آج میں بھری عدالت میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے بدستور پُر اعتماد انداز میں بولنا شروع کر دیا۔ ''مقتولہ عالیہ رحمٰن سے مجھے دلی ہمدردی ہے۔ اگرچہ وہ اب اس دنیا میں باقی نہیں رہی تاہم موت کے گھاٹ اتارنے سے پہلے بھی اس کی زندگی تلخیوں اور تنہائیوں سے عبارت رہی تھی۔ معزز عدالت کے ریکارڈ پر ہر بات کی تفصیل موجود ہے۔''

میں ایک لمحے کو سانس لینے کی خاطر رکا، پھر سلسلۂ دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! مقتولہ سے ہزار ہمدردی رکھنے کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ اس کی موت میں میرے موکل کا ہاتھ ہرگز نہیں ہے۔ ملزم بالکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اس مقدمے میں پھانسا گیا ہے۔'' میں نے ذرا رک کر وکیل استغاثہ کو دیکھا، پھر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولنا شروع کیا۔

''جناب عالی! میں اپنی بات کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ استغاثہ بے شمار خامیوں اور کمزوریوں کا پلندا معلوم ہوتا ہے بلکہ اگر اسے جھوٹ کا پلندا کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔''

میرے ان ریمارکس پر وکیل استغاثہ نے کچا کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں نے اپنا ''کام'' جاری وساری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کے اکثر گواہوں کا بیان مبنی بر دروغ ہے جس سے استغاثہ کی میرے موکل سے کھلی مگر بے سبب دشمنی جھلکتی ہے۔ استغاثہ کی گواہ اور مقتولہ کی ماسی عزیزہ کو لے لیجئے۔'' میں نے ذرا سا توقف کیا، پھر بولنا شروع کیا۔

''گواہ عزیزہ صرف اس بنا پر میرے موکل کو انتہائی خطرناک گردانتی ہے کہ اس نے خاصی صحت مند مونچھیں پال رکھی ہیں اور اکثر و بیشتر اس کی آنکھیں بھی سرخ رہتی ہیں۔ کسی شخص کے مجرم ہونے کا یہ معیار مضحکہ خیز اور ناقابل یقین ہے۔ اگر یہ استغاثہ کا آئیڈیا ہے تو پھر یہی کہا جا سکتا ہے...... ماشاءاللہ...... سبحان اللہ...... اللہ کرے ''زورِ قلم'' اور زیادہ!''

میں نے کوشش کی تھی کہ نہایت طنزیہ بات کو بھی سیدھے سادے انداز میں بیان کروں مگر الفاظ کی کاٹ اور تاثیر سے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''جناب عالی! عزیزہ کی گواہی میں اور بھی بہت سے جھول ہیں جو استغاثہ کے بوگس ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ یہ تمام باتیں گواہ پر جرح کے دوران میں عدالت کے ریکارڈ پر محفوظ ہو چکی ہیں۔ مثلاً یہی ایک بات بہت اہمیت کی حامل ہے کہ مقتولہ سخت اصول اور قواعد اور ٹائم ٹیبل کی قائل تھی۔ گواہ کو اپنی ڈیوٹی کے دورانئے کے سوا فلیٹ میں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر عزیزہ وہاں آنے جانے والے تمام افراد کے اسکیجیول سے پوری طرح باخبر تھی۔ اس سے یہی بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسے یہ ''سبق'' بڑی

محنت سے ''یاد'' کروایا گیا ہے جس کا سہرا استغاثہ کے سر ہی بندھتا ہے۔''

میں نے حاضرین عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کے گواہ غفور احمد نے جتنی قلابازیاں کھائی ہیں ان کی تفصیل میں جائے بغیر میں کہوں گا کہ اس کی گواہی قدم قدم پر دروغ گوئی کی ایک نئی داستان سناتی نظر آتی ہے۔ اس نے میرے موکل پر الزام لگایا کہ شمشاد نے سازش کر کے اسے فور اسٹار ہوٹل کی نوکری سے نکلوا دیا تھا جبکہ معزز عدالت کے روبرو مذکورہ ہوٹل کا مالک جمیل فریدی اس بات کی تصدیق کر چکا ہے کہ گواہ غفور احمد کو اس کی بدچلنی اور بدکرداری کے باعث نوکری سے برخاست کیا گیا تھا۔ اسی ذیل میں ہوٹل کے چوکیدار سعید خان کا ذکر بھی ہوا اور سعید خان کو گواہی کے لئے عدالت میں پیش بھی کیا جا چکا ہے جس نے بہ زبان خود اقرار کیا ہے کہ فور اسٹار ہوٹل سے ان کی نوکری چھوٹنے کی وجہ ان کے کردار کی کمزوری تھی۔ اس نے پیشہ ور عورتوں سے ''تعلقات'' کو باقاعدہ تسلیم کیا ہے۔ اس روشنی میں گواہ غفور احمد جیسے بدکردار شخص کی گواہی کو کہاں تک قابل بھروسہ سمجھا جانا چاہئے۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔

''جناب عالی! گواہ غفور احمد کی دروغ گوئی ایک اور زاویے سے بھی کھل کر سامنے آ چکی ہے۔ جائے وقوعہ پر غیر حاضری یا غیر موجودگی کے سلسلے میں اس نے وضاحت کی تھی کہ اس وقت وہ اپنے ایک دوست مشکور حسین کے ساتھ بمبینو سینما میں کوئی رومانٹک اردو فلم دیکھ رہا تھا لیکن یہ حقیقت روز روشن کی مانند عیاں ہو چکی ہے کہ مورخہ آٹھ جنوری بروز جمعرات اس شہر کے بمبینو سینما میں ایک انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ جو گزشتہ کئی ہفتوں سے وہاں نمائش پذیر تھی۔ علاوہ ازیں، استغاثہ کے گواہ غفور احمد نے اپنے جس ہیرے دوست مشکور حسین کا تذکرہ کیا تھا اسے ابھی تک عدالت میں پیش نہیں کیا گیا۔''

میں نے حقارت آمیز نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا، پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کبھی بھی اس کردار کو عدالت کے روبرو نہیں لائے گا کیونکہ مشکور حسین نامی شخص ایک فرضی کردار ہے جس کی ''نقاب کشائی'' بھلا کیسے ممکن ہو سکتی ہے؟''

میں نے جوشِ جذبات میں کچھ تیر، کچھ تکے بھی اپنے بیان میں شامل کر لئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ میری کسی بھی بات کو چیلنج نہیں کیا جائے گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔ استغاثہ کی تو لگتا تھا، جیسے میّا مر گئی ہو۔

میں نے اپنے دلائل کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! اس کے بعد استغاثہ کے سب سے اہم گواہ عبدالکریم کی باری آتی ہے۔ موصوف نے بھی اپنے ''ہم عصروں'' اور بھائی بندوں کی طرح بیان میں وافر مقدار میں دروغ کی شمولیت کو ضروری خیال کیا ہے۔ گواہ نے نظریۂ ضرورت کے تحت ازاں بعد اپنے بیان میں اچھا خاصا اضافہ کیا ہے۔ اس کا ابتدائی بیان اگر

میرے موکل کی حمایت میں نہیں تو اس کی مخالفت میں بھی نہیں جاتا تاہم بیان میں کیا جانے والا ''اضافہ'' سراسر ''ملزم دشمنی'' کی کہانی سناتا ہے۔

''جناب عالی! کہتے ہیں، چالاک سے چالاک مجرم بھی کوئی نہ کوئی ایسی غلطی ضرور کرتا ہے جس سے وہ قانون کی گرفت میں آسکتا ہے۔ کسی شخص کو بے گناہ یا مجرم قرار دینا تو معزز عدالت کا کام ہے تاہم میں یہ ضرور کہوں گا کہ استغاثہ کے گواہ عبدالکریم نے میرے موکل کو پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے سلسلے میں جو بھی کوشش کی ہے وہ خود اسی کے لئے مصیبت کا باعث بننے والی ہے۔''

میں نے وکیل استغاثہ کی جانب تپانے والی نظر سے دیکھا اور اپنے دلائل کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! استغاثہ کا گواہ عبدالکریم اس بات کا اقرار کر چکا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ تک مقتولہ کے فلیٹ کے اندر موجود رہا تھا اور پھر واپس آکر اس نے بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ وہاں عالیہ رحمٰن ایک کرسی پر بندھی مردہ حالت میں موجود ہے اور فلیٹ کے تمام کمروں کا سامان الٹ کر رکھ دیا گیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ڈکیتی کی واردات کی گئی ہے۔

جناب عالی! صرف پانچ منٹ میں اس سے زیادہ کام بھی کیا جاسکتا ہے، میری مراد ایسے کام سے ہے جس کا تعلق مشاہدے سے ہو لیکن ایک کم عقل سے کم عقل انسان بھی یہ بات جانتا ہے کہ مشاہدے کے انسان کا دیکھنا نہایت ضروری ہے اور......'' میں نے ڈرامائی انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ کر وکیل استغاثہ کو دیکھا اور بات آگے بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔

''اور جناب عالی! میڈیکل سائنس اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ انسانی آنکھ کو دیکھنے کے لئے روشنی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس تناظر میں یہ کیسے ممکن ہے کہ بند فلیٹ میں رات کے دس گیارہ بجے گھپ اندھیرے کی موجودگی میں صرف تین سے پانچ منٹ میں گواہ عبدالکریم نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جس کی تفصیل اس نے واپس جا کر ظہیر خان اور نفیس احمد کو سنائی۔ کیا گواہ اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے یا مقتولہ کے فلیٹ میں اترنے سے پہلے اس نے اینٹی ڈارکنس لینس لگا لئے تھے؟''

عدالت کے کمرے میں سناٹے کا راج تھا۔ میرے سنسنی خیز انکشاف نے حاضرین عدالت کے ساتھ ساتھ وکیل استغاثہ کو بھی ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ میں نے اس گمبھیر خاموشی کو اپنی برق صفت آواز سے مجروح کرتے ہوئے جج سے کہا۔

''جناب عالی! اس بات کی تصدیق اس کیس کے انکوائری آفیسر صاحب کر چکے ہیں کہ جب وہ تالا توڑ کر مقتولہ کے فلیٹ میں داخل ہوئے تو انہیں وہاں کچھ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ چنانچہ فلیٹ کا اندرونی جائزہ لینے کے لئے انہوں نے تمام لائٹس روشن کر دی تھیں۔ علاوہ ازیں گواہ عبدالکریم میری جرح کے جواب میں اقرار کر چکا ہے کہ اس نے مقتولہ کے فلیٹ میں ''چند منٹ'' موجودگی کے

دوران میں کسی قسم کا کوئی تکنیکی یا دستی کام نہیں کیا تھا۔ اس نے صرف اپنی آنکھوں کا استعمال کیا تھا۔'' اس کے بعد میرا لہجہ طنز کا رنگ اختیار کرتا چلا گیا۔ میں نے کہا۔

''جناب عالی! میری تجویز تو یہ ہے کہ کسی ماہر آئی سرجن کو بلوا کر گواہ عبدالکریم کی آنکھوں کا معائنہ ضرور کرانا چاہئے۔ ذرا معلوم تو ہو، یہ اللہ کا بندہ کس طرح گھپ اندھیرے میں ''بصری کرتب بازی'' کا مظاہرہ کر لیتا ہے اور صرف تین منٹ میں گھٹا ٹوپ اندھیرے کی موجودگی میں پورے فلیٹ کا تفصیلی احوال اس پر منکشف ہو جاتا ہے۔''

جج نے سوالیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ اس نئی صورت حال کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟''

وکیل استغاثہ ''میں...... میں...... میں......'' کر کے رہ گیا خفت آمیز نظر سے جج کو دیکھنے لگا۔

میں نے اس موقع پر اپنے موکل کے حق میں دلائل کو اختتامی شکل دیتے ہوئے کہا۔

''جناب عالی! ان حالات و واقعات کی روشنی میں اگر دیانت داری سے غور کیا جائے تو میرا موکل بے گناہ اور مظلوم دکھائی دیتا ہے۔ اسے قربانی کا بکرا بنانے کے لئے اس کا ہوٹل کارڈ کسی ''ٹرمپ کارڈ'' کے طور پر استعمال کیا گیا ہے حالانکہ میرا موکل تو وقوعہ کے روز خصوصاً مقتولہ کی موت کے وقت ایک ایسی جگہ موجود تھا جو جائے وقوعہ سے پندرہ بیس کلومیٹر دور ہوگی اور مذکورہ مقام پر اس کی موجودگی کے چار گواہ اس وقت عدالت کے کمرے میں موجود ہیں۔''

اس کے بعد میں نے صفائی کے چار گواہوں کے نام اور پیشے گنوا دیئے۔ واقعات کے مطابق آٹھ جنوری بروز جمعرات کی رات میرا موکل اپنے چاروں دوستوں نعیم اختر، طارق محمود، اللہ دتا اور معروف حسین کے ساتھ پوری رات تاش کھیلتا رہا تھا۔ یہ پانچوں افراد معروف حسین کے کوارٹر میں جمع تھے جو ڈرگ کالونی میں واقع تھا۔

اس تبدیل شدہ صورت حال نے کیس کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اپنے موکل شمشاد علی کی باعزت رہائی کا شافی و کافی بندوبست کر دیا تھا۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا لہٰذا جج نے فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

☆☆☆

آئندہ پیشی پر جج نے میرے موکل شمشاد علی کو باعزت رہا کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی انکوائری آفیسر کو تاکید کی کہ وہ استغاثہ کے گواہان عبدالکریم اور غفور احمد کو شامل تفتیش کر کے نیا چالان عدالت میں پیش کرے۔ اس کے علاوہ جج نے متعلقہ عدالتی عملے کو بھی خصوصی ہدایات جاری کر دیں۔

جب پولیس والے کسی ''کنسرن پرسن'' پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں تو پھر اس کی زبان کھلوانے کے لئے ان کے پاس زنبور، پلاس، پانے اور دیگر اوزاروں کی کوئی کمی نہیں ہوتی۔

پولیس کسٹڈی میں غفور اور عبدالکریم نے اقرارِ جرم کرلیا۔تفصیلات کے مطابق غفور احمد نے شمشاد علی سے انتقام لینے کے لئے عبدالکریم سے گٹھ جوڑ کرلیا تھا چونکہ وہ دونوں ایک ہی باورچی برادری سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان میں معقول ''انڈر اسٹینڈنگ'' ہوگئی۔وقوعہ کے روز ظہیر خان اپنی فیملی کے ساتھ حیدرآباد گیا ہوا تھا اور انہیں رات کو واپس بھی نہیں آنا تھا۔اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اس رات اپنے منصوبے کو تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کرلیا۔

غفور احمد، عبدالکریم کے پاس آگیا۔پھر جب مقتولہ عالیہ رحمٰن اپنے معمول کے مطابق رات دس بجے گاڑی لے کر فلیٹ سے نکلی تو اس سے فائدہ اٹھا کر عبدالکریم نے ''ونڈوز سسٹم'' کے ذریعے غفور کو مقتولہ کے فلیٹ میں پہنچا دیا اور وہ وہاں چھپ کر مقتولہ کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

پھر جب عالیہ رحمٰن نے واپس اپنے فلیٹ میں پہنچ کر دروازے کو لاک کردیا تو غفور نے اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔گن پوائنٹ پر اس نے مقتولہ سے سب کچھ معلوم کرلیا کہ زیورات، نقدی اور دیگر قیمتی اشیاء کہاں کہاں رکھی ہیں۔اس کے باوجود بھی اس نے اپنے طور پر بعض جگہوں کی تلاشی لی اور چیزوں کو الٹ پلٹ کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ وہاں زبردست ڈکیتی کی واردات ہوئی ہے۔اس کام سے فارغ ہو کر اس نے پستول کی نال پر مقتولہ کو کرسی پر باندھا اور آخر میں ایک کپڑے کی مدد سے اس کا گلا گھونٹ کر اسے فنا کے گھاٹ اتار دیا۔

وہ واپس ظہیر خان والے فلیٹ پر پہنچا اور لوٹ کے مال کو انہوں نے مناسب شرح سے آپس میں تقسیم کرلیا پھر غفور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

مقتولہ کے فلیٹ سے نکلنے سے پہلے کرسی پر بندھی ہوئی عالیہ رحمٰن کے نزدیک ہی اس نے ملزم کا ہوٹل کارڈ بھی ڈال دیا جو اس نے ایک جیب کترے کی ''خدمات'' حاصل کر کے حاصل کیا تھا تا کہ پولیس سب سے پہلے شمشاد علی کی جانب رخ کرے اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔

اس طرح چند کج بختوں کی یہ کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی جس میں سمجھنے والوں کے لئے عبرت کے ہزاروں اسباق پنہاں تھے۔کسی نے سچ کہا ہے، یہ دنیا ''عبرت سرائے دہر'' ہے۔

✻☆✻

بازگشت

وہ ماہِ اگست کی ایک خوشگوار شام تھی۔

موسم برسات تو کراچی میں کبھی کبھار ہی دیکھنے کو ملتا ہے تاہم ساون کے آخری دنوں میں اِکا دُکا بارشیں ہو جاتی ہیں۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض دفعہ یہ دورانیہ بغیر بارش ہی کے گزر جاتا ہے۔تین چار سال کے بعد کبھی کھل کر بارش ہو جائے تو گلیاں اور سڑکیں ندی نالوں کا منظر پیش کرنے لگتی ہیں۔سینکڑوں افراد کی خانگی زندگی درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہے تو روزگار الگ متاثر ہوتا ہے۔بہرحال، قدرت کے کاموں میں کسی کو دخل نہیں۔

میں روزمرہ کی عدالتی مصروفیات سے فارغ ہو کر اپنے دفتر کی جانب بڑھا تو ہلکی بوندا باندی جاری تھی لیکن جب میں نے دفتر میں قدم رکھا تو یہ سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔اس روز دفتر میں زیادہ رش بھی نہیں تھا۔میں اپنی سیکرٹری کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے چیمبر میں داخل ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد سیکرٹری نے انٹرکام پر بتایا۔''سر! کوئی فاروق صاحب کافی دیر سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔''کیا تم ان کا ذکر کر رہی ہو جو نیلی شرٹ میں ہیں؟''

''جی سر وہی۔''سیکرٹری جلدی سے بولی۔''کیا میں انہیں آپ کے پاس بھیج دوں؟''

''ہاں، بھیج دو۔''میں نے یہ کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

جب میں اپنے کمرے کی جانب آ رہا تھا تو انتظارگاہ میں تین افراد موجود تھے جن میں سے دو افراد کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ان کے مقدمات میرے ہاتھ میں تھے اور وہ کافی دنوں سے آجا رہے تھے۔تاہم تیسرا شخص پہلی مرتبہ مجھے نظر آیا تھا۔مذکورہ شخص نے نیلے رنگ کی شرٹ زیب تن کر رکھی تھی اسی لئے میں نے سیکرٹری سے بات کرتے ہوئے شرٹ کا حوالہ دیا تھا۔

چند لمحات کے بعد وہ شخص میرے چیمبر میں داخل ہوا اس نے سلام کے بعد بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔جواباً میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔وہ میری میز کے سامنے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

میں نے پہلی نظر میں اس کی عمر کا اندازہ انتیس تیس کے قریب لگایا جو ازاں بعد درست ثابت ہوا۔وہ عام سی شکل وصورت کا مالک ایک صحت مند شخص تھا۔نیلی شرٹ کے ساتھ اس نے سیاہ

جیسے اندر سے وہ بہت بے چین ہو۔
رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے اس کی آمد کی غرض و غایت جاننا چاہی تو اس نے ایک عجیب سوال کیا۔
''وکیل صاحب! آپ کس قسم کے وکیل ہیں؟''
اس کے سوال میں ایک ناقابل بیان قسم کی معصومیت پائی جاتی تھی۔ جواباً میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے اس سے پوچھ لیا۔ ''کیا وکیلوں کی بھی اقسام ہوتی ہیں؟''
میرے سوال پر وہ تھوڑا جھینپا اور جلدی سے بولا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا وکیل صاحب!'' اس کے ساتھ ہی وہ ندامت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے اپنے لہجے میں مصنوعی سختی بھرتے ہوئے کہا۔ ''پھر کیا مطلب تھا آپ کا؟''
''وہ...... وہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ آپ کس قسم کے مقدمے لڑتے ہیں؟''
''میں ہر قسم کے مقدمے لڑ سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ کسی مقدمے کے سلسلے میں میرے پاس آئے ہیں؟''
''ابھی میں کسی فیصلے تک نہیں پہنچ سکا ہوں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔
اس کے الجھن زدہ انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کسی بڑی پریشانی میں گرفتار ہے۔ ابتدائی علیک سلیک کے دوران میں اس نے اپنا نام فاروق احمد بتایا تھا۔ میری سیکرٹری نے بھی اس کا یہی نام بتایا تھا۔
میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کیا۔ ''فاروق صاحب! آپ کس نوعیت کے فیصلے تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں؟''
''یہی کہ مقدمہ کروں یا نہ کروں؟''
''آپ کس پر مقدمہ کرنا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کیوں...... آخر آپ کس مسئلے سے دوچار ہیں؟''
وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میرا مسئلہ یہ ہے جناب کہ میں بے روزگار ہوں یعنی مجھے بے روزگار کر دیا گیا ہے۔ یہ کام توفیق علی نے کیا ہے۔''
''یہ توفیق علی کون صاحب ہیں؟'' میں نے پوچھا۔
''توفیق علی میرے باس کا نام ہے۔'' فاروق نے بتایا۔ ''اس نے مجھے نوکری سے نکال دیا ہے۔ میں اسی کے خلاف مقدمہ کرنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔''
''میں آپ کے اور آپ کے باس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''نہ ہی مجھے یہ معلوم ہے کہ توفیق نے آپ کو نوکری سے کیوں نکالا ہے۔ اس

صورت حال میں، میں آپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں؟''
''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔'' وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔
میرے استفسار پر اس نے جو کچھ بتایا اس کا خلاصہ کچھ یوں تھا۔ فاروق احمد ایک ٹریڈنگ کمپنی میں بحیثیت آؤٹ ڈور کلرک کام کرتا تھا۔ مذکورہ ٹریڈنگ کمپنی امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار کرتی تھی۔ فاروق اس کمپنی میں تین سال سے کام کر رہا تھا اور اب اچانک اس کے باس نے اسے نوکری سے نکال دیا تھا۔ میں نے فاروق سے پوچھا کہ اسے کس بنا پر برطرف کیا گیا ہے تو اس نے بتایا کہ اس کے باس نے اس کی جگہ کسی اور شخص کو ملازمت دے دی ہے۔
فاروق کی بپتا سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا ہو۔ اسے جس ٹریڈنگ کمپنی سے نکالا گیا تھا وہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا۔ پرائیویٹ اداروں میں شب و روز ملازمتیں آتی جاتی رہتی ہیں۔ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اداروں کے مالکان کے پاس ہزاروں ایسے جواز موجود ہوتے ہیں جن کی بنا پر وہ اپنے ورکرز کو کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دیتے ہیں۔ پرائیویٹ مالکان کے خلاف مقدمے بازی سے ورکرز کو عموماً کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ وہ اپنا پیسہ اور وقت ضرور برباد کرتے ہیں۔ اچھے اداروں کا یہ دستور ہوتا ہے کہ وہ اگر خود کسی ملازم کو فارغ کر رہے ہوں تو اسے ایک ماہ کی تنخواہ ضرور دیتے ہیں، ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض ملٹی نیشنل کمپنیز میں کچھ اصول و قواعد ہوتے ہیں۔ وہاں ملازمین کو زیادہ متاثر نہیں ہونا پڑتا۔
میں نے فاروق کی پوری کہانی سننے کے بعد کہا۔ ''فاروق صاحب! آپ کے مسئلے کے حل کے لئے میں آپ کو صرف ایک مشورہ دے سکتا ہوں...... اور وہ بھی بالکل مفت!''
''وہ کیا وکیل صاحب؟'' وہ امید بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔
میں نے کہا۔ ''آپ اپنی سابق نوکری اور باس کو ذہن سے جھٹک کر کوئی نئی نوکری تلاش کر لیں۔''
''گویا آپ میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے؟'' وہ مایوسی سے بولا۔
''ان حالات میں، میں آپ کے لئے واقعی کچھ نہیں کر سکتا۔'' میں نے صاف الفاظ میں کہا۔
''میں کیا، بلکہ کوئی بھی شخص آپ کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازم تھے۔ اس کمپنی نے آپ کے ساتھ کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہیں کر رکھا تھا جس کی رو سے آپ کو کچھ تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔ آپ کی پوزیشن بہت کمزور ہے۔ کمپنی کو آپ کی خدمات کی ضرورت نہیں رہی، اس نے آپ کو برطرف کر دیا۔ خوامخواہ کی مقدمے بازی میں پڑ کر اپنی جان ہلکان نہ کریں تو اچھا ہے۔ آگے آپ کی مرضی ہے۔''
فاروق نے کچھ اس انداز سے مجھے دیکھا جیسے اسے توقع نہ ہو کہ میں اسے اس قسم کا جواب دوں گا۔ شاید وہ یہ سوچ کر میرے پاس آیا تھا کہ میں توفیق علی کے خلاف فوراً اس کی مدد پر کمربستہ ہو

جاؤں گا۔ جب میں اس کی توقع پر پورا نہیں اترا تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ٹھیک ہے وکیل صاحب!'' وہ کرسی چھوڑتے ہوئے بولا۔ ''لگتا ہے، میرا کیس آپ کی سمجھ ہی میں نہیں آیا۔''

''ہاں، یہی سمجھ لیں۔'' میں نے جان چھڑانے والے انداز میں کہا۔

وہ ''خدا حافظ'' کہہ کر میرے دفتر سے نکل گیا۔

میں فاروق نامی اس شخص کو ذہن سے جھٹک کر اپنے دوسرے موکلوں کو اٹینڈ کرنے لگا۔ کبھی کبھار فاروق جیسے لوگ بھی میرے پاس آجاتے ہیں جن کو میں یہی مشورہ دیتا ہوں کہ وہ مقدمے بازی کا خیال دل سے نکال دیں۔ لیکن میں نے عموماً یہی دیکھا ہے کہ وہ میری بات کا اثر قبول کرنے کی بجائے دوسرے وکیلوں سے رابطہ کرتے ہیں اور بالآخر کہیں نہ کہیں پھنس ہی جاتے ہیں۔

جس طرح ہمارے ملک کے ہر محکمے اور ہر محکمے کے ہر شعبے میں کالی بھیڑیں موجود ہوتی ہیں اسی طرح ہمارے پیشے سے وابستہ کچھ ایسے وکیل بھی ہیں جو جائز ناجائز کی تفریق کے بغیر ہر قسم کا کیس لے لیتے ہیں۔ وہ موکل کو گائیڈ کرنے کی بجائے مس گائیڈ کرتے ہیں۔ حتیٰ الوسع ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ جو شخص چل کر ان کے پاس آگیا ہے وہ اسے ''خالی'' نہ جانے دیں۔ چاہے اسے جھوٹی امید ہی دلانا پڑے، وہ اس سے کچھ نہ کچھ ضرور اینٹھ لیتے ہیں۔ میں نے ہمیشہ اپنے موکلوں کو راست مشورہ دینے کی کوشش کی ہے۔ کیا کہیں، دنیا میں ہر طرح کے افراد پائے جاتے ہیں۔

اس واقعے کے چند روز بعد میری گھریلو ملازمہ صابرہ نے ایک صبح مجھ سے کہا۔ ''صاحب جی! آپ سے ایک کام ہے۔''

میں سمجھا، شاید وہ تنخواہ میں اضافے کی بات کرنا چاہتی ہے۔ ''ہاں ہاں، کہو۔'' میں نے اس کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔ ''کام قانونی نوعیت کا ہے صاحب جی۔''

''بھئی، تمہیں ایسا کون سا کام پڑ گیا؟''

''یہ کام میرا نہیں ہے صاحب جی۔''

''پھر کس کا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کل میری بہن عابدہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔'' صابرہ نے بتایا۔ ''کام اس کی پڑوسن کا ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''تمہاری بہن عابدہ محمود آباد میں رہتی ہے نا؟''

''جی، جی...... وہی......'' وہ جلدی سے بولی۔ ''عابدہ کی پڑوسن کسی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ عابدہ نے بتایا تھا کہ اسے کسی قسم کی قانونی مدد کی ضرورت ہے۔''

''اس وقت تو میں عدالت جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایسا کرو، اپنی بہن عابدہ سے کہو وہ

اپنی پڑوسن کو میرے دفتر بھیج دے۔ میں اس کا مسئلہ سن لوں گا پھر جو کچھ بھی ممکن ہو سکا، میں اس کے لئے ضرور کروں گا۔''

صابرہ نے میرا شکریہ ادا کیا اور گھریلو کام میں مصروف ہو گئی۔

اس روز جب میں اپنے دفتر پہنچا تو صابرہ کے توسط سے آنے والی ایک عورت میرے دفتر میں موجود تھی۔ یہ وہی عورت تھی جسے صابرہ کی بہن عابدہ اپنے ساتھ لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اس عورت کا نام کلثوم تھا۔ میں نے انہیں فوراً اپنے کمرے میں بلا لیا۔

کلثوم کی عمر لگ بھگ پچاس سال رہی ہو گی۔ اس نے پھول دار سوٹ پہن رکھا تھا۔ عابدہ سے میں پہلے بھی دو تین مرتبہ مل چکا تھا۔ اس نے مجھے سلام کیا پھر کلثوم کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

''وکیل صاحب! کلثوم میری بہت اچھی پڑوسن ہے لیکن بے چاری ایک مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ بیٹھے بٹھائے ایک آفت اس کے سر آن پڑی ہے۔''

''آخر ہوا کیا ہے؟'' میں نے سنجیدہ لہجے میں دریافت کیا۔

عابدہ نے بتایا۔ ''کلثوم کے اکلوتے بیٹے کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔''

''کس جرم میں؟'' اس مرتبہ میں نے براہِ راست کلثوم سے سوال کیا۔

وہ روہانسی آواز میں بولی۔ ''فاروق پر قتل کا الزام ہے۔''

''فاروق آپ کے بیٹے کا نام ہے؟''

''جی وکیل صاحب۔'' اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''فاروق احمد میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ فاروق کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں۔ ہمارا کل خاندان ہم دونوں ماں بیٹا ہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے بتایا ہے کہ آپ کے بیٹے کو قتل کے الزام میں گرفتار کیا گیا ہے۔ فاروق نے کس کو قتل کیا ہے؟''

''میرے بیٹے نے کسی کو قتل نہیں کیا وکیل صاحب!'' وہ تڑپ کر بولی۔ ''فاروق کسی بھی صورت میں قتل جیسا جرم نہیں کر سکتا۔ پولیس نے خوامخواہ اسے گرفتار کر لیا ہے۔ مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے۔''

میں نے قدرے ہمدردی سے پوچھا۔ ''خاتون! فاروق پر کس کو قتل کرنے کا الزام ہے؟''

''پولیس کا کہنا ہے کہ اس نے اپنے مالک کو قتل کیا ہے۔''

''مالک کو؟'' میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''مالک...... یعنی کمپنی کے باس کو۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''فاروق کے باس کا نام توفیق علی تھا۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''کہیں یہ

توفیق علی وہی شخص تو نہیں جو ایک ٹریڈنگ کمپنی کا مالک تھا، امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرتا تھا؟''

''جی ہاں بالکل...... یہ وہی شخص ہے۔'' کلثوم نے تصدیق کی۔ پھر پوچھا۔ ''کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟''

''غائبانہ طور پر۔'' میں نے کہا۔ ''فاروق نے ہی توفیق علی کے بارے میں بتایا تھا۔''

''کیا فاروق پہلے بھی آپ سے مل چکا ہے؟'' کلثوم نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ''چند روز پہلے وہ میرے پاس آیا تھا جب توفیق نے اسے نوکری سے نکالا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا اور توفیق علی کے رویے کے جواب میں وہ اس پر مقدمہ دائر کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے سمجھا بجھا کر یہاں سے رخصت کر دیا تھا۔''

''ہاں، فاروق نوکری سے نکالے جانے کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔'' کلثوم نے بھرائی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''کہہ تو رہا تھا کہ کسی وکیل سے مشورہ کرے گا۔ پتہ نہیں اسے کس کی نظر لگ گئی ہے۔ پہلے نوکری چھوٹی پھر قتل کے الزام میں گرفتار ہو گیا۔ فاروق میرا واحد سہارا تھا۔ میں کیا کروں، کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی وہ آنسو بہانے لگی۔ بعض اوقات میری آنکھوں کو ایسے جذباتی مناظر بھی دیکھنا پڑتے ہیں۔ یہ بھی ایک اتفاق ہی تھا کہ پہلے فاروق خود مجھ سے قانونی مدد حاصل کرنے آیا اور اب اس کی ماں میرے سامنے بیٹھی تھی۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جب توفیق علی نے فاروق احمد کو نوکری سے نکال دیا تھا تو پھر اس پر اپنے باس کے قتل کا الزام کیسے آ گیا؟ آیا وہ دوبارہ توفیق سے ملنے گیا تھا؟''

ان سوالات کے جوابات حاصل کرنے کے لئے میں نے کلثوم سے استفسار کیا۔ ''کلثوم صاحبہ! میری معلومات کے مطابق اس ماہ کی بیس تاریخ کو فاروق کو نوکری سے نکالا گیا تھا۔ یہ توفیق علی کے قتل والا واقعہ کب پیش آیا ہے؟''

''یہ دو روز پہلے کی بات ہے۔''

''آج ستائیس تاریخ ہے۔'' میں نے ٹیبل کیلنڈر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ پچیس تاریخ کو توفیق کے قتل کا واقعہ پیش آیا تھا؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ ''آپ کا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔ اسی روز ہی فاروق کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔''

''ایک بات تو بتائیں محترمہ کلثوم صاحبہ!'' میں نے سنجیدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا فاروق دوبارہ اپنی کمپنی کے دفتر گیا تھا؟''

یہ بات وہ مجھے پہلے بتا چکی تھی کہ توفیق علی کو اس کے دفتر میں قتل کیا گیا تھا۔ میرے سوال کے جواب میں کلثوم نے بتایا۔ ''میں نے فاروق کو بہت کریدا ہے مگر وہ کوئی واضح جواب نہیں دیتا۔ لیکن

پولیس کا کہنا یہ ہے کہ فاروق پچیس تاریخ کو سہ پہر کے وقت کمپنی کے دفتر میں اپنے باس توفیق علی سے ملنے گیا تھا۔''

''فاروق کو کہاں سے گرفتار کیا گیا ہے؟''

''اپنے گھر سے۔'' کلثوم نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے فاروق کو کس وقت گرفتار کیا تھا؟''

''شام کے وقت۔'' کلثوم نے بتایا۔ ''وہ اس وقت چائے پی رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی باہر سے آیا تھا۔ اس نے آتے ہی مجھ سے فرمائش کی کہ امی چائے کی سخت طلب محسوس ہو رہی ہے، ایک کپ چائے پلا دیں۔ میں نے جلدی سے اس کے لئے چائے تیار کر دی۔ اس دوران میں وہ ہاتھ منہ دھو کر فارغ ہو چکا تھا۔ مگر جیسے ہی اس نے چائے پینا شروع کی، پولیس والے آن دھمکے اور اسے توفیق علی کے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔ میں روتی ہی رہ گئی۔ میں نے پولیس والوں کی بہت منت سماجت کی مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی اور فاروق کو گرفتار کر لیا۔''

اس کا طویل مکالمہ ختم ہوا تو میں نے پوچھا۔ ''پولیس نے فاروق کو کتنے بجے گرفتار کیا تھا؟''

''میرا خیال ہے اس وقت شام کے سات یا ساڑھے سات بجے ہوں گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''اس وقت فاروق کہاں ہے؟''

''وہ پولیس کی تحویل میں ہے۔''

''گویا وہ ریمانڈ پر ہے؟''

''جی ہاں......'' کلثوم نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''پولیس نے چھبیس تاریخ کو فاروق کو عدالت میں پیش کر کے اس کا سات یوم کا ریمانڈ حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت وہ متعلقہ تھانے کی حوالات میں پولیس کسٹڈی میں ہے۔''

میں نے اچانک پوچھا۔ ''کلثوم صاحبہ! آپ نے کہاں تک تعلیم حاصل کر رکھی ہے؟''

وہ میرے سوال کا مطلب سمجھ گئی۔ بولی۔ ''میں نے بھلے وقتوں میں میٹرک کیا تھا۔''

میں نے یہ سوال اس لئے کیا تھا کہ وہ اپنی باتوں اور الفاظ کے استعمال سے تعلیم یافتہ لگتی تھی۔

میں نے چند لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔ ''کیا آپ نے تھانے جا کر فاروق سے ملاقات کی ہے؟''

''میں اس سے ملنے کل شام کو تھانے گئی تھی۔'' اس نے بتایا۔ ''مگر مجھے فاروق سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے اصرار کیا تو مجھے بتایا کہ ریمانڈ پر ملزم سے کسی کو ملنے نہیں دیا جاتا۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے، عدالت میں جا کر کہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کہا تھا کہ آپ کے بیٹے کو کسی سازش کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ کیا آپ اس سلسلے میں کچھ بتائیں گی؟''

"میں سمجھی نہیں وکیل صاحب!" اس نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا۔

میں نے وضاحتی انداز میں کہا۔ "میرا مطلب ہے، آپ کے خیال میں کون فاروق کے خلاف سازش کرسکتا ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔"

"کوئی اندازہ تو ہوگا آپ کو؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر ہوں جناب! البتہ یہ بات میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ فاروق نے قتل نہیں کیا۔ وہ اس حد تک کسی بھی صورت نہیں جا سکتا۔ اسے تو بہت کم غصہ آیا ہے اور وہ لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والا انسان ہے، پھر توفیق علی سے اس کی ایسی کوئی دشمنی بھی نہیں تھی جو وہ اپنے باس کے خون میں ہاتھ رنگ بیٹھتا۔"

میں نے ایک واضح امکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "کلثوم صاحبہ! اس ماہ کی بیس تاریخ کو مقتول توفیق علی نے ملزم یعنی آپ کے بیٹے کو نوکری سے نکال دیا تھا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ وہ اس طرح بے روزگار کئے جانے پر......"

"یہ ناممکن ہے۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے تیقن سے بولی۔ "میں نے بتایا ہے نا وکیل صاحب! فاروق دنگے فساد سے دور رہنے والا انسان ہے۔ وہ اس انداز میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ ہاں، یہ ہے کہ جب اسے نوکری سے نکالا گیا تھا تو اس روز وہ خاصا الجھا ہوا اور پریشان رہا تھا۔ مگر دوسرے روز سے وہ کسی نئی ملازمت کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ شاید اسی روز وہ آپ سے بھی ملا تھا۔"

دنیا کی ہر ماں اپنے بیٹے کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتی ہے۔ مامتا کی نظر میں اس کی اولاد کبھی غلط ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے اس سلسلے میں کلثوم کو زیادہ کریدنے سے گریز کیا اور ذرا مختلف انداز میں سوال کیا۔

"کلثوم صاحبہ! ذرا سوچ کر بتائیں، فاروق سے کسی شخص کی کوئی دشمنی وغیرہ تو نہیں تھی؟"

چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے نفی میں جواب دیا۔ "جہاں تک میں جانتی ہوں آج تک فاروق کا کسی شخص سے جھگڑا نہیں ہوا۔ درپردہ کوئی دشمن ہو تو میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

میں نے کہا۔ "اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ فاروق نے اپنے باس توفیق کو قتل نہیں کیا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پولیس نے فاروق کو اس قتل کے الزام میں گرفتار کیوں کیا؟ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر فاروق بے گناہ ہے تو پھر صریحاً کوئی اس سے دشمنی کررہا ہے۔"

"میں جتنا جانتی تھی، وہ آپ کو بتا چکی ہوں وکیل صاحب۔" کلثوم نے بے بسی سے دونوں ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ فاروق سے ایک بار مل لیں تو ممکن ہے، کوئی اہم بات سامنے آجائے۔"

"فاروق سے تو میں ضرور ملوں گا۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جب تک مجھے چند اہم سوالات کے جواب نہیں مل جاتے، میں اس کیس میں ہاتھ نہیں ڈالوں گا۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا۔ "کیا فاروق شادی شدہ ہے؟"

"نہیں، ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی۔" کلثوم نے جواب دیا پھر پوچھا۔ "آپ نے یہ سوال کیوں کیا وکیل صاحب؟"

سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے بے ساختہ وہ سوال پوچھا تھا۔ اس کے پیچھے میرے کسی شعوری ارادے کا ہاتھ نہیں تھا۔ کلثوم کے سوال کا جواب دینا بھی ضروری تھا چنانچہ میں نے سرسری انداز میں کہا۔

"کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ بس ایسے ہی پوچھ لیا تھا۔ فاروق ماشاء اللہ شادی کی عمر کو پہنچ چکا ہے۔ بلکہ شادی کی بہتری عمر تو گزرتی چلی جارہی ہے۔"

کلثوم نے کہا۔ "میں تو اسے بہت سمجھاتی ہوں۔ کئی لڑکیوں پر میری گہری نظر تھی۔ میں نے اس سلسلے میں فاروق سے بھی پوچھا تھا مگر وہ ہر مرتبہ بہت خوبصورتی سے اس موضوع کو ٹال جاتا ہے۔ پتہ نہیں، اس نے کیا سوچ رکھا ہے۔"

تھوڑی دیر تک کلثوم سے مزید اس سلسلے میں بات ہوتی رہی۔ پھر وہ دونوں میرے دفتر سے رخصت ہوگئیں۔

اسی روز دفتر سے اٹھنے کے بعد میں فاروق سے ملنے متعلقہ تھانے پہنچ گیا۔ ایس ایچ او اس وقت تھانے میں موجود نہیں تھا۔ ایک اے ایس آئی نے میرا استقبال کیا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں حوالاتی فاروق احمد سے ملنے آیا ہوں تو وہ چوکنا ہوگیا۔

"جناب! انچارج صاحب اس وقت گشت پر گئے ہوئے ہیں۔"

"آپ تو تھانے میں موجود ہیں نا!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"ہاں، میں موجود ہوں مگر......"

"مگر کیا؟" میں نے اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی سوال کردیا۔

اس نے کہا۔ "انچارج صاحب کی اجازت کے بغیر آپ حوالاتی سے نہیں مل سکتے۔"

"میں اس کا وکیل ہوں۔" میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ "آپ مجھے میرے موکل سے ملنے سے نہیں روک سکتے۔"

وہ قدرے نرم پڑتے ہوئے بولا۔ "ملزم ریمانڈ پر ہے۔ ہم تفتیش کررہے ہیں۔ اگر آپ ملزم سے ملنا ہی چاہتے ہیں تو پھر انچارج صاحب کا انتظار کرلیں۔"

"میرا وقت اتنا فالتو نہیں ہے کہ انتظار میں ضائع کرتا رہوں۔"

"ہمارے پاس بھی فالتو وقت نہیں ہے جناب۔" اس نے رکھائی سے کہا اور خود کو مصروف ظاہر

کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

جب میں نے دیکھا کہ گھی سیدھی انگلی سے نہیں نکل پا رہا تو میں نے انگلی ٹیڑھی کرنا ضروری سمجھا۔ میں نے اے ایس آئی کو مخاطب کرتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''میں ایک فون کرنا چاہتا ہوں۔''

اس کا ایک ہاتھ بے اختیار ٹیلی فون سیٹ کے اوپر پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا اور بگڑے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''آپ کس کو فون کرنا چاہتے ہیں؟''

''ڈی آئی جی صاحب کو۔'' میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ محتاط نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ ڈی آئی جی سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں؟''

''میں جو کچھ بھی کہوں گا، آپ کے سامنے کہوں گا۔'' میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ''آپ خود اپنے کانوں سے سن لینا۔''

وہ تیر کی طرح سیدھا ہو گیا، جلدی سے بولا۔ ''آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو رہے ہیں وکیل صاحب! بس سمجھا کریں نا۔ اوپر سے بڑی سختی کی جا رہی ہے۔ ہمیں بھی کسی کو جواب دینا ہوتا ہے۔ انچارج صاحب ذرا دوسری ٹائپ کے تھانیدار ہیں۔ ماتحت عملے کی ذرا سی بھی کوتاہی برداشت نہیں کرتے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ اوپر والوں نے سختی کر رکھی ہے۔ میں اسی لئے ''اوپر'' بات کرنا چاہ رہا ہوں۔ ذرا فون کے اوپر سے ہاتھ تو ہٹائیں اے ایس آئی صاحب!''

''وکیل صاحب! معاملے کو بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' اس نے دوسرا ہاتھ بھی ٹیلی فون سیٹ پر رکھ دیا اور مصلحت آمیز لہجے میں بولا۔ ''آپ ملزم فاروق سے ملنے آئے ہیں تو ملاقات کر لیں۔ جو کچھ بھی کہنا سننا ہے، ذرا جلدی کر لیں۔ انچارج صاحب کے آنے سے پہلے پہلے۔ ورنہ وہ میری کھال کھینچ لیں گے۔''

وہ راہ راست پر آ گیا تھا۔ لہٰذا میں نے بھی اس سے زیادہ الجھنا مناسب نہ سمجھا اور ایک کانسٹیبل کی معیت میں حوالات کی جانب بڑھ گیا۔

فاروق احمد حوالات کے ٹھنڈے فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔ ''وکیل صاحب! آپ......اور یہاں؟''

''ہاں، یہ میں ہی ہوں فاروق!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''مگر آپ کو کیسے پتہ چلا کہ میں تھانے میں بند ہوں؟'' وہ ابھی تک بحرِ حیرت میں غوطہ زن تھا۔

میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''تمہارے بارے میں مجھے تمہاری والدہ کلثوم نے بتایا ہے۔''

''کیا امی آپ کے پاس گئی تھیں؟''

''ظاہر ہے۔'' میں نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔'' وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ''اور ملاقات بھی اس حالت میں!'' اس نے بات ختم کرتے ہی حوالات کے در و دیوار کو دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''قدرت نے ہر کام کا وقت مقرر کر رکھا ہے فاروق! پہلے تم قانونی مدد حاصل کرنے میرے پاس آئے تھے۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ تمہیں قانونی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اب میں تمہاری مدد کے لئے خود چل کر تمہارے پاس آ گیا ہوں۔ تمہاری والدہ نے مجھے بتایا ہے کہ تم قتل کے الزام میں یہاں بند ہو؟''

''جی ہاں، اسے میری بدقسمتی ہی سمجھ لیں۔''

''یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟''

''ایک گہری سازش کی گئی ہے میرے خلاف۔'' وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولا۔

میں نے پوچھا۔ ''سازشی کون ہے؟''

''میں ابھی تک ''متعلقہ'' شخص کے بارے میں کسی حتمی نتیجے پر نہیں پہنچا ہوں۔'' وہ متذبذب انداز میں بولا۔ ''مگر مجھے یقین ہے کہ کسی سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے قتل کے اس معاملے میں الجھایا گیا ہے۔ مجھے قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔''

''وقوعہ کے روز کیا ہوا تھا؟'' میں نے اپنے بریف کیس میں سے رائٹنگ پیڈ نکالتے ہوئے سوال کیا۔

فاروق کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ذرا فاصلے پر کھڑا کانسٹیبل بولا۔ ''وکیل صاحب! لمبی چوڑی کہانیاں رہنے دیں جناب۔ اے ایس آئی صاحب نے مجھے تاکید کی تھی کہ میں آپ کو زیادہ وقت......''

میں نے اسے جملہ مکمل کرنے نہیں دیا اور قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''جوان! تمہارا نام کیا ہے؟''

وہ میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''دوست محمد۔''

''کانسٹیبل دوست محمد!'' میں نے اسے اس کے نام سے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں بھی اپنا دوست ہی سمجھو۔''

''میں کچھ سمجھا نہیں جناب؟'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میں نے فارسی میں بات نہیں کی دوست محمد!'' میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''کیا تم نے قانون کی کوئی کتاب شتاب بھی پڑھی ہے یا خالی کانسٹیبلی پر ہی گزارہ ہے؟''

وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ''میں اکثر دفعات کی موٹی کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔''

''شاباش۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''پھر تو تم بہت کام کے بندے ہو۔''

''پتہ نہیں، آپ کیا کہہ رہے ہیں جناب!''

میں نے اس کی الجھن سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ ''دوست محمد! دفعات والی موٹی کتاب میں ایک ایسی دفعہ بھی درج ہے جس کے تحت کوئی وکیل، حوالات میں اپنے موکل کے ساتھ لمبی چوڑی کہانیاں کرسکتا ہے۔''

اس کی آنکھوں میں حیرت کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ تعجب خیز لہجے میں بولا۔ ''یہ کون سی دفعہ ہے جناب عالی؟''

میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''دفعہ پچاس، پی پی سی۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''وکیل صاحب! پاکستان پینل کوڈ (تعزیرات پاکستان) کی دفعہ پچاس تو...''

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ پاکستان پینل کوڈ نہیں بلکہ ''پبلک پرائیویٹ کمیشن'' کی دفعہ پچاس ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے پرس میں سے پچاس روپے کا ایک نوٹ نکال کر اس کی جانب بڑھا دیا اور کہا۔ ''کیا سمجھے؟''

''سمجھ گیا جناب۔'' اس نے پچاس روپے والا کرارا نوٹ میرے ہاتھ سے جھپٹتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا باہر سے ہو آؤں۔ آپ جلدی جلدی ملزم سے ''راز و نیاز'' کرلیں۔''

اپنی بات ختم کرتے ہی اس نے ایک آنکھ دبائی پھر وہاں سے جانے لگا۔

میں حوالات میں بند ملزم فاروق احمد کی جانب متوجہ ہوگیا۔

فاروق کی کتھا کہانی سننے میں مجھے ایک گھنٹہ لگ گیا۔ جب اس نے اپنی داستانِ الم ختم کی تو میں نے مختلف زاویوں سے چند سوالات کئے، پھر وکالت نامے پر اس کے دستخط لے کر تھانے سے باہر آگیا۔ جس وقت میں تھانے کی عمارت سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھ رہا تھا، تھانے سے باہر ایک کونے میں وہی کانسٹیبل مجھے دکھائی دیا جس پر میں نے دفعہ پچاس آزمائی تھی۔ وہ اپنے کسی ساتھی کانسٹیبل سے باتوں میں مصروف تھا۔ میں نے اس کو مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنی گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

اس رات میں نے دورانِ گفتگو فاروق احمد سے جو معلومات حاصل کیں، یہاں میں ان کا خلاصہ تحریر کروں گا تاکہ عدالتی کارروائی شروع ہونے سے قبل آپ بھی اس کیس کے بارے میں اپنے ذہن کو تازہ کرسکیں تاہم چند باتیں میں فی الحال آپ سے پوشیدہ رکھوں گا۔ ان کا ذکر عدالتی کارروائی کے دوران میں مناسب موقع پر کیا جائے گا۔

☆☆☆

''اسکائی ٹریڈنگ کمپنی'' کا دفتر ایم۔ اے جناح روڈ (المعروف بہ بندر روڈ) پر واقع ایک کثیر المنزلہ عمارت میں تھا۔ مذکورہ کمپنی چھوٹے پیمانے پر امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتی تھی۔ میرا موکل گزشتہ تین سال سے اس کمپنی میں بحیثیت آؤٹ ڈور کلرک کام کر رہا تھا۔

سب کچھ حسب معمول اور ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا کہ اس کمپنی میں ایک ملازم بلکہ ملازمہ کا

اضافہ ہوا۔ یہ ثوبیہ تھی۔ ثوبیہ کو توفیق علی نے اپنی سیکرٹری کے طور پر رکھا تھا۔ ثوبیہ کی عمر چھبیس اور ستائیس کے درمیان رہی ہوگی۔ وہ بھرے بھرے جسم اور تیکھے نقوش والی ایک سانولی سلونی لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت کا ایک دلکش پہلو یہ بھی تھا کہ وہ دراز قامت تھی۔ بھرے بھرے جسم کے ساتھ اس کی قامت نے اس کی شخصیت کو خاصا پُرکشش بنا دیا تھا۔ ثوبیہ سائنس گریجویٹ تھی اور اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں آنے سے پہلے بھی کئی دفاتر میں ملازمت کرچکی تھی تاہم وہ زیادہ دیر کہیں ٹکی نہیں تھی۔

ثوبیہ کی آمد نے فاروق کے دل میں گدگدی پیدا کردی۔ ثوبیہ کی ادائیں بھی ایسی تھی کہ دل کو دھڑکا جاتی تھیں۔ دفتر کا اسٹاف ثوبیہ کے حوالے سے خاصا محتاط تھا۔ وجہ صاف ظاہر ہے، ثوبیہ توفیق علی کی پرائیویٹ سیکرٹری تھی۔ کوئی اس سے ایسی ویسی بات کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔ جو لوگ دفتروں میں کام کرتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہوں گے کہ باس کی پرائیویٹ سیکرٹری کتنی طاقتور ہوتی ہے۔

فاروق احمد کے دل میں پہلے روز ہی ثوبیہ کی محبت نے گھر کرلیا تھا۔ وہ چپکے چپکے اسے چاہنے لگا۔ تاہم اس نے اپنے جذبات کا اظہار کبھی نہیں کیا تھا۔ فاروق کا یہ ضبط دو ماہ سے زیادہ قائم نہ رہ سکا اور پچھلے ماہ اس نے ثوبیہ سے اظہارِ محبت کردیا۔

اس روز اتفاق سے انہیں تنہائی میں بات کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ توفیق علی بیرون ملک سے آئے ہوئے اپنے کسی دوست کو ایئر پورٹ چھوڑنے گیا ہوا تھا۔ اس نادر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فاروق ثوبیہ کے کیبن میں جا پہنچا۔

ثوبیہ اس وقت ٹائپ رائٹر پر کوئی لیٹر ٹائپ کر رہی تھی۔ فاروق کو اپنے کیبن میں پا کر اس نے اپنا کام روک دیا اور سوالیہ نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی فرمائیں فاروق صاحب؟''

فاروق نے شیشے کے کیبن سے باہر نظر دوڑائی۔ دیگر اسٹاف اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھا۔ وہ مطمئن ہوگیا کہ اس وقت کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ فاروق کی سیکرٹری ثوبیہ کے کیبن میں آنا کوئی خاص یا غیر معمولی بات نہ تھی۔ تاہم اس وقت چونکہ وہ ایک خاص بات اس سے کہنے آیا تھا لہٰذا اسے یونہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی آمد یہاں دوسرے لوگوں کو کھٹکے گی۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہ تھی۔ انسان کے اپنے دل میں اگر چور ہو تو اسے ایسا ہی لگتا ہے جیسے ہر آنکھ اسے گھور رہی ہے۔

فاروق کو خاموش دیکھ کر ثوبیہ نے اپنا سوال دہرایا۔ ''فاروق صاحب! کیا آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے؟''

وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ''توفیق صاحب کہیں باہر گئے ہیں نا؟'' اس کا انداز تصدیق طلب تھا۔

حالانکہ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ توفیق اپنے دوست کو چھوڑنے ایئرپورٹ گیا تھا۔
ثوبیہ نے عام سے لہجے میں کہا۔ ''جی ہاں، توفیق صاحب ذرا ایئرپورٹ گئے ہیں۔''
''کب تک آجائیں گے؟''
''ایک گھنٹہ لگ جائے گا۔'' ثوبیہ نے جواب دیا۔
فاروق کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ ثوبیہ نے پوچھا۔ ''آپ کو باس سے ملنا ہو تو ایک گھنٹے بعد آجائیں۔ میں ان سے آپ کی ملاقات کروادوں گی۔''
اتنا کہہ کر وہ دوبارہ ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہوگئی۔
فاروق نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''میں باس سے نہیں، آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''
ثوبیہ نے چونک کر فاروق کو دیکھا۔ ''آپ مجھ سے کیا کہنا چاہتے ہیں؟''
''آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔'' فاروق نے اپنے لہجے میں شیرینی بھرتے ہوئے کہا۔
ثوبیہ نے بے اختیار مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تو بہت سوں کو اچھی لگتی ہوں۔''
''میں بہت سوں کی نہیں، اپنی بات کررہا ہوں۔''
''چلیں، بڑی مہربانی آپ کی۔'' ثوبیہ نے مذاق کے انداز میں کہا۔
مگر اس وقت فاروق مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے نہایت بے باک لہجے میں کہا۔
''ثوبیہ صاحبہ! آپ میری بات کو مذاق کا رنگ نہ دیں۔ میں سچ کہتا ہوں، مجھے آپ سے محبت ہوگئی ہے۔''
ثوبیہ اچانک سنجیدہ ہوگئی اور اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہو گئے۔ اس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے حواس میں تو ہیں فاروق صاحب؟''
''میں حواس میں بھی ہوں اور پوری طرح باہوش بھی ہوں۔'' فاروق نے کمال ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں واقعی آپ سے محبت کرنے لگا ہوں۔''
''اور جواباً آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں بھی آپ سے محبت کرنے لگوں!'' ثوبیہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
فاروق مسرور انداز میں بولا۔ ''اگر ایسا ہوجائے تو میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔''
''تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔'' وہ آپ سے تم پر اتر آئی۔ ''یہاں سے جاتے ہو یا تمہارا دماغ درست کرنے کا بندوبست کروں؟''
ثوبیہ کے رویے سے فاروق کو اپنی توہین کا احساس ہوا تاہم اس وقت مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ منظر سے ہٹ جائے ورنہ اس بات کا امکان تھا کہ اگر ثوبیہ اونچی آواز میں اسے لتاڑنا شروع کردیتی تو اسے بری طرح بے عزت ہونا پڑتا۔
وہ خاموشی سے ثوبیہ کے کیبن سے نکل آیا۔

آنے والے چند دنوں میں ان کے درمیان کوئی گفتگو نہ ہوئی تاہم دور ہی دور سے فاروق محبت پاش نظر سے ثوبیہ کو تکتا رہا۔ اس کے ردعمل کے طور پر ثوبیہ نے ہمیشہ ناگواری کا مظاہرہ کیا۔ پھر ایک روز اس نے فاروق سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔
اس روز توفیق علی دفتر نہیں آیا تھا۔ ثوبیہ نے فاروق کو اپنے کیبن میں بلایا۔ فاروق سمجھا کہ شاید اس کی محبت نے دوسری طرف بھی اثر ڈال ہی دیا ہے۔ وہ کشاں کشاں ثوبیہ کے کیبن میں پہنچ گیا مگر اسے خلاف توقع رویے کا سامنا کرنا پڑا۔
''بیٹھیے مسٹر فاروق!'' ثوبیہ نے ایک کرسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے رُکھائی سے کہا۔
فاروق متذبذب انداز میں بیٹھ گیا۔
ثوبیہ چند لمحے خشمگیں نظر سے اسے گھورتی رہی، پھر سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''مسٹر فاروق! آپ میں شرافت کی ذرا سی بھی جھلک موجود ہے یا نہیں؟''
''میں نے ایسا کون سا غیر شریفانہ کام کیا ہے؟'' وہ احتجاجی لہجے میں بولا۔
''کبھی آپ نے اپنے طرزِ عمل پر غور کیا؟''
''میرا طرزِ عمل مستحسن ہے۔''
''بہت خوب......'' وہ استہزائیہ انداز میں بولی۔ ''اسی کو کہتے ہیں، چوری اور سینہ زوری۔ اپنے رویے پر شرمندہ ہونے کی بجائے آپ فخر کررہے ہیں۔''
فاروق نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس پر مجھے ندامت کا احساس ہو۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں۔ میں آپ سے سچی محبت کرتا ہوں۔ آپ میری طرف سے بدگمان نہ ہوں۔ یقین کریں، ایک نہ ایک دن آپ کو میری محبت کی سچائی کو ماننا پڑے گا۔ میری چاہت کا آپ کے دل پر بھی اثر ہوگا۔ مم...... میں ثابت کردوں گا کہ میں اپنے جذبے میں کتنا صادق......''
''بس، بس۔'' ثوبیہ نے ہاتھ کے اشارے سے اسے مزید بولنے سے روک دیا اور اکتاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''میں نے بہت سن لی آپ کی یہ فضول بکواس۔''
''ثوبیہ! میری محبت کو فضول بکواس سے تعبیر نہ کرو۔''
وہ ایک مرتبہ پھر آپ سے تم پر اتر آئی۔ ''دیکھو فاروق! میں تمہاری اس قسم کی حرکتیں برداشت نہیں کرسکتی۔ آج تک تم نے جو کرلیا، سو کرلیا۔ آئندہ کبھی مجھے ایسی نظر سے نہ دیکھنا۔ مجھے تم سے یا تمہاری نام نہاد محبت سے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں ہے۔''
''میری محبت نام نہاد نہیں ہے ثوبیہ!'' وہ دکھی لہجے میں بولا۔ ''چاہو تو آزما کر دیکھ لو۔''
وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ ''میں نے کہا نا، مجھے تم سے اور تمہاری محبت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔''
فاروق کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹ کر بکھر گئی ہو۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ

کھولے ثوبیہ کو دیکھ رہا تھا۔ ثوبیہ نے تنبیہی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر فاروق! تم اسے پہلی اور آخری وارننگ سمجھ لو۔ اگر آئندہ تم نے کبھی مجھے ایسی ویسی نظر سے دیکھا یا اظہارِ محبت کرنے کی کوشش کی تو میں باس سے تمہاری شکایت کر دوں گی۔''

''اس سے تمہیں کیا فائدہ پہنچے گا؟'' فاروق نے زخمی لہجے میں پوچھا۔

ثوبیہ نے سفاکی سے کہا۔ ''باس تمہاری کھنچائی کریں گے۔''

''تمہاری محبت میں، میں ہر قسم کی رسوائی اٹھانے کو تیار ہوں۔'' فاروق نے کہا۔ ''اس سے زیادہ باس اور کیا کر سکتے ہیں۔ میں ان کے سامنے بھی یہی کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔''

''اس بیہودگی پر باس تمہیں کھڑے کھڑے نوکری سے بھی نکال سکتے ہیں۔'' ثوبیہ نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

فاروق نے دزدیدہ نظر سے ثوبیہ کو دیکھا اور اٹل لہجے میں بولا۔ ''باس مجھے نوکری سے تو نکال سکتے ہیں مگر تمہاری یاد کو میرے دل سے نہیں نکال سکتے۔ میں اس کمپنی میں رہوں یا نہ رہوں مگر تمہاری محبت ضرور میرے دل میں رہے گی۔''

''میں دیکھ لوں گی تمہیں بھی اور تمہاری ڈراما محبت کو بھی۔'' ثوبیہ نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور اب یہاں سے چلتے بنو۔ آئندہ کبھی میری راہ میں آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ بہت برا ہوگا۔''

فاروق خاموشی سے اٹھا اور ثوبیہ کے کیبن سے نکل گیا۔

آنے والے چند روز تک وہ ثوبیہ کو تسخیر کرنے کی ترکیبیں سوچتا رہا مگر اس کے ذہن میں اس مسئلے کا کوئی حل نمودار نہیں ہوا۔ وہ اسی سوچ بچار میں گم تھا کہ ایک روز اس کا دل خون ہوگیا۔ اس نے ثوبیہ کا ایک ایسا روپ دیکھا تھا کہ اس کے تن بدن میں آگ سی بھر گئی تھی۔ حسد کی آگ نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

باس توفیق علی کی رہائش نارتھ ناظم آباد میں تھی اور ثوبیہ گرومندر پر رہتی تھی۔ ایسا اکثر ہوتا تھا کہ واپسی پر ثوبیہ توفیق ہی کی گاڑی میں بیٹھ جاتی تھی اور وہ اسے گرومندر پر ڈراپ کرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ یہ بات فاروق کے علم میں بھی تھی مگر اس روز فاروق کی آنکھوں نے جو منظر دیکھا، اس کی وہ توقع نہیں کر سکتا تھا۔

فاروق آؤٹ ڈور کلرک تھا اور دن کا زیادہ تر حصہ وہ دفتر سے باہر ہی گزارتا تھا۔ ایک روز ثوبیہ دفتر نہیں آئی۔ فاروق چونکہ اس کی ٹوہ میں رہتا تھا اس لئے اس نے مختلف ذرائع سے معلوم کر لیا کہ ثوبیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اس روز اسے بخار آ گیا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سوچا کہ ثوبیہ کے گھر جا کر اس کی خیریت معلوم کرے۔ وہ ثوبیہ کا گھر پہلے ہی دیکھ چکا تھا مگر ہزار بار سوچنے کے باوجود بھی اس طرف رخ کرنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

وہ حسبِ معمول اپنی ڈیوٹی دے رہا تھا کہ اس نے طارق روڈ پر باس توفیق علی کی گاڑی میں

ثوبیہ کو دیکھا۔ وہ سہ پہر کا وقت تھا۔ ثوبیہ کو توفیق کی گاڑی میں ہشاش بشاش بیٹھے دیکھ کر اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اس کی معلومات کے مطابق ثوبیہ نے بخار کے سبب آج دفتر سے چھٹی کی تھی لیکن توفیق کی گاڑی میں اس کی موجودگی فاروق کو بہت کچھ سوچنے سمجھنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خدشہ سر اٹھا رہا تھا کہ کہیں باس توفیق اور ثوبیہ کے بیچ کوئی چکر تو نہیں چل رہا؟

ایسا سوچتے ہوئے اسے شدید کرب کا احساس ہوا۔ وہ ثوبیہ سے سچی محبت کرنے لگا تھا۔ اگرچہ وہ اسے ذرا بھی لفٹ نہیں کراتی تھی۔ ثوبیہ چاہے اسے اہمیت دے یا نہ دے مگر اسے کسی اور کے ساتھ دیکھ کر فاروق کا دل کرچی کرچی ہوگیا تھا۔ اس نے شکستہ دل کے ساتھ فیصلہ کیا کہ وہ اپنے باس کی گاڑی کا تعاقب کرے گا۔

تھوڑا فاصلہ رکھ کر اس نے ان کا پیچھا شروع کر دیا۔ توفیق علی اور ثوبیہ کا سفر بہادر آباد کے ایک فلیٹ پر جا کر ختم ہوا۔ وہ دونوں فلیٹ کے اندر داخل ہو گئے۔ جبکہ فاروق ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگا۔ یہ معمہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کا ذہن ایک ہی زاویئے پر سوچ رہا تھا کہ ثوبیہ اور باس کے درمیان کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔

لگ بھگ دو گھنٹے بعد وہ دونوں فلیٹ سے باہر آئے پھر گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ کوشش کے باوجود بھی فاروق خود کو ان کا تعاقب کرنے پر آمادہ نہ کر سکا۔ تاہم وہاں سے رخصت ہونے سے قبل اس نے یہ جاننا ضروری سمجھا کہ وہ فلیٹ کس شخص کا تھا اور وہ دونوں وہاں کس مقصد سے آئے تھے۔

جب وہ اس فلیٹ میں داخل ہوئے تھے تو فاروق نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ توفیق علی نے اپنی چابی سے فلیٹ کا دروازہ کھولا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا کہ اس وقت اس فلیٹ میں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ فاروق نے ایک ایسی جگہ چھپ کر انہیں دیکھا تھا جہاں وہ انہیں دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

تھوڑی کوشش کے بعد فاروق یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ فلیٹ اکثر ہی بند رہتا تھا۔ توفیق علی ہفتے میں تین مرتبہ وہاں کچھ وقت ''گزارتا'' تھا۔ اس بلڈنگ میں زیادہ تر فلیٹ ایسے ہی تھے۔ وہ کمرشل علاقہ تھا اور اکثر فلیٹوں میں یا تو بیچلرز رہتے تھے یا پھر وہ بند رہتے تھے۔ فاروق کو وہاں فیملی والا کوئی گھر دکھائی نہ دیا۔

وہ رات فاروق نے کانٹوں کے بستر پر گزاری۔ دوسری صبح وہ کچھ جلدی دفتر پہنچ گیا۔ اس وقت تک ثوبیہ دفتر نہیں آئی تھی۔ باس توفیق علی عموماً بارہ بجے کے بعد آتا تھا۔ فاروق کے لئے دفتر میں کوئی نشست مخصوص نہیں تھی۔ وہ کہیں بھی بیٹھ جاتا تھا۔ دفتر کا باقاعدہ کلرک وحید ابھی آیا نہیں تھا اس لئے وہ اسی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے ثوبیہ کے آنے کا انتظار تھا۔

فاروق نے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ وہ آج ثوبیہ سے اس سلسلے میں ضرور استفسار کرے گا۔

اگرچہ اسے ایسے کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا تھا لیکن دل میں لگی آگ کا کوئی نہ کوئی سد باب تو ضروری تھا ورنہ وہ آتش اسے جلا کر راکھ کر دیتی۔

جب ثوبیہ دفتر پہنچی تو فاروق کی ہمت جواب دے گئی۔ اسے اپنے ارادے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسٹاف کے لوگوں نے ثوبیہ سے خیر خیریت دریافت کی مگر فاروق خاموشی سے اٹھا اور دفتر سے نکل گیا۔ وہ دفتر کی دی ہوئی موٹر سائیکل کو دفتر ہی میں چھوڑ آیا تھا۔

کچھ دیر تک وہ یونہی بے مقصد مٹر گشت کرتا رہا، پھر ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ ایک پی سی او میں گھس گیا۔ اس نے اپنے دفتر کا نمبر ملایا اور ثوبیہ کے بولنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نمبر پر ثوبیہ ہی فون ریسیو کرتی تھی۔ باس کے دفتر پہنچنے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا اس لئے وہ جی بھر کر اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا تھا۔ روبرو بات کرنے کی بجائے اس نے فون کا سہارا لیا تھا۔ اسے فاروق کی بزدلی کہہ لیں یا مصلحت کوشی، بہر حال وہ آج ثوبیہ سے کھل کر بات کرنا چاہتا تھا۔

''ہیلو...... اسکائی ٹریڈنگ کمپنی۔'' ایئر پیس میں ثوبیہ کی مخصوص آواز سن کر فاروق الرٹ ہو گیا۔

''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' فاروق نے نہایت ہی کاٹ دار لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ کون؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''اچھا، اب آپ پہچاننے سے بھی انکار کر رہی ہیں؟''

''میں نے واقعی آپ کو پہچانا نہیں۔'' ثوبیہ نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔

ٹیلی فون پر فاروق پہلی مرتبہ ثوبیہ سے مخاطب تھا۔ ویسے بھی وہ اس وقت خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔ اس قسم کی صورتِ حال میں آواز میں تھوڑی بہت تبدیلی تو آ ہی جاتی ہے۔

فاروق نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ ''میں فاروق احمد بات کر رہا ہوں۔''

''کون فاروق احمد؟'' ثوبیہ نے پوچھا۔

''آپ کا آفس کولیگ فاروق احمد!'' فاروق نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہی فاروق جو آپ کے آفس میں آؤٹ ڈور کلرک ہے اور آپ سے شدید محبت بھی کرتا ہے۔''

دوسری جانب ثوبیہ کا موڈ آف ہو گیا۔ اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم نے فون کیوں کیا ہے؟''

''میں بتا تو چکا ہوں کہ آپ کی خیریت معلوم کرنا چاہتا ہوں۔'' فاروق نے یاد دہانی کے انداز میں کہا۔

''تم کون ہوتے ہو میری خیریت دریافت کرنے والے؟'' ثوبیہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ پھر بولی۔ ''میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہیں دفتر میں دیکھا تھا۔ تم اس وقت کہاں سے فون کر رہے ہو؟''

''ایک پی سی او سے بات کر رہا ہوں۔'' فاروق نے بتایا۔

ثوبیہ نے چوٹ کی۔ ''کیا سامنے آنے کی ہمت نہیں ہے؟''

''ہمت تو بہت ہے مگر میں احتیاط سے کام لے رہا ہوں۔''

''کیسی احتیاط؟'' ثوبیہ نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

فاروق نے کہا۔ ''اگر میں روبرو تم سے بات کروں گا تو ممکن ہے تمہیں شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔''

''میں نے ایسا کیا، کیا ہے کہ مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا؟'' ثوبیہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ بھی بتا دوں گا۔'' فاروق نے معتدل لہجے میں کہا۔ ''پہلے تمہارا حال چال تو پوچھ لوں۔''

''اگر تم نے اسی قسم کی باتیں کرنے کے لئے فون کیا ہے تو میں ریسیور رکھ رہی ہوں۔'' ثوبیہ نے کہا۔ ''کام کی کوئی بات کہنا ہو تو جلدی سے کہہ ڈالو۔''

فاروق نے کہا۔ ''تمہارا بخار اب کیسا ہے؟''

''ظاہر ہے، بخار اتر گیا ہے۔ تبھی تو دفتر آئی ہوں۔'' ثوبیہ نے عام سے انداز میں کہا۔

''کل تو تم نے پورا دن گھر ہی آرام کیا ہو گا؟'' جذبات کی شدت سے وہ طرزِ تخاطب پر قابو نہ رکھ پا رہا تھا۔ کبھی وہ ''آپ'' سے ''تم'' پر آ جاتا اور کبھی ''تم'' سے ''آپ'' پر۔

ثوبیہ نے کہا۔ ''تم میرے آرام اور بے آرامی کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ اس سلسلے میں تمہیں دماغ تھکانے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''ضرورت ہے، اسی لئے تو تمہیں فون کر رہا ہوں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں نے تمہیں کل بہت بے آرام دیکھا ہے۔ سوچا، تمہیں آئینہ ہی دکھا دوں۔''

''یہ تم کیسی بکواس کر رہے ہو؟'' ثوبیہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ ''تم نے مجھے کہاں بے آرام دیکھ لیا ہے؟''

فاروق نے کہا۔ ''کل تم بہادر آباد کے ایک فلیٹ میں باس کے ساتھ......''

''شٹ اَپ یو باسٹرڈ۔'' ثوبیہ نے ریسیور میں چیخ کر کہا اور اسے کریڈل پر پٹخ دیا۔

فاروق شکست و فتح کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ پی سی ا[illegible] سے باہر نکل آیا۔ شکست کا احساس اسے محض اس لئے تھا کہ اس نے جس لڑکی کو چاہا تھا وہ [illegible] رہی نکلی تھی۔ فتح کا احساس اس لئے تھا کہ اس نے ثوبیہ کو آئینہ دکھا دیا تھا۔ اگرچہ فاروق نے ثوبیہ کو اپنے دل میں بٹھا لیا تھا تاہم اس کا ''یہ روپ'' دیکھنے کے بعد وہ اس کے من سے اتر گئی تھی۔ وہ اسی سوچ میں غلطاں تھا کہ اس نے کس قسم کی محبت کی تھی۔ دل بھی آیا تو ایک ایسی لڑکی پر جو کہیں اور دادِ عیش دے رہی تھی۔

جب اس نے ٹھنڈے دل سے اپنا تجزیہ کیا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والے عذاب میں مبتلا ہو چکا تھا۔ اس کے دل نے گواہی دی کہ وہ اب بھی ثوبیہ کے نام پر دھڑکتا ہے مگر

دماغ مسلسل اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ثوبیہ با کردار لڑکی نہیں اس لئے پہلی فرصت میں اسے دل و دماغ سے کھرچ کر نکال دینا چاہئے۔

وہ ایک عجیب سی کشمکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آنکھوں دیکھی کر مکھی نگلنے کے لئے ذہن آمادہ نہیں تھا اور دل ثوبیہ کو بھولنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کی محبت نے اچانک اتنے پہلو دیکھے تھے کہ اس کے حواس مختل ہو کر رہ گئے تھے۔

پہلے اس نے سوچا کہ دفتر جائے مگر پھر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ اس کی موٹر سائیکل...... بلکہ کمپنی کی دی ہوئی موٹر سائیکل اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ اسے وہاں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس کے قدم دفتر کی جانب بڑھ گئے۔ وہ موٹر سائیکل لے کر گھر چلے جانا چاہتا تھا۔ پی سی او سے دفتر تک کا فاصلہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا تھا۔

جب وہ بلڈنگ کے نزدیک پہنچا تو سامنے سے اسے مراد آتے ہوئے دکھائی دیا۔ مراد اس دفتر میں چپڑاسی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ فاروق پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا اس کے پاس آیا اور کہا۔

”آپ کہاں چلے گئے تھے فاروق صاحب؟“

”کیوں، کیا ہوا یہ بھئی؟“ فاروق نے استفسار کیا۔

”صاحب آپ کو ڈھونڈ رہے ہیں۔“

”کون صاحب؟“ فاروق نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

مراد نے بتایا۔ ”میں اپنے صاحب کی بات کر رہا ہوں جناب...... توفیق صاحب کی۔“

فاروق نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ پونے بارہ بج رہے تھے۔ ذہنی پریشانی میں وقت گزرنے کا اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اس نے مراد سے کہا۔ ”آج صاحب کچھ جلدی آفس نہیں آ گئے؟“

”وہ تو پندرہ بیس منٹ سے آئے ہوئے ہیں۔“ مراد نے بتایا۔ ”ویسے آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں فاروق صاحب! آج صاحب اپنے وقت سے خاصا پہلے آ گئے ہیں۔“

فاروق کے دل میں چور تھا، اس نے بے اختیار پوچھا۔ ”کیا صاحب اپنے کمرے میں اکیلے ہی ہیں یا ان کے پاس کوئی بیٹھا ہوا ہے؟“

گفتگو کے دوران میں وہ بلڈنگ کی سیڑھیاں بھی طے کرتے جا رہے تھے۔ مراد نے فاروق کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”اس وقت تو اکیلے ہی بیٹھے ہیں۔“

”اور مس ثوبیہ؟“

”وہ اپنے کیبن میں موجود ہیں۔“

”کیا وہ باس کے کمرے میں گئی تھی؟“ فاروق نے پوچھا۔

مراد نے بتایا۔ ”وہ تو روزانہ ہی باس کے کمرے میں جاتی ہے لیکن آج میں نے ایک خاص

بات نوٹ کی ہے۔“

”کیسی خاص بات؟“

”آج مس ثوبیہ، باس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کے پاس پہنچ گئی تھی۔“ مراد نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ”تھوڑی ہی دیر بعد وہ کمرے سے نکل آئی مگر میں نے محسوس کیا کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“

فاروق نے بے چینی سے دریافت کیا۔ ”کس قسم کی گڑبڑ؟“

”صاحب کا موڈ بہت خراب ہو رہا ہے فاروق صاحب!“ مراد نے بتایا۔ ”اور مس ثوبیہ بھی جب ان کے کمرے سے نکلی تھی تو خاصی ہراساں دکھائی دیتی تھی۔ اس کے بعد ہی صاحب نے چیخ کر مجھ سے کہا کہ میں فوراً آپ کو ڈھونڈ لاؤں۔ آپ دفتر میں کہیں نظر نہ آئے تو میں آپ کی تلاش میں بلڈنگ سے باہر آ گیا تھا۔“

فاروق کو یقین ہو گیا کہ ثوبیہ نے توفیق علی کو تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا ہے مگر وہ اس سچویشن سے ذرا بھی گھبراہٹ میں مبتلا نہیں ہوا۔ جب سے اس کے علم میں یہ بات آئی تھی کہ ثوبیہ، توفیق پر عنایات کی بارش کر رہی ہے اس کے بعد سے وہ اپنے باس توفیق علی سے شدید نفرت کرنے لگا تھا۔ آپ اسے رقابت کی آگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ثوبیہ کی طرف سے بھی اس کا ذہن بدک چکا تھا۔ اس نے سوچا، جو ہونا ہے، آج ہی ہو جائے۔

فاروق، توفیق علی کے کمرے میں پہنچا تو توفیق شدید غصے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ آج اس نے فاروق کو بیٹھنے کے لئے بھی نہیں کہا اور کڑے تیوروں سے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا۔

”تم کہاں مر گئے تھے۔ میں کتنی مرتبہ تمہارا پوچھ چکا ہوں؟“

”سر!“ وہ اپنے باس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔ ”میں کہیں بھی مر نہیں گیا تھا۔ ذرا سگریٹ لینے نیچے گیا تھا۔“

”ذرا سگریٹ لینے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ جاتے ہیں؟“ توفیق نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔ ”مجھے معلوم ہے، تم کافی دیر سے غائب ہو...... اور یہ سگریٹ چائے لانے کے لئے دفتر میں چپڑاسی موجود ہے۔ تم نے یہ دو گھنٹے کہاں ضائع کر دیئے؟“

توفیق نے فاروق سے آج تک ایسے لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ جب وہ باس کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا تو اس نے ثوبیہ والے کیبن میں ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی تھی۔ وہ اس کی طرف پیٹھ پھیرے کسی کام میں مصروف تھی۔ توفیق علی کے انداز نے فاروق کو باور کروا دیا کہ اس کے خلاف ثوبیہ نے توفیق کو سب کچھ بتا دیا ہے۔

فاروق خاموش کھڑا رہا تھا تو توفیق علی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”میں تو تمہیں خاصا معقول آدمی سمجھتا تھا مگر تم نے یہ کیسی حرکت کی ہے؟“

"میں نے کیا، کیا ہے سر؟" وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

"اب یہ بھی میں ہی بتاؤں گا کہ تم نے کیا، کیا ہے اور کیا نہیں کیا؟" وہ ناگوار لہجے میں بولا۔ "مجھے تمہارے خلاف ایک سخت قسم کی شکایت ملی ہے۔"

اپنی بات ختم کر کے توفیق ایسی نظر سے فاروق کو تکنے لگا جیسے وہ اپنی صفائی میں کچھ کہے گا لیکن فاروق بدستور خاموش کھڑا رہا۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اپنے طور پر کسی بات کی وضاحت نہیں کرے گا......اور ٹو دی پوائنٹ بات کرنے کی کوشش کرے گا۔

جب ایک دو منٹ گزر گئے تو توفیق علی نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم بت بنے خاموش کیوں کھڑے ہو۔ میری بات کا جواب کیوں نہیں دیتے؟"

"سر! آپ نے مجھ سے کچھ پوچھا ہی نہیں تو میں جواب کس بات کا دوں؟" فاروق نے معصومیت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ نے فرمایا ہے کہ آپ کو میرے خلاف کوئی سنگین نوعیت کی شکایت ملی ہے۔ لیکن اس "شکایت" کی کوئی تفصیل آپ نے نہیں بتائی۔"

توفیق علی کی جھنجلاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے دہاڑ سے مشابہ لہجے میں کہا۔ "تم ابھی اتنی دیر کہاں گزار کر آئے ہو؟"

"سر! میں نے بتایا ہے نا میں سگریٹ لینے......"

"بکواس بند کرو۔" توفیق علی چیخا۔ "تم سگریٹ لینے نہیں بلکہ ثوبیہ کو فون کرنے گئے تھے۔"

"جب آپ کو سب کچھ معلوم ہو ہی گیا ہے تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟" فاروق نے باس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "ہاں، میں ثوبیہ کو فون کرنے ہی گیا تھا۔"

توفیق نے کہا۔ "ثوبیہ نے مجھے بتایا ہے کہ تم نے اس کے ساتھ بدتمیزی کی ہے؟"

"میں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی۔" وہ قطعیت سے بولا۔ "حقیقت کا اظہار بدتمیزی کے زمرے میں نہیں آتا۔"

توفیق نے تیز نظر سے فاروق کو گھورا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "جسے تم حقیقت سمجھ رہے ہو وہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ تم نے شاید کل کسی اور کو میرے ساتھ دیکھا ہے۔"

اگر توفیق صرف اتنا کہتا کہ فاروق کو غلطی ہوئی ہے تو بھی اس سلسلے میں سوچنے کی گنجائش نکلتی تھی مگر اپنی بات کے اختتام پر اس نے اس بات پر زور دیا تھا کہ فاروق نے گزشتہ روز کسی اور لڑکی کو توفیق کے ساتھ دیکھا تھا اور اسے ثوبیہ سمجھ بیٹھا تھا۔ حالانکہ فاروق کو یقین تھا کہ وہ ثوبیہ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر فون پر ثوبیہ نے جس شدید ردِعمل کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی اس حقیقت کی تصدیق کرتا تھا۔

فاروق نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "سر! آپ اسے غلط فہمی کہیں یا خوش فہمی مگر اس سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ میں نے خود اپنی ان آنکھوں سے آپ دونوں کو بہادر آباد کے ایک

فلیٹ میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ بعد میں، میں نے اس فلیٹ کے بارے میں چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ اس فلیٹ میں باقاعدہ کوئی نہیں رہتا۔ آپ ہی دو چار روز کے بعد وہاں کسی لڑکی یا عورت کے ساتھ وقت گزارنے جاتے ہیں۔"

توفیق علی نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ ٹھیک ہے کہ وہ فلیٹ میری ذاتی ملکیت ہے اور میں بعض اوقات کسی ضروری کام سے وہاں جاتا رہتا ہوں مگر ثوبیہ کے حوالے سے تمہارا شک کسی حقیقت کا حامل نہیں۔ تم اپنے ذہن کو صاف رکھو۔"

توفیق کے لہجے کی نرمی فاروق کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ پہلے اسے جس بات کا یقین تھا، اب اس کا یقین کامل ہو چکا تھا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "سر! میرا ذہن صاف ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

توفیق نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے کہا۔ "دیکھو فاروق! تم میری کمپنی کے ایک اچھے ورکر ہو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا مگر تم نے جو ناشائستہ حرکت کی ہے اس کے لئے تمہیں ثوبیہ سے معافی مانگنا ہوگی۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گا۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔

"تمہیں ایسا تو کرنا ہی پڑے گا فاروق!" توفیق بھی گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میری کمپنی کا ڈسپلن خراب ہو۔ ابھی تک یہ معاملہ ہم تینوں کے بیچ ہے۔ اگر بات پھیل گئی تو پورے دفتر میں ہنگامہ مچ جائے گا۔ مجھ سے تو کوئی کچھ کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا لیکن ثوبیہ کو سب شک زدہ نظر سے دیکھیں گے۔ تم ثوبیہ سے کس بات کا انتقام لے رہے ہو؟ کیا تم اس پر یہ گھناؤنا الزام محض اس لئے لگا رہے ہو کہ اس نے تمہیں گھاس نہیں ڈالی؟ وہ ایک مہذب، شریف اور باکردار لڑکی ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اس پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر چکے ہو اور جب اس نے تمہیں توجہ کے قابل نہیں سمجھا تو تم اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہو۔"

توفیق کی منافقت آمیز باتیں سن کر فاروق کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ سنسناتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "توفیق صاحب! ایک بات میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہرگز ہرگز میں آپ دونوں کے بارے میں کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے ثوبیہ سے سیدھے سادے انداز میں اظہارِ محبت کیا تھا، اسے آپ ڈورے ڈالنا نہیں کہہ سکتے۔ یہ بھی سچ ہے کہ ثوبیہ نے میری حوصلہ شکنی کی تھی۔ یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ آپ دونوں کے درمیان کس نوعیت کے تعلقات ہیں۔ میں وہ سب کچھ دیکھ کر سلگ اٹھا تھا، شاید اس لئے کہ میں ثوبیہ کو چاہنے لگا تھا اور غیر محسوس طور پر اس واقعے نے میرے جذبۂ رقابت کو ہوا دی تھی۔ میں نے آج ثوبیہ کو آئینہ دکھانے کے لئے فون کیا تھا۔ میں یہ بات تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا کہ ثوبیہ سے محبت میرا ایک بے اختیار عمل تھا لیکن اس کا اصل چہرہ دیکھنے کے بعد میری

سوچ بدل گئی ہے۔ میں آئندہ اس کے کسی معاملے میں کوئی دخل نہیں دوں گا۔“

فاروق یہ سب کچھ جذبات کے تلاطم میں کہہ تو رہا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اسے اپنے اندر کوئی چیز ٹوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ مانے یا نہ مانے، اس کا دل ثوبیہ ہی میں اٹکا ہوا تھا۔ شاید یہ اس کی، ثوبیہ کے لئے محبت کا اعجاز تھا۔ اس کی زبان جس بات کی نفی کر رہی تھی، دل کی دھڑکن اس پر اثبات کی گردان کر رہی تھی۔

محبت بڑی عجیب شے ہے۔ کبھی یہ انتہائی سادہ ہو جاتی ہے اور کبھی پیچیدگیوں کی حدوں کو چھونے لگتی ہے۔ اس کو پرکھنے، برتنے اور ثابت کرنے کے لئے کوئی فارمولا نہیں بنایا جا سکتا۔ جو جذبہ کسی فارمولے میں آ جائے وہ محبت کہلانے کا حق دار نہیں۔ محبت بس محبت ہوتی ہے۔ اس کو آزمانے والے ہمیشہ دکھ اٹھاتے ہیں۔

فاروق کا بیان ختم ہوا تو توفیق نے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میں نے تمہیں، تمہاری تقریر سننے کے لئے یہاں نہیں بلایا۔ اگر تمہیں نوکری کرنا ہے تو پھر شرافت کا مظاہرہ کرو۔“

”مجھے یہ مظاہرہ کس طرح کرنا ہو گا؟“ اس نے جواباً سوال کر دیا۔

توفیق نے کہا۔ ”تمہیں ہر حال میں ثوبیہ سے اپنے ناروا رویے کے لئے معافی مانگنا ہو گی...... اور وہ بھی یہاں میرے سامنے۔“ ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ”اگر تم میری بات ماننے کے لئے تیار ہو تو میں ثوبیہ کو کمرے میں بلاتا ہوں۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ فاروق نے کہا۔ ”آپ اس زحمت میں نہ پڑیں۔“

اس کے ساتھ ہی فاروق اٹھ کھڑا ہوا۔

توفیق نے کہا۔ ”اس کا یہی مطلب ہے کہ تم نے ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“

”آپ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔“ فاروق نے کہا۔ ”میں نے تو آپ کو یہ فیصلہ سنایا ہے کہ میں ثوبیہ سے معافی نہیں مانگوں گا۔“

”ہوں......“ توفیق گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر کہا۔ ”میں تمہیں سوچنے کے لئے دو دن کی مہلت دیتا ہوں۔ تم اچھی طرح غور و فکر کر لو۔“

”دو روز بعد بھی میرا یہی فیصلہ ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ۔“ توفیق نے ناگواری سے کہا۔ ”جا کر اکاؤنٹنٹ سے مل لو۔“

اس کا ایک ہی مطلب تھا، اسے فارغ کیا جا رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے باس توفیق علی کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ آئندہ دو گھنٹے کے اندر اندر اس کا حساب بے باق کر کے اسے ملازمت سے برطرف کیا جا چکا تھا۔ اس روز اگست کی بیس تاریخ تھی۔

اکیس تاریخ کو فاروق میرے پاس آیا تھا اور اس نے اپنے باس پر مقدمہ دائر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا مگر میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی اور وہ مایوس ہو کر میرے دفتر سے چلا گیا تھا۔

اس وقت تو فاروق نے مجھے تفصیل سے کچھ نہیں بتایا تھا لیکن اب انکشاف ہوا تھا کہ مقدمے بازی کا خیال اس کے ذہن میں ایک دوست کے اکسانے پر آیا تھا۔ اس کے دوست کا خیال تھا کہ اس طرح توفیق علی سے ایک بھاری رقم نکلوائی جا سکتی تھی۔

قصہ مختصر، فاروق کو نوکری سے نکالنے کے چار روز بعد یعنی پچیس اگست کو شام کے وقت اس کے گھر واقع محمود آباد سے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر اپنے سابق باس توفیق علی کے قتل کا الزام لگایا گیا تھا اور اب وہ ریمانڈ پر پولیس کسٹڈی میں تھا۔

اس کے علاوہ بھی فاروق نے مجھے بہت سی ضروری اور غیر ضروری باتیں بتائیں۔ غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرتے ہوئے دیگر ضروری باتوں کو میں عدالتی کارروائی کے دوران میں آپ کے سامنے لاؤں گا۔ فی الحال ان کا ذکر مناسب نہیں۔

☼☆☼

ریمانڈ کی مدت پوری ہونے کے بعد پولیس نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔ چالان کی رپورٹ میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ ملزم فاروق نے اقبالِ جرم کر لیا ہے۔ اپنے تئیں پولیس نے اپنا کام خوش اسلوبی سے انجام دے دیا تھا۔

ابتدائی چند پیشیاں عدالت کی تکنیکی کارروائی کی نذر ہو گئیں اور کوئی قابلِ ذکر سماعت نہ ہو سکی۔ پہلی باقاعدہ پیشی دو ماہ کے بعد عمل میں آئی۔

ایک بات میں آپ کو بتانا بھول گیا کہ جب پولیس نے چالان پیش کیا تھا تو میں نے اپنے موکل کی ضمانت کروانے کی بھرپور کوشش کی تھی مگر مجھے اس سلسلے میں کامیابی نہ ہو سکی۔ قتل کے مقدمات میں ملوث ملزمان کی ضمانت آسان نہیں ہوتی۔

پولیس نے چالان کی رپورٹ میں یہ موقف اختیار کیا تھا کہ ملزم یعنی میرے موکل فاروق نے حاسدانہ اور رقیبانہ جذبات سے مغلوب ہو کر اپنے باس کو قتل کر دیا تھا۔ اس کے اس قسم کے جذبات بھی اس کی غلط فہمی کا نتیجہ تھے حالانکہ اس معاملے میں حسد یا رقابت والی کوئی بات ہی نہ تھی۔ ملزم نے اپنے طور پر سب کچھ فرض کر لیا تھا۔ دراصل وہ ثوبیہ کو اپنے چکر میں پھانسنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس کی باتوں میں نہ آئی تو وہ باس سے ثوبیہ کی بے تکلفی کو کوئی اور رنگ دے بیٹھا۔ اسی سلسلے میں ایک روز اس نے ثوبیہ کے ساتھ ہتک آمیز رویے کا مظاہرہ کیا جس پر باس یعنی مقتول توفیق علی نے جب اس سے باز پرس کی تو وہ اسے بھی آنکھیں دکھانے لگا۔ مقتول کو ملزم کا رویہ سخت ناگوار گزرا تاہم اس پر بھی مقتول نے اسے سمجھانے بجھانے اور ثوبیہ سے معافی مانگنے کا مشورہ دیا۔ ملزم اس مشورے پر چراغ پا ہو گیا اور اس نے مقتول کو کھری کھری سنا دیں۔ ملزم کا یہ رویہ سراسر بدتمیزی کے زمرے میں آتا تھا۔ مقتول اپنے دفتر کے ماحول کو خراب نہیں ہونے دینا چاہتا تھا چنانچہ اس نے شر پسند اور فتنہ پرور عنصر ملزم فاروق احمد کو نوکری سے برخاست کر دیا۔ ملزم نے اپنی

برطرفی کو بے عزتی جانا اور چار پانچ روز بعد دفتر آ کر اپنے سابق باس کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول توفیق علی کی موت پچیس اگست کو سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان واقع ہوئی تھی۔ مقتول کے سینے میں خنجر گھونپ کر اسے ابدی نیند سلا دیا گیا تھا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایک خاص بات کی نشاندہی بھی کی گئی تھی اور وہ یہ کہ مقتول کو حالت غفلت میں خنجر سے نشانہ بنایا گیا تھا یعنی جب قاتل خنجر کا خطرناک پھل اس کے سینے میں اتارا گیا تو مقتول اپنے حواس میں نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی مقتول کی گردن پر کچھ ایسے نشانات پائے گئے تھے جیسے اس کے سینے پر خنجر کا وار کرنے سے قبل اس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی گئی ہو۔ اسی کوشش میں مقتول اپنے حواس کھو کر بے ہوش یا نیم بے ہوش ہو گیا...... اور مقتول کی بے ہوشی یا نیم بے ہوشی میں اس کے سینے میں خنجر اتار کر اسے زندگی کی قید سے آزاد کر دیا گیا۔ گلا گھونٹنے کے سلسلے میں ایک نکتہ بہت اہم بیان کیا گیا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ مقتول کے عقب سے اس کی گردن دبوچ کر گلا دبانے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ قاتل کے ہاتھوں کے انگوٹھوں کے نشانات مقتول کی گردن کی عقبی سمت یعنی گدی پر پائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اس رپورٹ میں چند چھوٹی موٹی باتیں درج تھیں جن کا ذکر غیر ضروری ہو گا۔

عدالت میں باقاعدہ سماعت کا آغاز ہوا۔ جج نے میرے موکل ملزم فاروق احمد کو فرد جرم پڑھ کر سنائی۔ ملزم نے صحت جرم سے صاف انکار کر دیا۔

پولیس رپورٹ میں یہ بات ظاہر کی گئی تھی کہ ملزم نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا ہے۔ یہ پولیس اور ملزم کا ایک دیرینہ طریقہ کار ہوتا ہے۔ پولیس اپنا معاملہ سیدھا کرنے کے لئے جس طرح بھی ممکن ہو، ملزم سے اقبال جرم کرواتی ہے۔ اس کے لئے بے انتہا تشدد کی راہ بھی اپنائی جاتی ہے...... اور ملزم تشدد کا نشانہ بننے سے بچنے کے لئے اپنا جرم قبول کرنے ہی میں عافیت سمجھتا ہے، چنانچہ پولیس کی تحویل میں دیئے گئے ملزم کے بیان کو عدالت کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ عدالت میں ملزم کو یہ حق دیا جاتا ہے کہ وہ خود پر لگائے گئے الزام سے انکار کر سکتا ہے۔

ملزم کے صحت جرم سے انکار کے بعد جج کی اجازت سے استغاثہ کے گواہوں کے بیانات کا سلسلہ شروع ہوا۔ استغاثہ کی جانب سے کم و بیش نصف درجن گواہ پیش کئے گئے لیکن میں یہاں چند اہم گواہوں کے بیانات کا احوال بیان کروں گا۔

سب سے پہلے اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے اکاؤنٹنٹ الطاف بیان دینے کے لئے گواہوں کے کٹہرے میں آیا۔ الطاف کی عمر پینتیس کے اریب قریب تھی۔ وہ پتلون اور ہاف سلیو شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا بیان ریکارڈ کروایا پھر وکیل استغاثہ جرح کے لئے اس کے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔

''مسٹر الطاف!'' وکیل استغاثہ نے گواہ کو مخاطب کیا۔ ''آپ کتنے عرصے سے اسکائی ٹریڈنگ

کمپنی میں ملازمت کر رہے ہیں؟''

''لگ بھگ دس سال سے۔'' گواہ نے جواب دیا۔

''کیا آپ اپنی ملازمت سے مطمئن ہیں؟''

''جی ہاں، الحمدللہ میں بالکل مطمئن ہوں۔''

''اور مقتول کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

گواہ نے الجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''میں آپ کے سوال کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔''

''میں یہ جاننا چاہوں گا کہ کیا آپ اپنے مقتول باس کی طرف سے بھی مطمئن تھے؟'' وکیل استغاثہ نے وضاحت کی۔

گواہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''بالکل مطمئن تھا جناب۔''

''مقتول کس قسم کے کردار اور رویے کا مالک تھا؟''

''وہ اچھے کردار اور شائستہ رویے کے مالک تھے۔''

''آپ کو مقتول سے کبھی کوئی شکایت رہی؟''

''جی نہیں، بالکل نہیں۔'' گواہ نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''توفیق صاحب اپنے تمام ملازمین کا بہت خیال رکھتے تھے۔''

وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔ ''کیا ان ملازمین میں ملزم بھی شامل تھا؟''

''آف کورس۔'' وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''میں اکاؤنٹنٹ ہوں اس لئے مجھے تمام ملازمین کے بارے میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ معلومات ہیں۔ توفیق صاحب بعض افراد کو مقررہ تنخواہ کے علاوہ بھی کچھ رقم دیتے تھے۔ آپ اسے انعام سمجھ لیں یا کچھ اور۔ بہرحال یہ توفیق صاحب کا ایک قابل تعریف عمل تھا۔ ملزم بھی ان افراد میں شامل تھا، توفیق صاحب جن کا ''خیال'' رکھتے تھے۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''آپ ثوبیہ کو کب سے جانتے ہیں؟''

''جب سے وہ کمپنی میں آئی ہے۔''

''میں یہی جاننا چاہتا ہوں۔''

گواہ نے جواب دیا۔ ''کم و بیش تین ماہ سے۔''

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''آپ ثوبیہ کو کس قسم کی لڑکی سمجھتے ہیں؟''

''وہ ایک خوش اخلاق اور محنتی لڑکی ہے۔'' گواہ الطاف نے جواب دیا۔ ''اس کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بہت تیزی سے ترقی کرے گی۔''

''آپ کے مقتول باس توفیق علی کا ثوبیہ کے ساتھ کیسا رویہ تھا؟''

''انتہائی مہربان اور شفیق رویہ۔''

''الطاف صاحب!'' وکیل استغاثہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کیا کبھی آپ نے ایسا محسوس کیا کہ مقتول توفیق علی اور ثوبیہ کے بیچ کچھ چل رہا ہو؟''

''کچھ سے آپ کی کیا مراد ہے وکیل صاحب؟'' گواہ نے وضاحت چاہی۔

وکیل استغاثہ نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، کیا ان دونوں کے درمیان کوئی ایسا تعلق نظر آتا تھا جسے افیئر یا کسی قسم کی دوستی کا نام دیا جا سکے؟''

''قطعاً ایسی کوئی بات مجھے تو نظر نہیں آئی۔'' گواہ نے پورے وثوق سے جواب دیا۔

''گویا ملزم اس سلسلے میں شدید ترین غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا؟'' وکیل استغاثہ نے رائے طلب نظر سے گواہ کو دیکھا۔

گواہ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ''یقیناً ایسا ہی ہوا ہے جناب!'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''وکیل صاحب! میں یہاں ایک بات کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔'' اس نے حاضرین عدالت پر ایک اچٹتی نظر ڈالی، پھر جج کی طرف دیکھنے کے بعد وکیل استغاثہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''مس ثوبیہ ہماری کمپنی میں سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر رہی تھیں۔ سیکرٹری کا مطلب ہے ''راز دار۔'' ہر سیکرٹری اپنے باس کے رازوں کا / کی امین ہوتا / ہوتی ہے۔ اب اس تعلق کو کچھ احمق قسم کے لوگ جو بھی نام دے دیں۔'' اتنا کہہ کر گواہ نے تحقیر آمیز نظر سے ملزم کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ثوبیہ آوارہ مزاج تھی نہ توفیق صاحب اس لائن کے آدمی تھے۔ ملزم ذہنی طور پر بیمار معلوم ہوتا ہے جو وہ اپنے ولی نعمت کے بارے میں اس قسم کی سوچ رکھتا تھا۔ آپ اسے نمک حرامی بھی کہہ سکتے ہیں۔''

گواہ کا طویل جواب ختم ہوا تو وکیل استغاثہ نے پوچھا۔ ''مس ثوبیہ سے ملزم کی کیا پرخاش تھی؟''

''جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔'' گواہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ملزم، مس ثوبیہ کو اپنے دام میں لانا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے محبت کا جال بچھایا لیکن اپنے ''مشن'' کو ناکام ہوتا دیکھ کر وہ اپنی اوقات پر اتر آیا۔ اس نے مقتول کے حوالے سے ثوبیہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی اور اوچھی حرکات پر اتر آیا۔ مجبوراً باس نے اسے نوکری سے نکال دیا۔''

''الطاف صاحب!'' وکیل استغاثہ نے گواہ کو مخاطب کیا۔ ''جب آپ ملزم کا حساب کر رہے تھے تو اس کے کیا تاثرات تھے؟''

گواہ نے جواب دیا۔ ''وہ شدید غصے میں تھا۔''

''اس موقع پر اس نے کچھ کہا بھی تھا؟''

''جی ہاں۔'' گواہ نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میں نے اسے بڑے الفاظ میں یہ کہتے سنا تھا...... میں اس توفیق کے بچے کو چھوڑوں گا نہیں۔''

اس کے ساتھ ہی وکیل استغاثہ نے اپنی جرح ختم کر دی۔

میں اپنی باری پر جرح کے لئے آگے بڑھا۔ میں نے گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک پہنچ کر گواہ الطاف کا بغور جائزہ لیا پھر اپنے سوالات کا آغاز کیا۔

''الطاف صاحب! یہ بات عدالت کے ریکارڈ پر آ چکی ہے کہ آپ اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں عرصہ دس سال سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ مذکورہ کمپنی میں کس پوسٹ پر کام کر رہے ہیں؟''

اس نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور جواب دیا۔ ''بنیادی طور پر تو میں اکاؤنٹنٹ ہوں۔ اس کے علاوہ بطور کیشئر بھی کام کرتا ہوں۔''

''ان خدمات کے سلسلے میں یا یوں کہیں، صلے میں کیا آپ کو دو تنخواہیں ملتی ہیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔

''جی نہیں، تنخواہ تو ایک ہی ملتی ہے۔'' وہ الجھے ہوئے انداز میں بولا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کا تو دعویٰ ہے کہ مقتول جہاں بہت سی ''خوبیوں'' کا مالک تھا وہاں اس میں ایک وصف یہ بھی تھا کہ وہ اپنے ملازمین کے ساتھ بہت شفیق اور مہربان تھا۔ وہ ان کا بہت خیال رکھتا تھا بلکہ بعض ملازمین کو تو وہ تنخواہ کے علاوہ بھی مالی مدد دیتا رہتا تھا۔ پھر آپ کے ساتھ ایسی ناانصافی کیوں؟ آپ دو کام کرتے تھے اور تنخواہ آپ کو ایک ملتی تھی۔ کیا مقتول کی آپ سے کوئی دشمنی تھی؟''

اس موقع پر وکیل استغاثہ نے مداخلت ضروری سمجھی اور تیز لہجے میں بولا۔ ''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی! معزز عدالت میں اس وقت توفیق مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے اور وکیل صفائی غیر ضروری اور غیر متعلقہ باتوں میں عدالت کا قیمتی وقت برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں نے بھی جواباً احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''میرے فاضل دوست! میں اس بات کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے بتایا ہے، اس وقت عدالت میں توفیق مرڈر کیس کی سماعت ہو رہی ہے۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے طنزیہ نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا، پھر جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ ''جناب عالی! میں معزز عدالت کا قیمتی وقت ضائع کرنے کے بارے میں غلطی سے بھی سوچ نہیں سکتا۔ میں نے انتہائی متعلقہ اور برمحل سوال پوچھا ہے۔ اگر گواہ کو جواب دینے میں کوئی اعتراض ہو تو میں اپنے سوال سے باز آ جاؤں گا۔''

وکیل استغاثہ میری اس چوٹ پر تلملا کر رہ گیا۔ جج نے مستفسرانہ نگاہ سے گواہ کی جانب دیکھا۔ الطاف میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

''وکیل صاحب! ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہاں کے اکثر اداروں اور کمپنیز کا وتیرہ ہے کہ ایک ملازم سے کئی کئی کام لئے جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص تین کام کر رہا ہے اور اسے تنخواہ صرف

ایک کام سے تھوڑی زیادہ دی جا رہی ہے تو اس میں بھی مالکان کا خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ ملازم پر "احسانِ عظیم" فرما رہے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اگر وہی کام وہ تین مختلف افراد سے لیں تو انہیں تین گنا معاوضہ دینا پڑے۔ اس میں کچھ ملازمین کی بھی مجبوریاں ہیں۔ جب انہیں ایک کام کی تنخواہ کم ملتی ہے تو وہ اپنی ضروریات کے پیش نظر آمدنی بڑھانے کے لئے اپنے اوپر زیادہ سے زیادہ کام لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ملازمین زندہ رہنے کے لئے اپنی ضروریات سے مجبور ہوتے ہیں اور مالکان ان کی اس مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

گواہ الطاف نے ضرورت سے زیادہ ہی تفصیلی جواب دے دیا تھا۔ درحقیقت میں نے اس کی دُکھتی رگ کو چھیڑ دیا تھا۔ وہ جذبات میں یہ بات فراموش کر بیٹھا کہ اس کا بیان اس کے خلاف بھی جا سکتا ہے۔

"گویا آپ یہ تسلیم کرتے ہیں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کہ آپ کے مقتول باس، دیگر اکثر مالکان کی طرح ناانصاف تھے اور ظلم و زیادتی کی راہ پر چل رہے تھے۔"

جواب دینے سے پہلے گواہ نے مشورہ طلب نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا۔ وکیل استغاثہ نے اس موقع پر کوئی احتجاج نہیں کیا چنانچہ گواہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کسی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" پھر ایک لمحہ رک کر اضافہ کیا۔ "ویسے مجموعی طور پر باس اچھے انسان تھے۔"

"چلیں آپ کہتے ہیں تو میں یقین کر لیتا ہوں۔" میں نے دوستانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے اپنے جن خیالات بلکہ جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ آپ اپنی ملازمت سے خوش نہیں تھے جبکہ......" میں نے ڈرامائی انداز میں وقفہ دیا پھر بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جبکہ آپ وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتا چکے ہیں کہ آپ اپنی ملازمت سے الحمدللہ بالکل مطمئن تھے۔ آپ کے بیان کا یہ تضاد کیا معنی رکھتا ہے؟"

اس نے میرے سوال کا عجیب سا جواب دیا۔ "وکیل صاحب! وہ کہتے ہیں کہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہئے۔ میں اگرچہ اپنی ملازمت سے خوش اور مطمئن نہیں تھا مگر پھر بھی کبھی ناشکری نہیں کی۔"

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "الطاف صاحب! آپ نے بتایا ہے کہ مقتول اچھے کردار اور شائستہ رویے کا مالک تھا۔ چلیں رویے کے بارے میں تو آپ کی بات مان لیتے ہیں مگر اس کے کردار کے بارے میں آپ کا دعویٰ ثابت کرنے کا کوئی طریقہ بتائیں گے؟"

"میں آپ کی بات سمجھ نہیں سکا ہوں وکیل صاحب!"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کس بنا پر یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ مقتول اچھے کردار کا مالک تھا؟" میں نے کہا۔ "کیا آپ اس کے روزمرہ کے معمولات سے پوری طرح واقف تھے؟ اگر آپ جانتے تھے کہ وہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ کس طرح گزارتا ہے تو اس واقفیت کے لئے آپ کا

ذریعہ کیا تھا؟"

"آبجیکشن یور آنر!" وکیل استغاثہ نے جج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وکیل صفائی فضول قسم کے سوالات سے معزز گواہ کو ہراساں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "جناب عالی! میرے فاضل دوست کو اپنا دعویٰ ثابت کرنا ہو گا۔"

"کیسا دعویٰ؟" وکیل استغاثہ نے متعجب لہجے میں کہا۔

میں نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "جناب عالی! وکیل استغاثہ نے میرے جرح کے سلسلے کو "فضول قسم کے سوالات" سے موسوم کیا ہے۔ اب ان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ میرے سوالات کی "فضولیت" کو ثابت کریں۔"

"فضول چیز بس فضول ہوتی ہے۔" وہ گڑبڑا گیا۔ "اس کو ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے اس کی گڑبڑاہٹ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میرے فاضل دوست! استغاثہ کا یہ دعویٰ ہے کہ میرے موکل نے اپنے باس کو محض اس لئے قتل کر دیا کہ اس نے میرے موکل کو نوکری سے نکال دیا تھا......اور نوکری سے نکالنے کی وجہ ملزم کی ایک "سنگین غلط فہمی" تھی۔ یعنی میرا موکل مس ثوبیہ اور مقتول کے "تعلقات" سے آگاہ ہو گیا تھا۔ ان حالات کی روشنی میں مقتول کے کردار سے متعلق کوئی بھی سوال فضولیات میں کیسے شمار ہو سکتا ہے؟"

وکیل استغاثہ بغلیں جھانکنے لگا۔

جج نے گواہ الطاف سے کہا۔ "مسٹر الطاف! آپ وکیل صاحب کے سوال کا جواب دیں۔"

الطاف نے کمزور لہجے میں کہا۔ "میں جس حد تک باس کو جانتا تھا اس کی بنا پر یہی کہوں گا کہ وہ اچھے کردار کے مالک تھے۔"

"اور میرے موکل کے کردار کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟" میں نے جرح کے سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

الطاف نے جواب دیا۔ "وہ شکی مزاج اور جھگڑالو قسم کا انسان ہے۔"

"میں نے اس کے مزاج اور عادات کی بابت نہیں پوچھا۔" میں نے نیم غصیلے انداز میں کہا۔ "کردار کے بارے میں سوال کیا ہے۔"

"ملزم کے کردار کے بارے میں اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے ثوبیہ جیسی شریف، محنتی اور خوش اخلاق لڑکی پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی تھی۔" گواہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ "میں اور کیا بتاؤں وکیل صاحب!"

میں نے کہا۔ "ڈورے ڈالنے اور محبت کا اظہار کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے مسٹر الطاف! میرے موکل نے بڑے واضح الفاظ میں مس ثوبیہ سے اپنے جذبات کا اظہار کیا تھا۔ اس فعل سے

کسی بھی طور اس کا کردار متاثر نہیں ہوتا۔''

گواہ نے کہا۔ ''مس ثوبیہ نے ملزم کا ''اظہار محبت'' سننے کے بعد اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ اس کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔ اس کے باوجود بھی ملزم ثوبیہ کو مختلف حیلوں وسیلوں سے تنگ کرتا رہا۔ ملزم کے رویے سے زچ ہو کر ثوبیہ نے اسے وارننگ دی کہ اگر وہ اپنی گھٹیا حرکتوں سے باز نہ آیا تو وہ باس سے اس کی شکایت کرے گی۔ ثوبیہ کی وارننگ کے جواب میں ملزم نے اسے باس کے حوالے سے بدنام کرنے کی کوشش کی۔'' ایک لمحے کو رک کر اس نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''ان واقعات سے ملزم کا کردار واضح ہو جاتا ہے۔''

''ہوں......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''میرا موکل بدمزاج ہے، شکی ہے، جھگڑالو ہے اور کردار کا بھی بہت کمتر ہے۔ اس کے باوجود بھی اس کا شمار ان افراد میں ہوتا تھا جن کو مقتول تنخواہ کے علاوہ بھی مالی امداد دیا کرتا تھا۔ مسٹر الطاف! آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں یہی بتایا تھا نا؟''

''جی ہاں، میں نے یہی بتایا تھا'' وہ جز بز ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو باس کی مہربانی اور اعلیٰ ظرفی تھی کہ وہ ملزم کا خیال رکھتے تھے۔''

میں نے سوالات کے زاویے کو تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔ ''الطاف صاحب! کیا ملزم سے آپ کی کوئی ذاتی دشمنی ہے؟''

''اللہ نہ کرے۔'' وہ گھبراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''آپ کے بقول۔'' میں نے گواہ کی آنکھوں میں دیکھا۔ ''میرا موکل ایک جھگڑالو شخص تھا۔ کیا آپ سے بھی کبھی اس کا جھگڑا ہوا؟''

اس نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''دفتر کے کسی اور شخص کے ساتھ اس کا فساد یا پھڈا ہوا ہو؟''

وہ ندامت آمیز نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''آپ تو ماشاء اللہ عرصہ دس سال سے اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں ملازم ہیں۔ کئی ملازم آپ کے سامنے کمپنی میں آئے گئے ہوں گے۔ کسی ایسے شخص کا نام بتائیں جس سے کبھی میرے موکل کا کوئی سنجیدہ جھگڑا ہوا ہو؟''

الطاف نے نظر جھکا کر شرمندگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ایسا کوئی شخص نہیں ہے۔''

''گویا میرا موکل بڑا شریف قسم کا اور نام نہاد ''جھگڑالو'' تھا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں وکیل استغاثہ پر چوٹ کی۔

وکیل استغاثہ نے مجھے کھا جانے والی نظر سے دیکھنے پر اکتفا کیا مگر منہ سے کچھ نہیں بولا۔ میں اپنے سوالات کے ذریعے عدالت کے علم میں اپنے موکل کے بارے میں جو باتیں لانا چاہتا تھا وہ

میں لا چکا تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جج میرے چبھتے ہوئے اور تیکھے سوالات کو بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ آخر میں، میں نے گواہ الطاف سے تفریح لینے کے لئے سوال کیا۔

''الطاف صاحب! آپ نے وکیل استغاثہ کے آخری سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ نے ملزم فاروق احمد کو انتہائی غصے کی حالت میں یہ کہتے سنا تھا، میں اس توفیق کے بچے کو چھوڑوں گا نہیں۔'' ایک لمحے کا وقفہ دے کر میں نے ڈرامائی انداز میں کہا۔ ''آپ کے خیال میں ملزم نے مقتول کے کس بچے کا ذکر کیا تھا؟ میری معلومات کے مطابق تو مقتول بے اولاد تھا۔ کیا اس نے کوئی بچہ اڈاپٹ کیا ہوا تھا؟''

گواہ الطاف جھینپ گیا پھر وضاحت آمیز لہجے میں بولا۔ ''نہیں جناب! آپ نے میری بات کو سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ توفیق صاحب کی اولاد نہیں ہے۔ ملزم نے جو کہا وہ...... وہ ایک طرح کی گالی سمجھ لیں۔''

''اس وضاحت کا بہت بہت شکریہ الطاف صاحب۔'' میں نے کہا پھر جج کی جانب رخ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!''

میری جرح ختم ہوئے دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ جج نے پندرہ روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

اس پیشی پر وکیل استغاثہ نے میرے موکل کے خلاف اور مقتول کے حق میں جو تاثر قائم کرنے کی کوشش کی تھی، میری جوابی جرح نے اس تاثر کو بڑی حد تک ختم کر دیا تھا۔ میں نے اپنے سوالات سے متعدد مقامات پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ استغاثہ میں بہت سی خامیاں موجود ہیں۔

✽☆✽

آئندہ پیشی پر گواہوں کے کٹہرے میں اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کا جنرل منیجر آغا رفیق کھڑا تھا۔ اس وقت اس نے سفاری سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ پستہ قامت کا مالک ایک اسمارٹ شخص تھا۔

آغا رفیق جب اپنا حلفیہ بیان ریکارڈ کروا چکا تو وکیل استغاثہ نے اس پر مختصر جرح کی۔ اس نے اس سوال سے جرح کا آغاز کیا۔

''آغا صاحب! آپ اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے سب سے پرانے ملازم ہیں بلکہ ملازم کا لفظ آپ کے لئے موزوں نہیں ہے۔ مقتول توفیق علی نے آپ کو ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا تھا اور وہ آپ پر بہت بھروسا کرتے تھے۔ آپ یقیناً اس کمپنی کے ملازمین اور معاملات کو سب سے زیادہ، بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں وکیل صاحب!'' گواہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ توفیق صاحب کی محبت تھی کہ مجھے اس کمپنی میں کبھی اپنے ملازم ہونے کا احساس نہیں ہوا...... اور

میں نے بھی کمپنی کے کام کو اپنا ذاتی کام سمجھ کر ہی کیا ہے۔''

''شکریہ آغا صاحب!'' وکیل استغاثہ نے کہا پھر پوچھا۔''ملزم فاروق کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

آغا رفیق نے جواب دیا۔''ملزم کمپنی کا ایک اچھا ملازم تھا مگر مس ثوبیہ کی آمد کے بعد اس کی ساری اچھائی برائی میں بدل گئی تھی۔''

''ذرا وضاحت کریں گے آغا صاحب؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

''ملزم اپنے طور پر مس ثوبیہ پر فریفتہ ہو گیا تھا۔'' آغا رفیق نے بتایا۔''اور جواباً ثوبیہ سے بھی اسی طرز عمل کا طلب گار تھا لیکن میں ثوبیہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ بہت سنجیدہ اور بردبار لڑکی ہے۔ جب اس نے ملزم کو اس کی ہلکی حرکتوں پر سرزنش کی تو وہ دھمکیوں پر اتر آیا۔ اس نے ثوبیہ سے کہا کہ اگر اس نے ملزم کی بات نہ مانی تو وہ اسے بدنام کر کے رکھ دے گا۔ ثوبیہ جب اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہ ہوئی تو ملزم نے انتہائی گھٹیا پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے توفیق صاحب کے ساتھ ''نتھی'' کر دیا۔''

''جس کے نتیجے میں مقتول نے اسے نوکری سے نکال دیا؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

آغا رفیق نے کہا۔''یہ توفیق صاحب کی شرافت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے اتنی بڑی غلطی پر بھی پہلی فرصت میں ملزم کو برطرف نہیں کیا بلکہ اسے اپنی اصلاح کا موقع فراہم کیا۔ توفیق صاحب نے ملزم سے کہا تھا کہ وہ اگر مس ثوبیہ سے اپنے رویے کی معافی مانگ لے تو وہ اس کا قصور معاف کرنے کو تیار ہیں لیکن ملزم نے انتہائی ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا اور اپنے خود ساختہ بیان نما الزام پر قائم رہا۔ جواباً توفیق صاحب نے اسے نکال باہر کیا۔''

''آغا صاحب! ملزم کی برطرفی والا واقعہ کب پیش آیا تھا؟''

''بیس اگست کو۔''

''اور توفیق علی کا قتل پچیس اگست کو ہوا تھا؟''

''جی ہاں، بالکل اسی تاریخ کو وہ افسوس ناک واقعہ پیش آیا تھا۔''

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔''بیس سے پچیس اگست کے دوران میں ملزم کیا کرتا رہا تھا، آپ کو اس بارے میں کچھ خبر ہے؟''

''میں اس بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔'' آغا رفیق نے بتایا۔''ظاہر ہے، وہ اسی منصوبے پر کام کر رہا ہوگا جس کے نتیجے میں توفیق صاحب کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔'' ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے کہا۔''ویسے میں نے اڑتی اڑتی سنی تھی کہ وہ توفیق صاحب پر مقدمے کے سلسلے میں کسی وکیل سے ملنے بھی گیا تھا۔''

مزید دو چار سوالات کے بعد وکیل استغاثہ نے جرح کا سلسلہ موقوف کر دیا۔ اس کے بعد جج

کی اجازت حاصل کر کے میں گواہوں والے کٹہرے کے نزدیک آ گیا۔

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ گواہ آغا رفیق بالکل ہشاش بشاش تھا۔ اس کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی یا اضطراب نہیں جھلکتا تھا جیسا کہ عام طور پر گواہوں کے ساتھ دیکھنے میں آتا ہے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ پہلے بھی کئی بار گواہی کے مرحلے سے گزر چکا ہو۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور آغا رفیق سے پہلا سوال پوچھا۔''آغا صاحب! تھوڑی دیر پہلے وکیل صفائی سے گفتگو کے دوران میں مجھے معلوم ہوا ہے کہ مقتول آپ کو اپنا ملازم نہیں بلکہ ایک عزیز سمجھتا تھا۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ مقتول کے ساتھ آپ کے فیملی ٹرمز بھی تھے؟''

''بالکل، آپ ایسا ہی سمجھیں جناب۔''

میں نے یہ سوال ایک خاص مقصد کے تحت پوچھا تھا۔ مزید تصدیق کے لئے میں نے دریافت کیا۔''کیا آپ کا مقتول کے گھر میں آنا جانا بھی تھا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا۔''آپ کی رہائش شہر کے کس علاقے میں ہے؟''

''گلبرگ میں۔'' اس نے جواب دیا۔

''آغا صاحب! آپ چونکہ کمپنی کے سب سے دیرینہ رفیق کار ہیں اس لئے دفتر کے تمام ملازمین کے بارے میں بخوبی جانتے ہوں گے۔ آپ نے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم فاروق احمد کمپنی کا ایک اچھا ورکر تھا مگر مس ثوبیہ کی آمد کے بعد اس کے رنگ ڈھنگ بدل گئے تھے اور اس کی ساری اچھائی، برائی میں بدل گئی تھی۔ کیا یہ کچھ عجیب سی بات نہیں ہے؟''

وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔''عجیب سی کن معنوں میں ہے جناب؟''

میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''میری معلومات کے مطابق میرا موکل عرصہ تین سال سے بحیثیت آؤٹ ڈور کلرک کمپنی سے وابستہ تھا اور اس کی کارکردگی ہمیشہ اعلیٰ ترین رہی تھی۔ مس ثوبیہ پچھلے تین ماہ سے (یعنی وقوعہ کے وقت) اس دفتر میں کام کر رہی تھیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تین سال کی اچھائی محض تین ماہ میں برائی میں بدل جائے؟''

''آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں وکیل صاحب!'' گواہ نے ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔''اس دنیا میں ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں، محبت میں انسان اپنی سو سالہ زندگی کے معمولات کو بھی بیک جنبش ابرو بدل کر رکھ دیتا ہے۔''

میں نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔''گویا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ میرا موکل مس ثوبیہ کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا؟''

''آپ اپنے طور پر میری بات کا کچھ بھی مطلب نکالیں مگر حقیقت یہی ہے کہ اسے ثوبیہ سے

محبت وغیرہ کچھ بھی نہیں تھی۔'' وہ خفیف ہوتے ہوئے بولا۔ ''شاید میں مثال دینے میں تھوڑی غلطی کر گیا ہوں۔ مجھے یہ کہنا چاہئے تھا کہ انسان چاہے پچاس سال عبادت میں گزار دے، کسی نازک لمحے کی گراں غلطی اسے ذلت کے عمیق غار میں پھینک سکتی ہے اور وہ اعلیٰ سے ادنیٰ ہو جاتا ہے۔ ملزم کے ساتھ کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ وہ جتنا مستعد اور کارآمد تھا، ثوبیہ کے چکر میں پڑ کر اتنا ہی اپنے فرائض سے غافل ہو گیا تھا۔''

گواہ آغا رفیق کی لیپا پوتی کو بریک لگے تو میں نے پوچھا۔ ''آغا صاحب! آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس معاملے میں سراسر قصور میرے موکل ہی کا تھا۔ اس نے مس ثوبیہ کو پھانسنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اسے ڈرایا دھمکایا اور جب اس طرح بھی اس کا مقصد حاصل نہ ہوا تو اس نے ثوبیہ پر گھناؤنا الزام لگا دیا؟''

''جی ہاں، میں اسی موقف پر قائم ہوں۔''

''آپ کے خیال میں مقتول اور ثوبیہ کے درمیان اس نوعیت کے تعلقات نہیں تھے جیسا کہ میرے موکل نے بیان کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کیا آپ میرے موکل کے دعوے کی تردید کرتے ہیں؟''

وہ قطعیت سے بولا۔ ''میں کھلے الفاظ میں اس الزام کی تردید کرتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ مقتول کی پرائیویٹ لائف سے بھی آگاہی رکھتے ہیں؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اسی لئے تو اتنے وثوق سے کہہ رہے ہیں۔''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''میری نظر میں توفیق علی ایک باکردار اور شریف النفس انسان تھے۔ ان کی پرائیویٹ اور پبلک لائف بے داغ ہے۔''

میں نے پوچھا۔ ''آغا صاحب! کیا یہ سچ ہے کہ مقتول کا بہادر آباد کے علاقے میں کوئی فلیٹ بھی ہے؟''

''ہاں یہ بالکل سچ ہے۔''

''وہ فلیٹ بند رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس ہفتے میں ایک دو مرتبہ مقتول وہاں کچھ وقت گزارنے جاتا تھا؟''

وہ میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے بولا۔ ''توفیق صاحب کے اس شہر میں کئی فلیٹ ہیں جن میں سے اکثر کرائے پر اٹھے ہوئے ہیں۔ بہادر آباد والا فلیٹ بھی پہلے کرائے پر چڑھا ہوا تھا۔ دو ماہ پہلے ہی خالی ہوا تھا۔ (وقوعہ سے دو ماہ قبل) اگر کبھی کبھار توفیق صاحب وہاں وقت گزارنے چلے جاتے تھے تو اس میں قابل اعتراض بات کیا ہے۔ کیا اپنے ذاتی فلیٹ میں وقت گزارنا کوئی سنگین نوعیت کا جرم ہے؟ اگر یہ واقعی کوئی جرم ہے تو پلیز مجھے بتائیں، اس قسم کے جرائم کون سی دفعہ کے تحت آتے ہیں؟''

''شاید آپ نے میرے جملے پر غور نہیں کیا آغا صاحب!'' میں نے متحمل لہجے میں کہا۔ ''وقت گزارنے سے میری مراد کچھ اور تھی۔'' پھر میں نے اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

وہ قدرے ناگواری سے بولا۔ ''وکیل صاحب! آپ کے موکل کا خیال بالکل غلط ہے۔ اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے اس روز مقتول اور مس ثوبیہ کو فلیٹ میں داخل ہوتے دیکھا تھا مبنی بر دروغ ہے۔ یہ اس کے بیمار اور ناآسودہ ذہن کی پیداوار ہے۔ توفیق صاحب اتنی گری ہوئی حرکت کر ہی نہیں سکتے۔ دراصل آپ کا موکل مس ثوبیہ سے بری طرح خار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ اسی قسم کی غلیظ الزام تراشی کر سکتا تھا ورنہ اس بیان میں رتی برابر بھی سچائی موجود نہیں ہے۔''

میں نے ذرا مختلف انداز میں سوالات کو آگے بڑھایا۔ ''آغا صاحب! اب آپ ذرا سوچ سمجھ کر میرے سوالات کا جواب دیجئے گا......''

وہ قطع کلامی کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے پہلے بھی سوچ سمجھ کر آپ سے گفتگو کی ہے۔''

''یہ آپ کی نوازش ہے۔'' میں نے مصنوعی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''کیا آپ کو وہ دن یاد ہے جب میرے موکل کو نوکری سے نکالا گیا تھا؟''

وہ پُر وثوق لہجے میں بولا۔ ''جی ہاں، اچھی طرح یاد ہے۔ اس روز اگست کی بیس تاریخ تھی اور دن بدھ کا تھا۔''

''شکریہ۔'' میں نے ممنونیت سے لبریز لہجے میں کہا۔ ''اور پچیس اگست بروز پیر اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے مالک مسٹر توفیق علی کو ان کے دفتر میں قتل کر دیا گیا۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

''بجا فرمایا آپ نے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ استغاثہ کے گواہ ہیں اس لئے آپ استغاثہ کے موقف کے بھی حامی ہیں۔ آغا صاحب! استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ توفیق علی کو میرے موکل فاروق احمد نے قتل کیا تھا۔ ظاہر ہے، آپ بھی ایسا ہی سوچتے ہیں۔''

ایک لمحے کو رک کر میں نے سوالیہ نظر سے کٹہرے میں کھڑے آغا رفیق کو دیکھا۔ جب وہ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا تو میں نے پوچھا۔ ''ذرا سوچ کر بتائیں، کیا میرا موکل بیس اور پچیس اگست کے درمیان بھی کسی روز کمپنی کے دفتر آیا تھا؟''

ایک لحہ سوچنے کے بعد اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

میں نے پوچھا۔ ''آغا صاحب! وقوعہ کے روز آپ دفتر میں موجود تھے؟''

''جی ہاں، میں دفتر میں موجود تھا۔''

''اور بیس اگست کو؟''

''اس روز میں چھٹی پر تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے آئندہ روز معلوم ہوا تھا کہ ملزم کو نوکری سے فارغ کیا جا چکا تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''آپ نے ابھی میرے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ آپ وقوعہ کے روز دفتر میں موجود تھے۔ میں یہی سوال ایک دوسرے زاویے سے پوچھنا چاہوں گا۔'' ایک لمحے کو رک کر میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر کہا۔ ''کیا آپ وقوعہ کے وقت دفتر میں موجود تھے؟ میرا مطلب ہے، پچیس اگست، بروز پیر، دوپہر یعنی سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان؟''

واضح رہے کہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں توفیق علی کی موت کا وقت سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان بتایا گیا تھا۔

آغا رفیق نے چند لمحے غور کرنے کے بعد جواب دیا۔ ''جی بالکل، میں اس وقت کمپنی کے دفتر میں موجود تھا بلکہ اس روز میں پورا وقت دفتر کے اندر ہی رہا تھا۔''

''آغا صاحب!'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔ ''وقوعہ کے روز میرا موکل کتنے بجے اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر پہنچا تھا؟''

''لگ بھگ تین بجے۔''

''اور وہاں سے رخصت کب ہوا تھا؟''

''میرا خیال ہے، اس وقت ساڑھے تین بجے تھے۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ میرے موکل کی آمد و شد سے بخوبی آگاہ ہیں؟''

''جی ہاں، ایسا ہی ہے۔'' آغا رفیق نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو کب اور کس طرح معلوم ہوا کہ آپ کا باس قتل ہو چکا ہے؟''

''ملزم کے جانے کے بعد میں یہ معلوم کرنے توفیق صاحب کے پاس پہنچا کہ ملزم ان سے کیوں ملنے آیا تھا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ خبیث شخص توفیق صاحب کو قتل کر کے جا چکا ہے۔''

میں نے سوال کیا۔ ''میرے موکل کے جانے اور آپ کے مقتول کے دفتر یعنی کمرے میں داخل ہونے کے درمیانی وقفے میں کوئی اور شخص تو اس کمرے میں نہیں گیا تھا؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''اور یہ درمیانی وقفہ چند سیکنڈ کا تھا۔''

''کیا آپ کو یہ معلوم تھا کہ ملزم مقتول سے ملنے کیوں آیا تھا؟''

''مجھے چپڑاسی نے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ اپنے رویے پر معذرت کرنے آیا ہے۔'' آغا رفیق نے جواب دیا۔ ''میں نے چپڑاسی سے کہا کہ وہ اسے توفیق صاحب سے ملوا دے۔''

بعض دفاتر میں چپڑاسی لوگ بہت اہم اور کارآمد ہوتے ہیں۔ انہیں محض چپڑاسی ہی نہیں سمجھنا چاہئے۔ وہ کسی بھی سیکرٹری سے کم نہیں ہوتے۔ اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کا چپڑاسی مراد ایسا ہی چلتا پرزہ قسم کا ورکر تھا۔ کوئی اس کے علم میں لائے بغیر توفیق علی کے کمرے میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''آغا صاحب! ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ میرے موکل کے جانے کے بعد آپ صورت حال معلوم کرنے مقتول کے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ آپ یہ جاننا

چاہتے تھے کہ میرا موکل وہاں کیوں آیا تھا اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ چپڑاسی مراد کی زبانی آپ کو پہلے ہی پتہ چل چکا تھا کہ میرا موکل وہاں اپنے رویے پر شرمساری ظاہر کرنے آیا تھا۔ آپ کے کون سے بیان کو درست مانا جائے؟''

وہ ذرا سا گڑبڑایا، پھر سنبھل کر بولا۔ ''زیادہ مناسب یہ ہوگا کہ آپ میرے دونوں ہی بیانات کو درست تسلیم کرلیں۔''

''وہ کس طرح جناب؟''

''وہ اس طرح وکیل صاحب!'' آغا رفیق نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''یہ درست ہے کہ چپڑاسی مراد نے مجھے بتایا تھا کہ ملزم معذرت کرنے آیا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ اس نے کمرے کے اندر کس طرح معذرت کی ہے اور آیا یہ کہ توفیق علی نے اسے معاف بھی کیا ہے یا نہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ بند کمرے کے اندر فاروق اور توفیق صاحب کے درمیان کیا گفتگو ہوئی تھی۔''

''رفیق صاحب!'' اس مرتبہ میں نے گواہ کو ''آغا صاحب'' کی بجائے اس کے اصل نام سے مخاطب کیا۔ ''جب آپ مقتول کے کمرے میں داخل ہوئے تو آپ نے کیا دیکھا؟''

آغا رفیق نے جواب دیا۔ ''توفیق صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے تھے۔ اس طرح کہ ان کی گردن سامنے کو جھکی ہوئی تھی اور ان کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر دستے تک پیوست تھا...... اور وہاں سے جاری ہونے والا خون ان کے لباس کو بھگو رہا تھا۔''

''پھر آپ نے کیا، کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے توفیق صاحب کے قریب جا کر ان کا جائزہ لیا۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''اور یہ جان کر مجھے دلی صدمہ پہنچا کہ رفیق صاحب کا وجود زندگی سے خالی ہو چکا تھا۔''

''کیا آپ کو یقین تھا کہ مقتول کی زندگی کا چراغ بجھ چکا تھا؟''

''ہاں، مجھے ایسا ہی لگا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''آغا صاحب! کیا آپ کو یہ بات کچھ عجیب سی نہیں لگی تھی؟''

''کون سی بات جناب؟''

''یہی کہ آپ چند سیکنڈ میں مقتول کے کمرے میں داخل ہوئے اور اسی لمحاتی وقفے میں اس نے جان دے دی؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''حالانکہ جس شخص کے سینے میں خنجر گھونپا جائے وہ اتنی آسانی سے موت سے ہمکنار نہیں ہوتا۔ تھوڑا تڑپتا پھڑکتا ہے۔ مگر آپ تو بتا رہے ہیں مقتول بہت آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ایک اور بات بھی بہت اہم ہے۔ جب کسی شخص کے سینے میں چھری یا چاقو یا خنجر وغیرہ اتارا جاتا ہے تو مضروب کے دونوں ہاتھ غیر ارادی طور پر آلہ قتل کی جانب بڑھتے ہیں مگر یہاں تو ایسی کوئی بات نظر

نہیں آ رہی۔ کیا یہ مقتول کا غیر فطری ردِعمل نہیں؟''

اس موقع پر وکیل صفائی فوراً اپنے گواہ کی مدد کو لپکا۔ اس نے چیخ سے مشابہ آواز میں کہا۔

''آبجیکشن یور آنر!''

جج نے حیرت بھری نظر سے وکیل استغاثہ کو دیکھا اور پوچھا۔ ''وکیل صاحب! آپ کو کس بات پر اعتراض ہے؟''

''جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے احتجاجی لہجے میں کہا۔ ''لگتا ہے وکیل صفائی نے اچھی طرح اس کیس کا مطالعہ نہیں کیا۔ اگر انہوں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو توجہ سے پڑھا ہوتا تو اس قسم کے غیر ضروری اور بچکانہ سوالات کر کے وہ معزز عدالت کا قیمتی وقت برباد نہ کرتے۔''

میں نے تاؤ دلانے والی نظر سے وکیل مخالف کو دیکھا۔ جج نے وکیل استغاثہ سے دریافت کیا۔

''آپ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے کون سے اہم نکتے کا حوالہ دے رہے ہیں؟''

وکیل استغاثہ فخریہ انداز میں سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں واضح الفاظ میں درج ہے کہ مقتول کو بے ہوشی یا نیم بے ہوشی کی حالت میں موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ اس کے سینے میں خنجر اتارنے سے قبل اس کا گلا دبا کر اس کو ہوش و حواس سے بیگانہ کر دیا گیا تھا۔ ایسی صورت میں سینے میں خنجر گھونپنے پر وہ بھلا کس طرح کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کر سکتا تھا۔'' ایک لمحے کا توقف کر کے وکیل استغاثہ نے میری جانب دیکھا اور تحقیر آمیز لہجے میں بولا۔

''کمال ہے، اتنی چھوٹی سی بات ہے اتنے بڑے وکیل صاحب کی سمجھ میں کیوں نہیں آئی۔''

میں نے ترکی بہ ترکی کہا۔ ''دراصل آپ نے کبھی پہلے مجھے اتنی اچھی طرح سمجھایا بھی تو نہیں تھا۔''

میرا طنز وکیل استغاثہ کے پلے نہ پڑا۔ میں کٹہرے میں موجود استغاثہ کے گواہ آغا رفیق کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''آغا صاحب! تو آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مقتول کے سینے میں خنجر پیوست کرنے سے قبل اس کا گلا دبا کر اسے مزاحمت کے قابل ہی نہیں چھوڑا گیا تھا؟''

''جی ہاں، میں یہی کہنا چاہتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں یہ نکتہ بھی درج ہے کہ مقتول کے عقب سے اس کی گردن کو دبوچا گیا تھا کیونکہ قاتل (گلا گھونٹنے والے شخص) کے انگوٹھوں کے نشانات مقتول کی گدی پر ثبت پائے گئے تھے؟''

''جی ہاں، جی ہاں۔'' اس نے دو مرتبہ اثبات میں گردن ہلا دی۔

میں نے اچانک ایک عجیب سا سوال کیا۔ ''آغا صاحب! آپ کے کالر کا نمبر کیا ہے؟''

اس نے بے دھڑک جواب دیا۔ ''پندرہ۔''

''اور مقتول کے کالر کا نمبر کیا تھا؟''

''اٹھارہ پلس۔''

''یعنی لگ بھگ ساڑھے اٹھارہ؟''

''آپ کہہ سکتے ہیں۔'' آغا رفیق نے جواب دیا۔

اس کے ساتھ ہی عدالت کا مقررہ وقت ختم ہو گیا۔

میری اختتامی گفتگو نے وکیل استغاثہ کو الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ میں نے یہ بے تکے اور غیر متعلق سوالات کیوں کئے تھے۔

جج نے ایک ماہ بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔

⁂☆⁂

آئندہ دو پیشیوں پر استغاثہ کی جانب سے تین گواہوں کو بھگتایا گیا۔ ان کے بیانات اور ان پر ہونے والی جرح میں کوئی نئی بات نہیں تھی اس لئے اس کارروائی کا احوال بیان کرنے سے اجتناب برتتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

استغاثہ کی جانب سے سب سے آخر میں مس ثوبیہ کو گواہی کے لئے بلایا گیا۔ وہ کٹہرے میں آ کر کھڑی ہوئی تو حاضرین عدالت کی نظریں اسی پر ٹک گئیں۔ ثوبیہ کے سانولے سلونے حسن میں ایک عجیب قسم کی جاذبیت پائی جاتی تھی۔ اس کا جسم صحت مند اور نقوش تیکھے تھے۔ وہ سائنس گریجویٹ تھی۔ اس کی عمر ستائیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔ ثوبیہ کی دراز قامتی نے اس کی کشش میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

اس روز ثوبیہ نے نہایت قیمتی لان کا تھری پیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ سوٹ کے پرنٹ میں بے بی پنک کلر غالب تھا جو ثوبیہ کی سانولی رنگت کے باعث اس کی شخصیت کو مزید نمایاں اور دیدہ زیب بنا رہا تھا۔ وہ اپنے والد امین الدین کے ساتھ عدالت آئی تھی۔ امین الدین کسی سرکاری محکمے سے ریٹائر ہونے کے بعد واقعتاً ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا۔

ثوبیہ نے سچ بولنے کا حلف اٹھانے کے بعد اپنا طویل ترین بیان ریکارڈ کروایا۔ یہ بیان، پولیس کو دیئے گئے بیان سے کہیں زیادہ مفصل تھا۔ ظاہر ہے، بیان کا غالب حصہ میرے موکل کی مخالفت اور مقتول کی موافقت میں تھا۔

وکیل استغاثہ نے زورِ وکالت آزماتے ہوئے جرح کا آغاز کیا۔ ''ثوبیہ صاحبہ! آپ اس مقدمے میں ایک اہم گواہ کی حیثیت رکھتی ہیں کیونکہ ملزم نے پچیس اگست کو جو 'کارنامہ' سرانجام دیا ہے اس کے پیچھے ملزم کی نفرت کی وجہ آپ کی طرف سے ہونے والی حوصلہ شکنی ہے۔''

ثوبیہ نے تیز لہجے میں پوچھا۔ ''تو کیا آپ کے خیال میں مجھے ملزم کی حوصلہ افزائی کرنا چاہئے تھی؟''

''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔'' وکیل استغاثہ نے بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ''آپ نے

بالکل ٹھیک کیا اور وہی کیا جو آپ کو کرنا چاہئے تھا۔"

ثوبیہ مطمئن نظر آنے لگی۔ وکیل استغاثہ نے پوچھا۔"ثوبیہ صاحبہ! ملزم اپنی دانست میں آپ کی محبت میں مبتلا ہوگیا تھا۔ کیا آپ کو اس کے رویے میں محبت والی کوئی بات نظر آئی؟"

"محبت کو بدنام کرنے میں ایسے ہی لوگوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔" وہ میرے موکل کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔"محبت کرنے والے ایسی چھچھوری حرکتیں نہیں کرتے......اور وہ جس ہستی کو چاہتے ہیں اس کے عیب بھی انہیں خوبیاں نظر آتی ہیں مگر ملزم نے جس طرح الزام تراشی کر کے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے اس سے اس کی ذہنی پستی اور کم ظرفی کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ تو اگر محبت کا نام بھی لیں تو ان کی زبان کو گدی سے کھینچ لینا چاہئے۔" ایک لمحے کو رک کر ثوبیہ نے میرے موکل کی جانب دیکھا اور نفرت انگیز لہجے میں وکیل استغاثہ سے پوچھا۔"وکیل صاحب! اس قسم کے مجرموں کے لئے قانون میں کوئی دفعہ نہیں ہے؟"

میرا موکل فاروق احمد خاموشی سے سر جھکائے کٹہرے میں کھڑا تھا۔ کسی بھی مقدمے کی عدالتی کارروائی کے دوران میں ملزم کی حیثیت بڑی نازک اور حسرت ناک ہوتی ہے۔ وکیل استغاثہ اور استغاثہ کے گواہان حسب توفیق اس پر تلخ و ترش جملوں کی بارش کرتے رہتے ہیں اور اسے یہ سب کچھ خاموشی سے سننا اور صبر سے برداشت کرنا ہوتا ہے کیونکہ اسے اپنے خلاف کئے گئے کسی تبصرے کا جواب دینے کی اجازت نہیں ہوتی۔

وکیل استغاثہ نے ثوبیہ کے جذباتی سوال کو نظرانداز کر کے جرح کا سلسلہ جاری رکھا۔"ثوبیہ صاحبہ! آپ مقتول کی پرائیویٹ سیکرٹری تھیں یعنی مقتول کے رازوں کی امین۔ آپ نے اپنے باس کو کیسا پایا؟"

"انتہائی شائستہ اور خوش اخلاق۔" ثوبیہ نے جذباتی لہجے میں کہا۔"توفیق صاحب ایک نستعلیق انسان تھے۔"

"آپ کے ساتھ ان کا رویہ کیسا تھا؟"

"بزرگانہ اور مشفقانہ۔"

"اور دوسرے ملازمین کے ساتھ؟"

"وہ اپنے تمام ورکرز سے اچھا سلوک کرتے تھے۔"

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔"ملزم کے بقول اسے آپ سے محبت ہوگئی تھی۔ کیا اس نے آپ سے اپنی محبت کا اظہار بھی کیا تھا؟"

"جی ہاں، یہ کام تو اس نے انتہائی ڈھٹائی نما دلیری سے کیا تھا۔"

"اس وقت آپ کے احساسات کیا تھے؟"

"اس منحوس کی بیہودگی سے مجھے سخت اذیت پہنچی تھی۔"

"پھر آپ نے کیا ردعمل ظاہر کیا تھا؟"

"مجھے اس وقت غصہ تو بہت آیا تھا۔" ثوبیہ نے جواب دیا۔"مگر میں نے کمال ضبط سے کام لیا تھا۔ میں خوامخواہ کی افواہوں کو جنم نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے ملزم کو واضح الفاظ میں بتا دیا تھا کہ مجھے اس سے یا اس کی نام نہاد محبت سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ کسی اور دروازے پر دستک دے۔ یہ میری شرافت تھی کہ میں نے اسے سمجھانے پر اکتفا کیا تھا حالانکہ وہ اپنی حرکت پر بری طرح بے عزت ہونے کا مستحق تھا۔"

وکیل استغاثہ نے سوال کیا۔"کیا آپ کے سمجھانے بجھانے کا اس پر کوئی اثر بھی ہوا تھا؟"

"قطعاً نہیں۔" ثوبیہ افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔"اگر اس میں ذرا سی بھی غیرت ہوتی تو یہ دوبارہ میری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ مگر ایسے ڈھیٹوں پر کلامِ نرم و نازک کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لاتوں کے بھوت جس طرح باتوں سے نہیں مانتے بالکل اسی طرح جوتوں کے عادی نصیحتوں سے رام نہیں ہوتے۔"

وکیل استغاثہ نے کریدنے والے انداز میں کہا۔"ثوبیہ صاحبہ! آپ یقیناً یہ کہنا چاہتی ہیں کہ آپ کی سرزنش کے باوجود بھی ملزم آپ کو تنگ کرنے سے باز نہیں آیا تھا اور اس نے اپنی ہوس نامی محبت کا اظہار جاری رکھا تھا؟"

"جی ہاں، میں یہی کہنا چاہتی ہوں۔"

"اس کے بعد کیا ہوا تھا؟"

ثوبیہ نے بتایا۔"جب ایک موقع پر میں نے ملزم سے کہا کہ اگر وہ اپنی مکروہ روش سے نہ ہٹا تو میں اس کی شکایت باس سے کردوں گی تو اس نے دیدہ دلیری سے کہا کہ اسے ایسی شکایتوں کی پرواہ نہیں۔ میں چاہوں تو ملک کے وزیراعظم کے پاس اس کی شکایت درج کروادوں۔ وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ ایک لمحے کو رک کر ثوبیہ نے بڑے ڈرامائی انداز میں کہا۔"اس موقع پر ملزم سے ایک ڈائیلاگ بھی مارا تھا۔ محبت کرنے والے کسی چیز سے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ جب پیار کیا تو ڈرنا کیسا۔"

وکیل استغاثہ نے پوچھا۔"ثوبیہ صاحبہ! ملزم کے اس طرزِ عمل کے بعد کیا آپ نے اپنے باس سے اس کی شکایت کردی تھی؟"

"کاش میں ایسا کر دیتی۔" وہ اپنے لہجے میں مصنوعی دکھ بھرتے ہوئے بولی۔

"آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟" وکیل استغاثہ نے پوچھا۔

ثوبیہ نے بتایا۔"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ کاش! میں نے اس موقع پر توفیق صاحب کو اس شیطان کے کرتوت سے آگاہ کر دیا ہوتا تو مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ میں نے اپنی فطری شرافت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ملزم کو ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا مگر مجھے کیا معلوم تھا، اس خبیث کا آئندہ قدم اتنا خطرناک ہوگا۔" یہاں تک پہنچ کر اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے اپنے دوپٹے سے آنکھوں کے

گوشے پونچھے حالانکہ وہاں آنسو نام کی کوئی چیز نمودار نہیں ہوئی تھی۔ اس نے رقت آمیز آواز میں کہا۔ ''اس شخص نے مجھ سے انتقام لینے کے لئے مجھ پر جھوٹا الزام لگایا۔ مجھے توفیق صاحب کے ساتھ ملوث کر کے اس نے گندی ذہنیت کا ثبوت دیا تھا۔''

''اس کے بعد تو آپ نے اپنے باس کو ضرور اس سلسلے میں سب کچھ بتا دیا ہوگا؟'' وکیل استغاثہ نے چھیڑنے والے انداز میں کہا۔

''اس کے سوا اور چارہ بھی کیا تھا!''

''پھر مقتول نے کیا ایکشن لیا؟''

''انہوں نے اس نامعقول شخص کو سمجھانے کی پوری کوشش کی۔'' ثوبیہ نے کٹہرے میں کھڑے فاروق احمد کی جانب اشارہ کیا۔ ''مگر اس کی الٹی کھوپڑی میں کوئی نصیحت نہ سما سکی۔ وہ ڈھٹائی سے اپنے غلیظ موقف پر ڈٹا رہا۔ بالآخر توفیق صاحب نے اسے نوکری سے نکال کر ''خس کم، جہاں پاک'' کے فارمولے پر عمل کر ڈالا۔''

''اور ٹھیک چار روز بعد یعنی پچیس اگست کو ملزم نے اپنے سابق باس کی زندگی کا چراغ گل کر دیا؟''

''بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔'' وہ آہنی لہجے میں بولی۔

''مجھے اور کچھ نہیں پوچھنا جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے جج کی جانب مڑتے ہوئے کہا اور اپنے لئے مخصوص نشست پر آ کر بیٹھ گیا۔

اپنی باری پر میں جرح کے لئے ثوبیہ والے کٹہرے کی جانب بڑھا۔ میں نے ثوبیہ کو مخاطب کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

''ثوبیہ صاحبہ! آپ کا نام بہت خوبصورت ہے۔'' میں نے تعریفی انداز میں کہا۔

''اس تعریف کا شکریہ۔'' وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے پوچھا۔ ''اس دلکش نام کے کیا معنی ہیں؟''

''یہ نام عربی لفظ ''ثوب'' سے بنا ہے۔'' ثوبیہ نے جواب دیا۔ ''جس کے معنی لباس، کپڑا، پوشاک کے ہیں۔''

''واہ، یہ تو سونے پہ سہاگا والی بات ہوگئی۔'' میں نے خوش دلی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ تو خوش لباس بھی ہیں۔''

غیر مرد کے منہ سے اپنی تعریف سننا ہر عورت کی کمزوری ہوتی ہے۔ وہ بھی خوشی سے کھل اٹھی۔ میں یہ چھیڑ چھاڑ چھوڑ کر اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ میں نے پوچھا۔

''ثوبیہ صاحبہ! آپ نے کچھ دیر پہلے وکیل استغاثہ کے ایک سوال کے جواب میں بتایا ہے کہ ملزم آپ سے محبت کا دعوے دار تھا۔ تاہم آپ کو اس کے رویے میں محبت والی کوئی بات نظر نہیں آئی

تھی۔ کیا آپ کے پاس محبت کو پرکھنے کا کوئی آلہ موجود ہے یا آپ کو کوئی ایسا فارمولا معلوم ہے جس کو استعمال کر کے محبت کو جانچا جا سکتا ہو؟''

وہ میرے بدلے ہوئے لہجے اور انداز سے پہلے تو گھبرائی، پھر بوکھلاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

''سچی محبت اور ڈرامے بازی کو جانچنے کے لئے کسی آلے یا فارمولے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انسان کا دل خود بخود اس کی تصدیق یا تردید کر دیتا ہے۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا آپ نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟''

''میں آپ کے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ رکھائی سے بولی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ اس کا استحقاق رکھتی ہیں۔ میں نے تو صرف اپنی معلومات کے لئے پوچھا تھا۔ خیر، کوئی بات نہیں۔''

وہ معاندانہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ میری چھیڑ چھاڑ سے تھوڑی دیر پہلے اس کے چہرے پر جو شگفتگی اور چمک پیدا ہوئی تھی وہ اب معدوم ہو چکی تھی۔ میں نے وہاں اب گہری سنجیدگی کو ڈیرے ڈالے دیکھا۔

میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ثوبیہ صاحبہ! آپ نے محبت کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ محبت کرنے والے اپنے محبوب کی عیب جوئی نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنے محبوب کی خامیاں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ کیا آپ کی بھی یہی خواہش تھی کہ میرا موکل آپ کا اصل چہرہ دیکھ لینے کے بعد بھی آپ سے محبت کا دم بھرتا رہے، گویا ایک بے وقوف مسلسل کا کردار ادا کرتا رہے؟''

''مجھے سخت اعتراض ہے جناب عالی!'' وکیل استغاثہ نے اپنا وجود ثابت کرنے کے لئے مداخلت ضروری جانی اور کہا۔ ''جناب عالی! وکیل صفائی، استغاثہ کی معزز گواہ پر کیچڑ اچھالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

میں نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کو دیکھا اور کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہاتھ تو صاف ہیں۔''

وکیل استغاثہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''آپ کے ہاتھ صاف ہیں، نہ دل اور نہ ہی آپ کی نیت صاف ہے۔''

میں نے اسے مزید غصہ دلانے کے لئے نارمل لہجے میں کہا۔ ''یہ تو مجھ پر الزامات کی بارش ہے۔ آخر میری خطا کیا ہے؟''

''آپ استغاثہ کی معزز گواہ کی توہین کر رہے ہیں۔''

''میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''آپ نے ثوبیہ کے اصل چہرے کی بابت اظہار خیال کیا ہے۔'' وکیل استغاثہ تڑپ کر بولا۔

''آپ نے اس کے اصل چہرے میں ایسی کیا خرابی دیکھ لی ہے؟''

جج نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''آرڈر پلیز۔ آپ لوگ آپس میں الجھنے کی بجائے مقدمے کی کارروائی کو آگے بڑھائیں۔''

وکیل استغاثہ کی تکلیف رفع نہ ہوئی۔ اس نے جج کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''یور آنر! فاضل وکیل حد سے زیادہ گزر رہے ہیں۔ وہ اپنے موکل کے میری گواہ پر لگائے گئے الزام کی توثیق کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے اوچھے ہتھکنڈوں سے باز رہنے کی تلقین کی جائے۔''

جج نے الجھی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا، میں نے کہا۔ ''جناب عالی! میرا موکل اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے باس توفیق کے قتل کے الزام میں مصیبت میں مبتلا ہے۔ استغاثہ کے مطابق میرے موکل نے یہ قتل حاسدانہ اور رقیبانہ جذبات میں مغلوب ہو کر کیا ہے۔ میرے موکل نے ثوبیہ اور مقتول کے تعلقات کے حوالے سے جو انکشاف کیا ہے اس کا ذکر کئے بغیر بات نہیں بنے گی۔ اگر گواہ ثوبیہ کی بات کو درست مان لیا جائے تو پھر مقتول اور گواہ کے بیچ ایسا کوئی بندھن نظر نہیں آتا جس سے میرا موکل کسی قسم کے حسد یا رقابت میں مبتلا ہوتا۔ اس صورت میں استغاثہ کا موقف خاصا کمزور ہو جاتا ہے۔ میں جس پوائنٹ پر گواہ ثوبیہ سے سوالات کر رہا ہوں اس میں قباحت یا ناشائستگی والی کوئی بات نہیں ہے۔''

جج تھوڑی دیر تک میری وضاحت پر غور کرتا رہا۔ پھر با آواز بلند بولا۔ ''بیگ صاحب! پلیز پروسیڈ۔''

میں کٹہرے میں کھڑی ثوبیہ کی جانب متوجہ ہو گیا۔ ''ثوبیہ صاحبہ! آپ نے ابھی تک میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اگر سوال آپ کو یاد نہ رہا ہو تو میں دہرا دوں؟''

وہ سنبھلے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں آپ کے سوال کو بھولی ہوں اور نہ ہی آپ کے موقف کو۔ میرا جواب یہ ہے کہ محبت کے حوالے سے میں نے اپنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ان کا ملزم کے شیطانی الزام سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نہ تو یہ چاہتی تھی کہ وہ ہر حال میں مجھ سے محبت کرتا رہے اور نہ ہی مجھے ایسی کوئی خواہش تھی کہ وہ میرے ہاتھوں بے وقوف بنتا رہے۔ سیدھی اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے ملزم، اس کی نام نہاد محبت اور اس کے عزائم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں تو اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی۔''

''ثوبیہ صاحبہ!'' میں نے سوال کیا۔ ''اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں آنے سے پہلے آپ کس ادارے میں کام کرتی تھیں؟''

''میں یہ بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''میں بتا دیتا ہوں۔'' میں نے سادہ سے لہجے میں کہا۔ ''اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں آپ نے تین ماہ کام کیا تھا کہ اس کمپنی کا باس جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اس سے قبل آپ اسٹار شپنگ کمپنی میں دو ماہ

کام کر چکی ہیں۔ اس سے پہلے اللہ والا کنسٹرکشن کمپنی میں آپ کی ملازمت کی مدت چار ماہ ہے۔ ازیں قبل آپ بلال اینڈ کو میں ٹائپسٹ تھیں اور چھ ماہ کے بعد آپ کو اس کمپنی سے برطرف کر دیا گیا تھا، اس سے پہلے مقبول برادرز میں آپ ملازمت کرتی تھیں۔ وہاں بھی آپ نے صرف دو ماہ تک کام کیا تھا۔ اس سے پہلے......''

''یہ کیا آپ نے ''اس سے پہلے'' لگا رکھی ہے؟'' وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ میرے ماضی کو کھنگالتے پھریں۔ آپ کو یہ معلومات کس نے دی ہیں؟''

''کیا ان اعداد و شمار میں کوئی سقم ہے؟''

وہ کچھ نہیں بولی۔ غصے سے مجھے گھورتی رہی۔ میں نے کہا۔ ''ثوبیہ صاحبہ! مجھے آپ کے ماضی کو کریدنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے لیکن مجھے اپنے موکل کو بے گناہ ثابت کرنا ہے۔ اس کے لئے گڑے مردے اکھاڑنا نہایت ضروری ہے۔'' ایک لمحے کے توقف سے میں نے سوال کیا۔ ''کیا یہ غلط ہے کہ بلال اینڈ کو اور اسٹار شپنگ کمپنی سے آپ کو نکالا گیا تھا؟ اللہ والا کنسٹرکشن کمپنی اور مقبول برادرز میں بھی آپ کا ایک ایک اسکینڈل مشہور ہو گیا تھا اور......''

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر چیخ اٹھی۔ ''آپ کو میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''گویا آپ نے تسلیم کر لیا ہے کہ میرے بیان کردہ حقائق آپ کے ذاتی معاملات کی تفصیل ہیں۔ اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں پیش آنے والی صورتِ حال آپ کے لئے کوئی نیا تجربہ نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ سے نتھی شخص اپنی جان گنوا بیٹھا ہے جس کے قتل کے جھوٹے الزام میں میرا موکل قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس میں اپنے قدموں پر کھڑے رہنے کی سکت باقی نہیں رہی۔ وہ چوبی ریلنگ کا سہارا لینے پر مجبور ہو گئی۔ اس وقت وہ پورے وجود سے کانپ رہی تھی۔

عدالت کا وقت تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ جج نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''بیگ صاحب! آپ گواہ سے کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''میں اپنی جرح مکمل کر چکا ہوں جناب عالی!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں ثوبیہ اور مقتول کے حوالے سے جج کی توجہ جس طرف مبذول کروانا چاہتا تھا، اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا، جج بڑی دلچسپی سے میرے سوالات سن رہا تھا اور مطمئن انداز میں گردن بھی ہلاتا جا رہا تھا۔

جج نے مجھ سے سوال کرنے کے بعد دس روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت کے برخاست کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ ''دی کورٹ از ایڈ جارنڈ۔''

✲☆✲

میرا موکل اور اس مقدمے کا ملزم فاروق احمد وکیل استغاثہ کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ میں نے اسے نہایت ضروری نکات اچھی طرح ذہن نشین کروا دیئے تھے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ وکیل مخالف کی جرح کا سامنا کر رہا تھا۔

وکیل استغاثہ نے گھما پھرا کر تلخ و ترش انداز میں میرے موکل پر لگ بھگ ایک گھنٹے تک سخت جرح کی مگر اسے نروس یا لاجواب کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اپنی باری پر میں فاروق احمد والے کٹہرے کے پاس آ گیا۔

''مسٹر فاروق!'' میں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''جب تمہیں اسکائی ٹریڈنگ کمپنی سے برطرف کیا گیا تھا تو تمہارے احساسات کیا تھے؟''

میں نے دانستہ ثوبیہ اور فاروق کی محبت کے ذکر کو نہیں چھیڑا تھا۔ اس معاملے کی تمام تفصیل فاروق کے حلفیہ بیان میں موجود تھی۔ میں اس کا اعادہ کر کے معزز عدالت کا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں میں نے اپنے ہاتھ میں موجود ترپ کے پتوں کو کھیلنا تھا۔ دوسرے رنگوں کے تمام کارڈز تو کھیلے جا چکے تھے۔ اب ٹرمپ کارڈز کی باری تھی۔ انہی اہم چالوں سے میں نے بازی مارنا تھی۔ مجھے پوری امید تھی کہ میں صورتِ حال کا پانسہ پلٹنے میں صدفی صد کامیاب رہوں گا۔

فاروق نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اس موقع پر میرے احساسات بہت شکستہ اور جذبات انتہائی مجروح تھے۔''

''پھر تم نے کیا قدم اٹھایا؟''

''میں آئندہ روز سیدھا آپ کے پاس آیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مگر آپ نے بھی میری حوصلہ شکنی کی اور میں دل برداشتہ ہو کر آپ کے دفتر سے نکل آیا۔''

''اس کے بعد کیا ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

فاروق نے بتایا۔ ''دوسرے روز میں اپنے ایک دوست سے ملا۔ اس کا نام وحید ہے اور وہ اسکائی ٹریڈنگ کمپنی میں کلرک ہے۔ وحید کی رہائش بھی محمود آباد میں ہے۔ وحید نے مجھے ایک نئی راہ سجھائی۔''

''کون سی نئی راہ؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ بولا۔ ''وحید نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس سلسلے میں بیگم توفیق سے ملوں۔ وہ خدا ترس اور نیک دل خاتون ہیں۔ وہ یقیناً میری مدد کریں گی۔''

میں نے پوچھا۔ ''کس قسم کی مدد؟''

اس نے بتایا۔ ''مالی مدد۔'' پھر بولا۔ ''وحید کا خیال تھا کہ اچانک نوکری سے نکال کر توفیق نے میرے ساتھ جو زیادتی کی ہے، بیگم توفیق اس کا ازالہ کر دیں گی۔''

''تو تم نے اپنے دوست وحید کے مشورے پر عمل کر ڈالا؟''

''دل تو نہیں چاہ رہا تھا۔'' وہ بددلی سے بولا۔ ''میں توفیق اور اس سے وابستہ کسی بھی شخص سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا تھا مگر وحید کے سمجھانے پر یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ اگر بیگم توفیق سے کچھ رقم نکل سکتی ہے تو اپنا حق جانتے ہوئے مجھے وہ رقم ضرور حاصل کرنا چاہئے۔'' ایک لمحے کے توقف سے اس نے اضافہ کیا۔ ''بیگ صاحب! میں آپ کے پاس بھی تو اسی مقصد کے تحت آیا تھا کہ توفیق پر مقدمہ دائر کر کے اس سے اپنا حق وصول کروں گا۔ اب مجھے اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ایک آسان راہ نظر آ رہی تھی تو میں پیچھے کیوں ہٹتا۔ یہ تو سراسر بے وقوفی والی بات ہوتی۔''

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''پھر تم نے کیا، کیا فاروق احمد؟''

وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''میں نے بیگم توفیق سے ملاقات کی۔ یہ تیئس اگست کی بات ہے۔ انہوں نے پوری توجہ سے میرا مسئلہ سنا اور کہا کہ میں پیر کے روز دفتر جا کر توفیق صاحب سے ملوں۔ وہ اس دوران میں اسے میرے حق میں ہموار کر دیں گی۔ یہ بات مجھے عجیب سی لگی، تاہم بیگم صاحبہ نے مجھے یقین دلایا کہ وہ توفیق کو اس بات کے لئے قائل کر لیں گی کہ وہ شرافت سے میرے حقوق ادا کر دے۔ میں مطمئن ہو کر واپس آ گیا۔ میں نے پیر کے روز دفتر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔''

''پھر تم نے اپنے فیصلے پر عمل بھی کیا؟''

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ''مسٹر فاروق! تم وقوعہ کے روز یعنی پچیس اگست بروز پیر کتنے بجے اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے دفتر پہنچے تھے؟''

''ٹھیک دو بجے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''بیگم صاحبہ نے اسی وقت مجھے دفتر پہنچنے کی تاکید کی تھی۔''

میں نے سوال کیا۔ ''کیا بیگم صاحبہ کے کہنے کے مطابق مقتول نے تمہاری مالی مدد کی تھی؟''

''بالکل نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولا۔ ''بلکہ وہ تو اس بات ہی سے انکاری تھا کہ بیگم صاحبہ نے اس سلسلے میں اس سے کوئی بات کی تھی۔ توفیق نے کہا کہ اس نے مجھے اس لئے اپنے کمرے میں بلا لیا تھا کہ اسے بتایا گیا تھا، میں معافی مانگنے اس کے پاس آیا ہوں۔''

''کیا تم نے مقتول سے ملنے کے لئے یہی جواز بتایا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ''بیگم صاحبہ! نے مجھے ایسا کرنے کا کہا تھا۔ میں نے ان کی ہدایت کے مطابق چپڑاسی مراد سے کہا کہ میں اپنے رویے کے سلسلے میں معافی مانگنے آیا ہوں۔ چنانچہ توفیق نے فوراً مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا۔''

''جب تمہیں توفیق کے کمرے میں پہنچ کر ایک مختلف صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تو پھر تم نے کیا، کیا؟'' میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے، مجھے غصہ تو بہت آیا۔" وہ برہمی سے بولا۔ "مگر میرے بس میں کچھ بھی نہیں تھا لہٰذا میں نے واپسی کی راہ اپنائی۔"

"تم اس روز دفتر سے کتنے بجے نکلے تھے؟"

"تقریباً ڈھائی بجے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ تم ڈھائی بجے ہی دفتر سے نکلے تھے؟"

"پورا یقین ہے۔"

"اس یقین کی وجہ؟"

وہ رسان سے بولا۔ "جب میں دفتر سے نکل کر مین روڈ پر آیا تو سامنے سے دفتر کا چوکیدار خلق داد خان آرہا تھا۔ وہ ظہر کی نماز پڑھ کر آرہا تھا۔ میں نے اس سے علیک سلیک بھی کی تھی اور وقت بھی پوچھا تھا۔ خلق داد نے اپنی گھڑی میں دیکھ کر مجھے ڈھائی بجے کا وقت بتایا تھا۔"

"کیا خلق داد خان اس بات کی گواہی دے سکتا ہے؟"

"وہ نمازی پرہیزگار شخص ہے۔" فاروق احمد نے تعریفی انداز میں کہا۔ "میرا خیال ہے وہ سچ بولنے سے اجتناب نہیں کرے گا۔"

میں نے اچانک پوچھا۔ "فاروق! تمہاری بالشت کتنی ہے؟"

"آٹھ انچ۔" اس نے ہاتھ کو پھیلاتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے مسکرا کر وکیل استغاثہ کی جانب دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ کہا۔

پھر عدالت کا وقت ختم ہوگیا۔

✵☆✵

آئندہ پیشی پر دلائل کی باری تھی۔ گواہوں پر جرح مکمل ہو چکی تھی۔ پہلے وکیل استغاثہ نے میرے موکل کے خلاف دلائل دیئے لیکن میں نے اس کے دلائل کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس کے بعد میں نے دلائل دینا شروع کیے۔

"جناب عالی! میرا موکل بے گناہ ہے۔ اسے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ میں اپنے موقف کو ثابت کرنے کے لئے یہاں چند اہم نکات پیش کروں گا۔

"استغاثہ کے دعوے کے مطابق وقوعہ کے روز یعنی پچیس اگست کو میرا موکل اپنے سابق باس سے معافی مانگنے اس کے دفتر پہنچا اور اسی بہانے اسے قتل کر کے واپس چلا گیا۔ استغاثہ نے میرے موکل کی آمد تین بجے اور روانگی ساڑھے تین بجے بیان کی ہے۔ یہ دروغ گوئی استغاثہ کی مجبوری ہے۔ کیونکہ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ مقتول کی موت کا وقت سہ پہر تین اور چار بجے کے درمیان بتاتی ہے۔ میرے موکل کی گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ کرنے کے لئے یہ جھوٹ تراشا گیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ میرا موکل وقوعہ کے روز دو بجے دفتر پہنچا اور ڈھائی بجے وہاں سے رخصت ہوگیا۔

اس امر کی تصدیق اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے چوکیدار خلق داد خان سے کی جاسکتی ہے۔

"جناب عالی! اب ذرا جائے وقوعہ اور وہاں کے اہم امور کا جائزہ لیتے ہیں۔" میں نے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "استغاثہ کے مطابق میرے موکل نے پہلے گلا دبا کر مقتول کو بے ہوش یا نیم بے ہوش کیا، بعدازاں اس کے سینے میں خنجر اتار کر نو دو گیارہ ہوگیا۔ استغاثہ کا یہ دعوئی جھوٹ کا پلندا معلوم ہوتا ہے۔

"پہلی بات تو یہ کہ میرا موکل کسی بھی صورت میں مقتول کی گردن کو اپنے ہاتھوں کے حلقے میں کس کر دبا نہیں سکتا کجا یہ کہ وہ عقبی سمت سے مقتول پر قابو پالیتا۔ یہاں ایک بات غور طلب ہے۔ استغاثہ کے گواہ جنرل منیجر آغا رفیق کا بیان ہے کہ مقتول کا کالر پلس اٹھارہ انچ کا تھا یعنی وہ اچھی خاصی موٹی تازی چربیلی گردن والا شخص تھا۔ میرے موکل کی بالشت آٹھ انچ کی ہے۔ اگر وہ دونوں ہاتھوں کے حلقے میں کسی چیز کو دبوچنا چاہے یا زور لگا کر دبانا چاہے تو اس شے کی موٹائی زیادہ سے زیادہ چار انچ ہونا چاہئے۔ یا یوں کہہ لیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ پندرہ نمبر کے کالر والے شخص کی گردن دبوچ سکتا ہے۔ مقتول کی گردن تو اٹھارہ پلس کالر کی تھی۔ اسی ذیل میں ایک اور بات قابل توجہ ہے...... اور وہ یہ کہ کیا مقتول اتنا ہی بے بس اور لاچار تھا کہ وہ خاموشی سے کرسی پر بیٹھا رہا اور موکل اس کی گردن پر طبع آزمائی میں مصروف رہا؟ یہ کام کوئی ایسا ہی شخص کر سکتا ہے جس پر مقتول اندھا اعتماد کرتا ہو اور اس کے ہاتھ بھی بڑے بڑے ہوں۔ بالفرض یہ کوشش اگر میرے موکل ہی نے کی ہوتی تو مقتول کی طرف سے کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا آنا ضروری تھا جبکہ ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔

"جناب عالی! میرے موکل کو قربانی کا بکرا بنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ وہ بے چارہ بے قصور ہے۔ میں اس بات کو ایک مرتبہ پھر دہراؤں گا کہ میرا موکل مقتول کی موت کے ممکنہ وقت کے دوران میں دفتر ہی میں موجود نہیں تھا پھر وہ توفیق کے قتل میں کس طرح ملوث ہوسکتا ہے اور وہ بھی پہلے اس کی موٹی گردن دبا کر اسے بے ہوش کرتا اور بعدازاں اس کے سینے میں خنجر اتار کر خاموشی سے دفتر سے نکل جاتا۔

"جناب عالی! ان شواہد و حالات کی روشنی میں، میں معزز عدالت سے درخواست کروں گا کہ میرے موکل کو باعزت بری کیا جائے۔ دیٹس آل یور آنر۔"

جج کافی دیر تک میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کا مطالعہ کرتا رہا، پھر فیصلے کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کر دی۔ اس کے حکم سے پہلے ایک اہم کام یہ بھی کیا کہ اسی وقت میرے موکل کی بالشت کو ناپا گیا تھا۔ میرے موکل کی پوری بالشت آٹھ انچ کی تھی۔ فاروق احمد کے ہاتھ قدرے چھوٹے تھے۔ ان ہاتھوں کے حلقے میں کسی بھی صورت مقتول کی گردن نہیں آسکتی تھی۔

آئندہ پیشی پر اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے چوکیدار کی گواہی بھی ہوئی۔ خلق داد خان نے میرے

موکل کے حق میں شہادت دے کر فاروق کی پوزیشن کو مزید صاف کر دیا تھا۔ اس موقع پر وکیل استغاثہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"اگر ملزم فاروق نے توفیق کو قتل نہیں کیا تو پھر اس کا قاتل کون ہے؟"

میں نے بڑے سخت لہجے میں اسے دندان شکن جواب دیا تھا۔ "یہ معلوم کرنا استغاثہ کا کام ہے..... وہ چاہے تو اس سلسلے میں پولیس کی مدد بھی لے سکتا ہے۔ میں نے دلائل کے دوران میں ایسے اہم پوائنٹ اجاگر کیے ہیں کہ میرے فاضل دوست! اگر آپ کی کھوپڑی میں دماغ نام کی کوئی چیز فٹ ہے تو آج شام سے پہلے پہلے توفیق کا قاتل پولیس کی تحویل میں جا سکتا ہے۔"

تمام صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد جج نے میرے موکل کو باعزت بری کرنے کے احکامات صادر کر دیئے۔

چلتے چلتے یہ بھی بتاتا جاؤں کہ اسی روز پولیس نے اسکائی ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل منیجر آغا رفیق کو توفیق کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا تھا۔

پولیس کی سختی کے جواب میں آغا رفیق نے اقبالِ جرم کر لیا۔ اس سازش میں مقتول کی بیوی گلشن آرا بھی پوری طرح شامل تھی۔ گلشن آرا اپنے شوہر کے کرتوتوں سے بہ خوبی آگاہ تھی اور وہ آغا رفیق کی محبت میں بھی گرفتار ہو چکی تھی۔ وہ دن رات توفیق کو اپنے راستے سے ہٹانے کے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ پھر فاروق کی صورت میں انہیں ایک سنہری موقع مل گیا۔ فاروق ان کے لئے پلا پلایا قربانی کا بکرا تھا۔ انہوں نے نہایت مہارت سے اسے قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر مثل مشہور ہے، جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

فاروق احمد کی زندگی باقی تھی، اسے قدرت نے بچا لیا اور جو اس کے لئے موت کا گڑھا کھودے بیٹھے تھے وہ خود اس میں گر کر اپنا نشان کھو بیٹھے۔

انسان زندگی میں کسی بھی قسم کا عمل کرے اس کا ردِعمل ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ اچھے اور برے عمل کی بازگشت انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آغا رفیق اور بیگم گلشن آرا اپنے برے عمل کی بازگشت سے پستی میں جا گرے اور فاروق کو اس کے اچھے عمل کی بازگشت نے سرخرو کر دیا۔

(ختم شد)